اردوستان: انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔ اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدرقریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ، جس میں مختلف موضوعات پر ۱۰۰ سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جا سکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔ **www.kitaabghar.com**

اردو دوست ڈاٹ کام: خورشید اقبال کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**، ادبی خبر نامہ **اردو ورلڈ**، ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**، ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

حیدرقریشی کے کالموں کا نیا سلسلہ **اِدھر اُدھر سے** بھی اسی سائٹ پر چھپتا ہے۔

سردار علی کی بنائی ہوئی خوبصورت ویب سائٹ **http://sherosukhan.tripod.com/**

کینیڈا سے ریحانہ احمد کی جانب سے جاری کردہ انٹرنیٹ ادبی رسالہ دستک

http://dastak-urduduniya.com/

حیدؔر اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر

www.haiderqureshi.com

حیدرقریشی کی تخلیقات پر مشتمل ویب سائٹ جس میں غزلیں، نظمیں، ماہیے، (پانچ شعری مجموعے)، دو افسانوی مجموعوں کے افسانے، ایک مجموعہ کے خاکے، کتاب کھٹی میٹھی یادیں، سفرنامہ سوئے حجاز، انشائیوں کا مجموعہ، حیدرقریشی سے لئے گئے انٹرویوز اور مزید بہت کچھ آن لائن ہے۔ مجموعی طور پر بارہ سے زیادہ کتب ایک ہی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

----

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدرقریشی کی شعری ونثری تخلیقات کے انگریزی تراجم کی ویب سائٹ۔ جہاں انگریزی تراجم کے ساتھ بعض تخلیقات کے جرمن، ترکی اور عربی تراجم بھی موجود ہیں۔ ترجمہ نگاروں کی تصاویر سے مزین ایک سادہ مگر دلچسپ ویب سائٹ۔ ایک انگریزی ویب سائٹ کی طرف سے لیا گیا انٹرویو اور ایک اور سائٹ کی طرف سے حیدرقریشی کو Auther of the Month (september 06) کے طور پر چھاپنے کے بعد اس سائٹ کی گیسٹ بک پر آنے والے تاثرات کو اس سائٹ پر حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حیدرقریشی کی شاعری کے تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدرقریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

www.jadeedadab.com

شمارہ:12 (جنوری تا جون2009ء)

مدیر

حیدر قریشی

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریس

Haider Qureshi Rossertstr.6 ,
Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر اس ای میل ایڈریس پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا
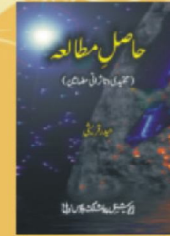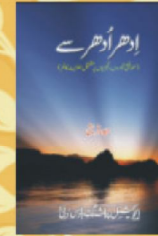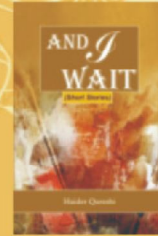
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)

PH:23215162, 23214465, FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

فہرست

گوشۂ احمد حسین مجاہد

غزلیں

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

ماہیے

کتاب گھر

ضروری اعلان

بعض دوست ای میل کے ذریعے ان پیج فائلز بھیجتے ہیں لیکن نہ تو پلین ای میل میں اور نہ ہی ان پیج فائل میں کوئی کورنگ لیٹر ہوتا ہے۔ایسے دوستوں کی ادبی عظمت اپنی جگہ برحق ہے لیکن بعض انتظامی قباحتوں سے بچنے کے لیے ایسی کسی بھی میل کو قبول نہیں کیا جاتا۔دوست مطلع رہیں۔ **مدیر جدید ادب**

گفتگو!

اردو کی ادبی دنیا کی صورتحال کے بارے میں سنجیدہ ادبی حلقے مختلف حوالوں سے تشویش کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ان میں ایک اہم مسئلہ ادب کے قاری کے غائب ہو جانے کا ہے۔مسئلہ اہم ہے لیکن صرف ایک پہلو سے نہیں کئی پہلوؤں سے غور طلب ہے۔ادبی رسائل کے ابتدائی دور میں گنتی کے چند رسائل ہوا کرتے تھے۔اس لیے ان کے قارئین کی تعداد کافی دکھائی دیتی تھی۔اگر اُس دور کے ادبی رسائل کی مجموعی اشاعت کو سامنے رکھا جائے اور پھر آج کے ادبی رسائل سے ان کا موازنہ کیا جائے تو شاید صورتحال اتنی تشویشناک نہیں لگے گی۔آج بے تحاشہ ادبی رسائل نکل رہے ہیں۔ان رسائل میں سے ایک قابلِ ذکر تعداد کے معیار اور کردار کی بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے رسائل کی مجموعی تعداد اشاعت دیکھی جائے تو ادبی رسائل کے سنہرے دور سے کچھ زیادہ ہی نکلے گی۔لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شرح خواندگی میں اضافے کے نتیجہ میں ادب کے قارئین کی تعداد میں جیسا اضافہ ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس میں یہ افسوسناک صورت بھی نمایاں ہوئی کہ خود ادب سے وابستہ افراد کو مجموعی ادبی صورتحال سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔اپنی تخلیقات اور پھر اپنے چند دوستوں کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد عام طور پر رسالہ بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ادبی مسائل پر مکالمہ بہت کم ہوتا ہے۔مابعد جدیدیت کے نام پر انڈیا میں بڑی سطح کے سرقہ کا جو گُل کھلا، اس پر جدید ادب کے سابقہ تین شماروں میں تاریخی مواد محفوظ ہو چکا ہے۔لیکن بہت کم ادیبوں نے اسے ذاتی مفادات سے بالاتر اور بے خوف ہو کر خالصتاً افسوسناک ادبی مسئلہ کے طور پر لیا ہے۔۔۔ جن بعض لوگوں نے اسے اہمیت دی ان میں بھی مسئلہ کی نزاکت سے زیادہ ایک حد تک ذاتی رنجشوں کا عمل دخل رہا۔سنجیدگی سے فکر مند ہونے والے نسبتاً کم رہے۔سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی ادبی مسئلہ کو اول تو توجہ ہی نہیں دے رہے، تھوڑی بہت توجہ دی جاتی ہے تو اس میں عموماً ذاتی رنجشوں اور کدورتوں کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے ہیں۔

فکر مند کرنے والے ایسے ماحول میں معاشرے میں پھیلتی ہوئی فرقہ پرستی کا زہر بھی ادبی رویوں میں سرایت کرنے لگا ہے۔فرقہ پرست کسی مسلک یا عقیدہ کے ہوں، نظریاتی متشددانہ رویہ اردو زبان اور ادب کے لیے زہر ثابت ہوگا۔کسی اچھے ادبی کام کو دل سے مانتے ہوئے بھی یار لوگ کسی نہ کسی عنوان اپنے بغض کا اظہار کر جاتے ہیں۔سو ایسے ماحول میں اردو کے قارئین میں اضافہ کی نیک خواہش کے ساتھ اردو ادب میں پیدا شدہ مختلف تشویشناک مسائل کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اختلاف رائے کو رسمی طور پر نہیں بلکہ کھلے دل سے برداشت کرنے کا ظرف پیدا کرنا ہوگا۔ادب میں فرقہ پرستی، بڑی سطح کے علمی سرقوں اور دوسرے منفی رویوں کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کے ساتھ عمدہ تخلیقی ادب کی تحسین کے رویہ کو کسی نظریاتی امتیاز کے بغیر خالص ادبی بنیادوں پر اختیار کرنا ہوگا۔ایسا نہ ہوا تو اردو ادب عالمی سطح پر تو کیا مقامی سطح پر بھی اپنی بچی کھچی اہمیت کھو بیٹھے گا۔

میں نے درپیش مختلف مسائل کے چند اشارے دیئے ہیں۔اہلِ علم و ادب توجہ کریں تو ہر مسئلہ کو الگ الگ زیر بحث لا کر اس کے جملہ پہلوؤں پر مکالمہ کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔سو صلائے عام ہے۔۔۔!

حیدر قریشی

حمدِ باری تعالیٰ

فراغ روہوی (کولکاتا)

سب سے ارفع، سب سے اعلیٰ، نیلی چھتری والا ہے
پست ہیں ہم سب، سب سے بالا، نیلی چھتری والا ہے
ناؤ ہماری کھینے والا، نیلی چھتری والا ہے
جس نے بھنور سے ہم کو نکالا، نیلی چھتری والا ہے
رات اور دن کی شکل میں ہر دن دکھ سکھ کے عنوان کے ساتھ
ہم پڑھتے ہیں جس کا رسالہ، نیلی چھتری والا ہے
روپ جدا ہے، رنگ جدا ہے، اتنے سارے چہروں کو
جسنے الگ سانچوں میں ڈھالا، نیلی چھتری والا ہے
اوپر بیٹھا سب کو نچاتا رہتا ہے کٹھ پتلی سا
کھیلنے والا کھیل نرالا، نیلی چھتری والا ہے
اُس امبر سے اِس دھرتی تک جس نے ایک اکیلے ہی
سارا کاروبار سنبھالا، نیلی چھتری والا ہے
خود تو دکھائی دیتا نہیں ہے، پھر بھی جس کے جلووں کا
پھیلا ہوا ہے ہر سُو اُجالا، نیلی چھتری والا ہے
اس کی نظر میں ایک ہی جیسے ادنیٰ بھی ہیں اعلیٰ بھی
جس نے ہر بندے کو پالا، نیلی چھتری والا ہے
کیسے کیسے فرعونوں سے بات یہ اُس نے منوائی
مجبوروں کا بھی رکھوالا، نیلی چھتری والا ہے
آپ فراغؔ رُلا دیتا ہے، آپ ہی پھر دے دے کے خوشی
کرتا ہے جو غم کا ازالہ، نیلی چھتری والا ہے

حمدِ باری تعالیٰ

فرحت حسین خوشدل (ہزاری باغ)

مِرا یقین ترا ہے، مِرا گماں تیرا
زباں جو ساتھ دے یارب تو ہو بیاں تیرا
زمیں سے تا بہ فلک ہر نشاں، نشاں تیرا
ہے کائنات کا اک ایک کارواں تیرا
تری ثنا کا تسلسل ازل سے تا بہ ابد
کہ ہر زباں پہ مسلسل ہے بس بیاں تیرا
مِری زباں پہ ہیں الفاظ نت نئے یارب
مِری زباں پہ ہے احسان بے کراں تیرا
تمام شئے ہے تصرف میں بس ترے مولیٰ
زمیں بھی تیری، فلک تیرا، لا مکاں تیرا
ثنا سے تیری ہر اک لفظ ہو گیا روشن
مِرے سخن میں جو لذت ہے وہ بیاں تیرا
تمام شئے میں نظر آئی تیری صنّاعی
ہے جلوہ گر تری تخلیق سے نشاں تیرا
ترے ہی ذکر سے آباد میرا سینہ ہے
ہر ایک دل پہ لکھا حرف داستاں تیرا
عزیز تر ہے نبیؐ کا یہ قول مستحسن
ہر ایک درد کا درماں، درِ اماں تیرا
کہاں سے لائے گا خوشدلؔ حسین تر لہجہ
کہاں ہے تابِ سخن کر سکے بیاں تیرا

حمدِ باری تعالیٰ

صادق باجوہ (امریکہ)

حمد و توصیف بیاں ہو کیونکر
راز سربستہ عیاں ہو کیونکر
ہر حقیقت تری ہستی کی دلیل
غلبۂ وہم و گماں ہو کیونکر
ہو گئے جُود و عطا سے سرشار
فکر پھر سُود و زِیاں ہو کیونکر
چرخِ نیلی سے بھی آگے نکلے
دل میں پیدا وہ فُغاں ہو کیونکر
دل سے اُٹھے نہ اگر برقِ تپاں
آنکھ سے اشک رواں ہو کیونکر
قلب ایثار و وفا سے لبریز
پُر تشکّر سے زباں ہو کیونکر
خود میں کھو جانا محبت کی دلیل
خود کو پا لینا نہاں ہو کیونکر
کرکے فطرت کا تقدس پامال
روحِ احساس میں جاں ہو کیونکر
لبِ خاموش سے گویائی کی
حرف پا جائیں زباں، ہو کیونکر

نعت رسول مقبول ﷺ

صادق باجوہ

دیکھتے حیرت سے ہیں کیا کیا بنا ہے خاک سے
پہلے انساں پھر بنا انسانِ کاملؐ خاک سے
شفقت و الفت کا پیکر، خیر خواہِ اِنس و جاں
ہے قیامِ شرفِ انسانی شہِ لولاکؐ سے
ہو گئی جس کی رسائی عرشِ ربّانی تلک
تھے ملائک دنگ آگے تھا وہ ہفت افلاک سے
اِکتسابِ فیض ہو گر آفتابِ نور سے
قلب و روح و جسم ہوں معمور نورِ پاک سے
تِشنہ روحوں کو پِلا دے تا ابد جامِ حیات
حشر وہ برپا ہوا ہے اس رسولِ پاکؐ سے
جس کا ہر ہر لفظ تھا تشریحِ فرقانِ مبیں
علم کی معراج پائی جس نے روحِ پاک سے
جس کی تاثیرِ دعا ہے حشر تک پھیلی ہوئی
طعنہ زن ہو کیوں اسی پہ تم دلِ بیباک سے
شافعِ محشرؐ، حبیبِ کبریا سے بغض و کیں
کم نگاہو! دیکھ تو لو دیدۂ اِدراک سے
ہے رسولِ ہاشمیؐ کی پیروی میں ہی نجات
حکم صادر ہو چکا صادقؔ شہِ افلاک سے

نعت

(صنعتِ غیر منقوط میں)

کرامت علی کرامت

(کٹک، اڑیسہ)

اسلام کا ہے مہرو کرم اور عمل اصول
راس آئی ہم کو احمدِ مرسل کے در کی دھول

ہو آگہی کا عہد کہ ہو عہد علم کا
سالک کو اس کا دکھ کہ ہے معدوم ہر اصول

لمحوں کا عکس سلسلۂ عہدِ آگہی
گو مہر کو ملال ہے، گو ماہ ہے ملول

مسموم گو ہے دہر کے ماحول کی ہوا
ہے مائلِ کرم وہی اللہ کا رسولؐ

ہر لمحہ وردِ حمد و درودو سلام ہو
وا ہو ہمارے واسطے ہر دَم درِ رسولؐ

نعت رسول مقبول ﷺ

ناصر ملک (لیہ)

پھول تاروں سے سجا ماہِ سخا کا نقشِ پا
اِک جہانِ نور ہے خیر الوریٰؐ کا نقشِ پا
اُنؐ کے قدموں سے ملا ہے اِک صراطِ مستقیم
ورنہ کس نے دیکھ رکھا تھا خدا کا نقشِ پا
اِس جہاں سے اُس نگر کا راستہ ہے کہکشاں
چوم لے گر اُمّتی نورالہدیٰؐ کا نقشِ پا
ایک انگلی کے اشارے میں چھپا تھا کیساراز
ماہِ روشن آج تک ہے مصطفیٰؐ کا نقشِ پا
کاروانِ مرتضیٰ پھر چل پڑا تھا شان سے
پیش روؐ نے جب دکھایا کربلا کا نقشِ پا
زادِ راہ میں آتشِ تر دامنی ہے منعمو!
اور آنکھوں میں امام الانبیاؐ کا نقشِ پا
ایک دُنیا کی جمی تھی ماہِ تاباں پر نظر
ماہِ تاباں چھو رہا تھا مجتبیٰ کا نقشِ پا
آسماں بھی جھک گیا تھا دیکھنے کو اُس گھڑی
کہکشاں کو میں نے لکھا جب حرا کا نقشِ پا
قوتِ معجز نمائی پہ دل و جاں ہیں نثار
لامکاں کا راستہ بھی ہے وفا کا نقشِ پا

☆☆☆

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

خواجہ محمد عارف (انگلینڈ)

مجھ گنہگار کو جو نعت کی توفیق ہوئی
آپؐ کی شانِ کریمی کی یہ تصدیق ہوئی
والضحیٰ آیتِ برحق جو اتاری حق نے
روزِ روشن سے شبِ تار کی تفریق ہوئی
غایت اتنی ہے کہ ہو آپؐ کے جلووں کا ظہور
اس بہانے سے ہی کونین کی تخلیق ہوئی
اللہ اللہ وہ بصارت، وہ بصیرت ان کی
خاکِ پا آپؐ کی جو سرمۂ صدّیق ہوئی
ایک اُمّیؐ سے لیا درسِ محبت جس نے
قوم وہ مشرق و مغرب کی اتالیق ہوئی

مناجات

خواجہ محمد عارف

اپنی یہ صورتِ حالات ہے میرے مولاً!
زیست ہجرت کی سی اک رات ہے میرے مولاً!
جہل و عصیاں کے قبیلوں نے مجھے گھیر لیا
دل ہے اور نرغۂ آفات ہے میرے مولاً!
جھونک دوں چشمِ عدو میں جو وہی خاک ملے
پر تہی اس سے مِرا ہاتھ ہے میرے مولاً!
امن کے شہر میں بھی کوئی نہیں جائے اماں
تجھ کو معلوم ہر اک بات ہے میرے مولاً!
ہم سفر کوئی بھی صدّیقؓ نہیں ہے اپنا
دل بہت حاملِ صدمات ہے میرے مولاً!
کوئی حیدرؓ سا جو مل جائے تو سونپوں اس کو
دوش پر بارِ امانات ہے میرے مولاً!
جب بھی جاؤں میں کسی غار میں، کھلتا ہے یہی
یہ پنہ گاہ نہیں، گھات ہے میرے مولاً!
غم کے تپتے ہوئے صحرا میں نہ سایہ ہے نہ آب
گرمی و گرد کی بہتات ہے میرے مولاً!
اپنی زنبیلِ عمل میں کوئی ستّو نہ کھجور
زادِ رہ کچھ نہیں، اک نعت ہے میرے مولاً!
چند قطرے ہی سہی آنکھ کے مشکیزے میں
دل میں اک قلزمِ جذبات ہے میرے مولاً!
ہے بہت دُور ابھی مجھ سے قبا کی منزل
آبلہ پائی مِرے ساتھ ہے میرے مولاً!
اور کوئی بھی نہیں راہ دکھانے والا
اک خدا، ایک تِری ذات ہے میرے مولاً!
کیا خبر جا کے کہاں ناقۂ عارفؔ بیٹھے
باگ اس کی ہے، ترا ہاتھ ہے میرے مولاً!
عرضِ عارفؔ کی ہے تفصیل کا اجمال کہ وہ
طالبِ لطف و عنایات ہے میرے مولاً!

نصرت ظہیر (دہلی)

اردو کا تہذیبی پُل اور ماس میڈیا

(یہ مقالہ ممبئی یونی ورسٹی کے 150 سال پورے ہونے کی تقریب پر اس کے شعبۂ اردو کی جانب سے منعقدہ سیمینار (5,6,7th March, 2007) میں پڑھا گیا جس کا موضوع یہ تھا کہ کیا اردو زبان ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک تہذیبی پل بن سکتی ہے؟ تحریر ایک سال سے بھی زیادہ پرانی ہونے کے باوجود موضوع کے لحاظ سے بالکل تازہ اور اتفاق سے غیر مطبوعہ ہے۔)

خواتین و حضرات!

سب سے پہلے میں اپنی اس حیرت کا اظہار کرنا چاہوں گا جو مجھے اس سیمینار کے لئے مقالہ لکھنے کی دعوت ملنے پر ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ حیرت اب ایک سال پرانی ہو چکی ہے پھر بھی اتنی جینوئن حیرت ہے کہ ابھی تک تازہ ہے۔ یہ حیرت مجھے گزشتہ سال اس وقت ہوئی تھی جب آج کا یہ سیمینار دسمبر کی سردیوں میں ہونے والا تھا اور پروفیسر معین الدین جینابڑے کا فون ملتے ہی میں سوچنے لگا تھا کہ آخر یہ کیا سوچ کر مجھے مقالہ پڑھنے کے لئے بلا رہے ہیں۔ حیرت کی کئی وجہیں، بلکہ وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے یہی معلوم نہیں تھا کہ مقالہ کیا ہوتا ہے۔ کبھی لکھا ہو تو معلوم بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ میری جو تھوڑی بہت پہچان ہے وہ ایک معمولی مزاح نگار کی ہے۔ ویسے مزاح نگاری اپنے آپ میں خود بڑا بھاری سنجیدہ کام ہے، اور اس قدر مشکل بھی کہ ڈھائی من ادب تولئے تو مشکل سے چھٹانک بھر مزاح ہاتھ آتا ہے۔ پھر بھی کسی مزاح نگار سے سیمیناروں جیسے نام نہاد سنجیدہ موضوع پر لکھوانا ایسا ہی ہے جیسے استرے سے کمر کھجانا۔ یعنی موضوعِ سخن کا خون ہونا ہی ہونا ہے۔

پھر یہ بھی کہ سیمیناروں اور نقادوں کی اردو دنیا میں ایک سے ایک پڑھے لکھے پروفیسر، ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر صاحبان وافر مقدار اور تعداد میں پہلے سے موجود ہیں، پھر مجھ پس ماندۂ ادب کو مقالہ لکھنے کی دعوت کیوں دے دی گئی۔ اپنے ہم وطن ڈاکٹر اطہر فاروقی سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا گھبراتے کیوں ہو۔ سیمیناروں میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ سب مقالے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ جو جی میں آئے کاغذ پر لکھ ڈالو۔ لوگ اسے مقالہ ہی سمجھیں گے۔ ایک بار لالچ ہوا کہ خود ان ہی سے درخواست کرلوں کہ ایک مقالہ میرے لئے بھی لکھ دیں۔ لیکن دو وجہوں سے خاموش رہا۔ ایک تو یہ کہ ان سے کسی بے ضرر مضمون کی امید رکھنا غلط تھا اور میں یہ قطعی نہیں چاہتا تھا کہ ممبئی سے

میری واپسی غیر یقینی ہو جائے۔ دوسرے مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ سچ مچ میری درخواست منظور نہ کرلیں اور مجھے ان کا لکھا ہوا پڑھنا ہی نہ پڑ جائے۔ بہر حال میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک آڑا ترچھا سا مضمون اس موضوع پر لکھ مارا ہے، اسے ایک کچے پکے مزاح نگار کا مضمون سمجھ کر برداشت کرلیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اور پروفیسر معین سے درخواست ہے کہ مضمون کو مقالہ سمجھیں اور دعائے خیر میں یاد رکھیں۔

اس تمہید کے بعد میں پروفیسر معین اور دیگر منتظمین کو سیمینار کے موضوع کے لئے مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ اور یہ مبارک باد میں مزاحیہ طور پر نہیں بلکہ پوری غیر مزاحیہ سنجیدگی سے دے رہا ہوں۔

تقسیم شدہ ہندوستان کو وجود میں آئے ہوئے ساٹھ برس ہو رہے ہیں، اور ایک تقسیم شدہ پاکستان کا وجود بھی اب چھتیس برس کا ہو چکا ہے۔ اس دوران دونوں ملکوں کے فاصلے مٹانے کے لئے کبھی ہم شملہ گئے، کبھی ڈھاکہ پہنچے، کبھی لاہور پر حملہ آور ہوئے، کبھی کرگل کی پہاڑیوں پر جا بیٹھے، کبھی پارلیمنٹ کو نشانہ بنایا کبھی مسجدوں مندروں میں خون بہایا، کبھی سمجھوتے کی ریل چلائی کبھی دوستی کی بسیں دوڑائیں۔

اس کے علاوہ دونوں ملکوں میں دوستی اور بھائی چارہ بڑھے، اس کے لئے پشاور سے کلکتہ تک، لاہور سے لکھنؤ تک، کراچی سے ممبئی تک اور اسلام آباد سے نئی دہلی تک نہ جانے کتنے مباحثے، مذاکرے، مشاعرے اور سیمینار ہوئے، طرح طرح کے موضوعات اور قسم قسم کے بہانوں سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا گیا۔ لیکن یہ بات کسی کے ذہن میں نہ آئی کہ اردو زبان بھی دونوں کو جوڑ سکتی ہے۔ حالاں کہ یہ بالکل سامنے کا موضوع تھا۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ بھی ہو تو کم سے کم اس پر بات تو کر ہی لی جاتی۔ مگر شائد یہ موضوع ہی خطرناک تھا، کیونکہ یہاں کم از کم ہندوستان میں صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام آباد والا پاکستان کبھی کا الگ ہو چکا مگر اردو کے تعلق سے ایک ڈھکا چھپا پاکستان ناگ پوری چشمے سے دیکھیں تو ابھی تک ہمارے ذہنوں میں کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا ہے، جو وقتاً فوقتاً ہمیں ڈستا رہتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ پہلا بین الاقوامی سیمینار ہے جس میں ان دونوں عجوبۂ روزگار ملکوں کے درمیان اردو کو ایک قدرِ مشترک مان کر اسے رابطے کا پُل بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس کے لئے میں منتظمین کے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے ناگ پوری فسطائیت کے تخلیق کردہ وسوسوں کے اس سانپ کو اس کی دُم سے نہیں بلکہ پھن کی طرف سے پکڑنے کی ہمت دکھائی ہے۔

دوستو! میں ایک عام آدمی ہوں اور اسی کی طرح سوچتا ہوں۔ مجھ سے آپ کسی دانش ورانہ، فلسفیانہ اور پروفیسرانہ ڈسکورس کی امید نہ رکھیں۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ پس منظر میں جب بھی میں اردو زبان کے بارے میں سوچتا ہوں تو اکثر الجھ کر رہ جاتا ہوں۔

اردو پورے برصغیر کی واحد رابطے کی زبان یا لنگوا فرانکا ہے، اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار ہے، اردو کسی ایک مذہبی فرقے کی زبان نہیں ہے، اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک مذہب اور ایک

تہذیب ہے، اردو ہمارے مشترکہ تہذیبی ورثے کی نشانی ہے، ہمارے سیکولر کردار کی اصل پہچان ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایسے جملے ہیں جنہیں بچپن سے میرے کان سنتے آرہے ہیں، آنکھیں جنہیں پڑھ پڑھ کر تھک گئی ہیں اور شعور جنہیں سوچ سوچ کر جماہیاں لینے لگتا ہے۔ اگر یہ سب جملے سچ ہیں، اور میرا ایمان ہے کہ سچ ہیں، اور اردو واقعی ہمیں جوڑنے والی زبان ہے، تو میں کیا مجھ جیسا کوئی بھی طالبِ علم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ پھر یہ زبان ہمیں توڑ پھوڑ کر پورا شیرازہ منتشر کیوں کر رہی ہے؟ کیوں اس ملک کی سب سے تکلیف دہ تقسیم کے بعد نام نہاد بابائے اردو نے یہ دعویٰ کر دیا کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں اردو نے بنوایا ہے؟ بعد میں کیوں یہی اردو ڈھاکہ میں محمد علی جناح کی تقریر کے بعد بالآخر پاکستان کی بھی تقسیم کا بہانہ بن گئی؟ کیوں سب کو جوڑنے والی اردو آج بھی پاکستان کو متحد رکھنے والی قوت نہیں بن پا رہی ہے؟ کس لئے یہ آج کے ہندوستان میں، اپنے پیدائشی گھر میں لوگوں کی آنکھ کا کانٹا بنی ہوئی ہے؟ کیوں اس کے حروف میں تحریر کئے گئے خط دوسرے خطوں کے مقابلے میں دیر سے اپنے ٹھکانے پر پہونچتے ہیں؟ کیوں اس ملک میں ہر طرح کے لاڈ پیار دلار، تحفوں اور کھلونوں کی مسلسل بارش کے باوجود اسے پھر سے پنپنے نہیں دیا جا رہا ہے؟ اور نفرت اور شک کا یہ عالم ہے کہ کسی مسلمان جیب کترے کی تلاشی لینے پر اردو میں تحریر شدہ کوئی شعر بھی برآمد ہو جائے تو اسے پاکستانی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ اور اردو میں چھپا ہوا کوئی کتابچہ مل جائے تو اسے القاعدہ کا دہشت گرد مان کر ٹاڈا، پوٹا یا ایسے ہی کسی قانون میں بند کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے؟

میں مانتا ہوں کہ اردو مسلم حملہ آوروں کی ایجاد کردہ زبان نہیں بلکہ ہندوستان کے اس عظیم الشان تہذیبی سلسلے، اور فلسفۂ حیات کی پروردہ ہے جس کا اصل نام ہندوستانیت ہے اور جسے اس کی صورت بگاڑ کر آج ہندوتوا کا نام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مسلمان حملہ آور بن کر اس ملک پر قبضہ نہ کرتے تب بھی افغانستان، ایران اور وسط ایشیا کے دوسرے خطوں کی زبانوں اور تہذیبوں کا اثر یہاں پڑنا لازمی تھا اور ان کے آنے کے بہت پہلے یہ اثراندازی شروع بھی ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس زبان کو تو وجود میں آنا ہی تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے تب اس کا نام کچھ اور ہوتا۔ یا اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا تناسب کسی قدر مختلف ہو جاتا۔ تو میں یہ قطعی نہیں مانتا کہ یہ حملہ آوروں کی زبان ہے۔ اس کے برعکس یہ اس تہذیب اور جغرافیائی وحدت کی پیدا کی ہوئی زبان ہے جس نے تاریخ کے کسی بھی دور میں دوسرے خطوں اور قوموں پر حملہ نہیں کیا۔ حملہ آوروں کی زبان تو فارسی تھی۔ اور، اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ اس کا خاتمہ بالخیر ہو گیا تھا۔

سچ یہ ہے کہ اردو اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں حکومت کی یا اسٹیبلشمنٹ کی زبان نہیں رہی۔ حیدرآباد کے نظام نے اسے سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کی منظّم کوشش ضرور کی، مگر بیچ میں پاکستان اور پٹیل آ گئے۔ پاکستان میں اردو کو پھلنے پھیلنے کا خوب موقع ملا لیکن سرکاری زبان وہاں بھی نہ بن سکی۔ ہاں اسے زبردستی رائج

کرنے کے چکر میں مشرقی پاکستان ضرور ہاتھ سے نکل گیا۔ محمد علی جناح ڈھاکہ میں تقریر کے دوران یہ اعلان کرتے ہوئے کہ آج سے ہم ایک قوم ہیں جس کی ایک زبان (اردو) ہوگی تو وہ یہ اندازہ کرنا بھول گئے کہ پاکستان بنوا کر برِصغیر کے مسلمانوں کے حق میں سب سے ہولناک غلطی کر بیٹھنے کے بعد اب وہ خود پاکستان کو تقسیم کرنے کی بنیاد ڈال کر دوسری تاریخی حماقت فرما گئے ہیں۔ سچ ہے صاحب۔ لمحوں کی خطاؤں کو صدیاں بھگتتی ہیں۔

مغربی پاکستان کے حکمراں یہ بھول گئے کہ حکومتیں زیادہ سے زیادہ رسم الخط رائج کر سکتی ہیں، زبان نہیں۔ زبان کو تو عوام رائج کرتے ہیں۔ یہ کسان یہ مزدور یہ لوہار یہ ترکھان یہ موچی یہ نائی، زبان یہ لوگ تخلیق کرتے ہیں۔ کوئی میر یا کوئی غالب زبان کو پیدا نہیں کرتا۔ زبان خود انہیں پیدا کرتی ہے اور خود ان کے ہاتھوں اپنے آپ کو سجاتی اور سنوارتی ہے۔ مختصر یہ کہ جناب، کل ملا کر اردو پہلے بھی عوام کی زبان تھی اور آج بھی یہ عوام ہی کی زبان ہے۔ جھگڑا جو ہے تو رسم الخط کا ہے۔ دائیں سے بائیں لکھو تو پاکستان شروع ہو جاتا ہے اور بائیں سے دائیں لکھو تو کفرستان کی سرحد آ جاتی ہے۔ تو پھر ہندوستان پاکستان کے درمیان اردو کا پُل کھڑا کیسے ہو؟

مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ اردو بحیثیت زبان دونوں ملکوں کے درمیان کوئی پل بن سکتی ہے یا بنا سکتی ہے۔ اس کی وجہیں صاف ہیں۔ پاکستان میں جو درجہ قومی قبولیت کا اردو کو ملا ہے وہ ہندوستان میں ہندی نے حاصل کر لیا ہے۔ وہاں کے لوگ ہندی کا رسم الخط نہیں جانتے اور یہاں اردو کو اس کے رسم الخط میں پڑھنے والے گھٹتے جا رہے ہیں۔ تو اس حالت میں جو پل بنے گا وہ ظاہر ہے دونوں طرف سے لنگڑا ہوگا۔ یعنی ہوا میں لٹکا ہوا۔

مشکل یہ ہے کہ زبان کے معاملے میں، خاص طور سے اردو زبان کے معاملے میں ہماری سوچ شروع سے جذباتی رہی ہے۔ اردو کو ہم دماغ سے نہیں صرف دل سے سوچتے ہیں۔ چنانچہ شاعری کریں گے اردو میں۔ سائنس پڑھیں گے انگریزی میں۔ اور یہ مجموعی صورت آج کی نہیں۔ برسوں سے یہی چل رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے انگریزی کی جگہ فارسی تھی۔ اردو والے غزل اردو میں لکھتے تھے اور طبی نسخے فارسی میں۔ اردو کو ہم نے دل کی طرح دماغ سے بھی انگیز کیا ہوتا تو دل کا بوجھ کافی کم ہو جاتا۔ یہ قبول کرنے میں آسانی ہوتی کہ زبان بہرحال رابطے کا اوزار ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی یا ملٹی میڈیا فنکشنز کا پہلا ٹول tool جسے آدمی نے ہزاروں یا شائد لاکھوں سال پہلے بنایا تھا۔

اُس وقت ڈجیٹل Digital سے زیادہ یہ ایک طرح کا انالوجیکل Analogical عمل تھا۔ سیدھے سادے خیالات کی ترسیل جسمانی اشاروں سے زیادہ ہوتی تھی صوتی اشاروں سے کم۔ دھیرے دھیرے سوچنے کے عمل کو فروغ ملا تو خیالات میں پیچیدگی بڑھی۔ اشارے ناکافی پڑ گئے۔ صدائیں حرف بننے لگیں۔ حرف سے لفظ بنے۔ لفظ سے زبانیں وجود میں آئیں اور انسان جسمانی اشاروں کے بغیر بھی باتیں کرنے لگا۔ پھر جب باتوں کا ذخیرہ آدمی کے میموری کارڈ Memory Card کی گنجائش سے بڑھ گیا اور معاملات کو یاد رکھنے کی ضرورت پیش آئی تو ہوا میں تحلیل ہو جانے والے لفظ تصویروں اور خاکوں میں محفوظ ہونے لگے۔ یہی تصویریں اور خاکے مختصر ہو کر

نقطے، دائرے اور لکیر بن گئے اور زبانیں بولے جانے اور سنے جانے کے علاوہ لکھی بھی جانے لگیں۔

ہزاروں سال بعد آج کمپیوٹر کی بدولت زبانوں کے ارتقا کا اینالوجیکل عمل ڈجیٹا ئز digitise ہو گیا ہے، اور ان کی شکل کچھ کی کچھ ہوئی جا رہی ہے۔ ایس ایم ایس، ای میل اور انٹرنیٹ کی ضرورتوں نے لفظوں اور لکھاوٹوں کو سکیڑنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کی سینکڑوں زبانیں کمپیوٹر کی وجہ سے چار پانچ رسم الخطوں میں سمٹتی جا رہی ہیں۔ ڈجیٹل کمپیوٹنگ digital computing کی اس آندھی میں اگلے سو پچاس برسوں کے دوران اردو کا کیا حشر ہو گا کہنا مشکل ہے۔ ختم تو یہ ظاہر ہے کہ نہیں ہو گی کیونکہ آج بھی اس کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رسم الخط اس کا عربی اور فارسی سے آیا ہے، اور عربی، فارسی والے چونکہ تیل بیچتے ہیں، لہٰذا اس طرف سے بھی زیادہ خطرہ نہیں اور کل ملا کر میں سمجھتا ہوں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے اردو کو کسی قسم کا نقصان پہونچنے والا نہیں ہے۔ خطرہ اسے اگر ہے تو اس کی محبت کا دم بھرنے والوں سے ہے۔ جو لفاظی تو سب سے زیادہ کرتے ہیں لیکن عمل کے نام پر صفر ہیں۔ اور ان میں بھی سب سے خطرناک وہ لوگ ہیں جو اردو کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کرنے کے چکر ہیں۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے جسے میں دوسروں کے لئے چھوڑتا ہوں۔

بات ہے اردو کو دونوں ملکوں کے درمیان ایک وایا میڈیا بنانے کی۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اور جیسے کہ حالات نظر آتے ہیں، اردو ایک زبان کی حیثیت سے تو نہیں البتہ ایک تہذیبی وراثت کے طور پر ضرور دونوں ملکوں کے درمیان ایک پُل بن سکتی ہے۔ اور بن کیا سکتی ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ بنتی جا رہی ہے۔ اور اس تہذیبی پُل کو کھڑا کرنے میں سب سے بڑا کردار میرے خیال سے ماس میڈیا کر رہا ہے۔

حالات دونوں طرف ایسے بن گئے ہیں کہ سیاست دانوں کی بجائے عوام کے ذہنوں پر فلم، اخبار، ٹی وی اور ابلاغ کے دوسرے مظاہر کا اثر زیادہ پڑنے لگا ہے۔ ہندوستانی فلموں نے جن میں 90 فیصد سے زائد کی زبان اردو ہوتی ہے، پاکستانیوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما کر اس تہذیبی پُل کی تعمیر کافی پہلے شروع کر دی تھی۔ کوئی اسے مانے یا نہ مانے مگر ہندوستانی فلموں کے اردو مکالموں اور گانوں میں اتنی جان ہے کہ اس کا اثر افغانستان اور خلیج کے ملکوں میں بھی پڑا ہے۔ آج اگر آدھا افغانستان اردو میں بات کر سکتا ہے تو اس میں سب سے بڑا ہاتھ ہندوستانی فلموں کا ہے، انجمن ترقی اردو ہند یا انجمن ترقی اردو پاکستان کا نہیں۔ فلموں کی بدولت اردو جنوبی ایشیا میں نہیں بلکہ خلیج عرب میں بھی ایک بڑی لسانی طاقت بنتی جا رہی ہے۔

ہندوستانی فلموں کے بعد آتی ہیں پاکستانی فنکاروں کی گائی ہوئی غزلیں اور قوالیاں۔ جو ظاہر ہے اردو تہذیب وثقافت ہی کی دین ہیں۔ ہندوستانی فلموں کی آندھی کے جواب میں پاکستان کی طرف سے آنے والی اس بادِ نسیم نے بلا لحاظِ مذہب وملت سب کے دلوں کو تراوٹ سے بھر دیا ہے اور اس کی بدولت ایک زبردست میوزک انڈسٹری کھڑی ہو گئی ہے۔ اس میں تازہ اضافہ صوفی سنگیت کا، بلکہ صوفیانہ پاپ میوزک کا ہے اور یہ بھی ماشاءاللہ

مارشل لا کا عادی سمجھے جانے والے پاکستان ہی سے آیا ہے۔

لیکن اس دوران ٹیلی ویژن نے دونوں ملکوں کو جس طرح اپنی گرفت میں لیا ہے اس کا اثر فلم اور موسیقی سے بھی کہیں زیادہ پڑ رہا ہے۔ دونوں طرف کی نیوز چینلوں نے خبریں دینے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی روش کے تحت اور بریکنگ نیوز کی کٹ تھروٹ cut throat مقابلہ آرائی کی بدولت، شعوری طور پر نہ سہی غیر شعوری طور پر ہی سہی، دونوں ملکوں کے عوام کو پہلے سے زیادہ باخبر رکھنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے دونوں ملکوں کے عوام خود اپنا حال جاننے کے لئے ریڈیو پر بی بی سی لندن ٹیون tune کیا کرتے تھے اور بگ بین کی جھنکار کے بعد سنائی جانے والی خبروں پر آسمانی وحی کی طرح یقین کر لیا جاتا تھا۔ آج لندن میں ایشیائیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تصویریں خود ہمارا ٹی وی دن رات گھر بیٹھے دکھا دیتا ہے۔ پاکستان میں تو جیسے غضب ہی ہو گیا ہے (یاد رہے مضمون ایک سال پہلے کا لکھا ہوا ہے) وہاں چشمِ فلک حیران نگاہی سے ایک ایسے فوجی ڈکٹیٹر کو اقتدار پر قابض دیکھ رہی ہے جس نے ہر طرح کے میڈیا کو کھلی چھوٹ دے رکھی۔ جس کی چاہے خبر دو جس کی چاہے خبر لو۔ اور یہاں ہندوستان میں تو ذرائعِ ابلاغ پہلے ہی بے لگامی کی حد تک آزاد ہیں۔ چنانچہ خبروں کی اس یلغار کا ڈھیرے ڈھیرے سب پر اثر ہو رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے جذباتی عوام پہلے سے زیادہ باخبر چنانچہ پہلے سے زیادہ ہوشیار اور پہلے سے بڑھ کر حقیقت پسند ہوتے جا رہے ہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ صرف ایک سال پہلے تک صورتِ حال یہ تھی کہ دونوں ملک جب بھی ایک دوسرے کے کچھ قریب آتے دکھائی دیتے تھے تو کہیں نہ کہیں کوئی بم پھٹتا تھا اور قربت پھر دوری میں بدل جاتی تھی۔ اب وہ حالات بھی بدلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ سمجھوتہ گاڑی کو جلا دیا گیا مگر مذکرات کی ریل پٹڑی سے نہیں اتری۔ دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کے خلاف ویسی بیان بازی نہیں کی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی۔ دہلی کے ایک ہسپتال میں زیرِ علاج پاکستانی زخمیوں کو جب ان کا اپنا وزیر ہوائی جہاز سے واپس لے جانے کے لئے آیا تو وہ اپنی مرضی سے واپس نہیں گئے۔ انہیں ہندوستانی ڈاکٹروں پر بھروسہ تھا اور وہ علاج کے بعد ہی واپس جانا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض پراسرار مصلحتوں کی وجہ سے پاکستانی حکومت ان کی واپسی چاہتی تھی، چنانچہ اس عمل میں ہونے والی تاخیر کے سبب کو فوجی طیارے میں تکنیکی خرابی کی آڑ لے کر چھپایا گیا اور یہ زخمی پاکستانی، زبردستی اسٹریچروں پر لٹا کر طیارے میں لے جائے گئے۔ ظاہر ہے عوام اور حکومتوں کے برتاؤ میں ان تبدیلیوں کے پیچھے اطلاعات کی ترسیل میں آنے والی تیزی اور ماس میڈیا کا ہی بڑا ہاتھ ہے جو ہر واقعے کے ہر پہلو کو دن رات، لگاتار، بار بار سامنے لا رہا ہے اور لوگوں کی سوچ کے دائروں کو پھیلا رہا۔

اس عمل کا اردو سے سیدھا تو نہیں لیکن بالواسطہ تعلق ضرور ہے، اور وہ اس طرح کہ دونوں طرف کے مین اسٹریم الیکٹرانک میڈیا کی زبان آج کی تاریخ میں اردو سے اتنی قریب ہے کہ آپ اسے اردو کے علاوہ کوئی اور نام

نہیں دے سکتے۔ نہ اس میں عربی فارسی کے مشکل لفظ ہیں نہ سنسکرت کے۔ایسی زبان کو آپ اردو نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

ہاں اس میں، خاص طور سے ہندوستانی ٹی وی کی اردو میں آپ کو خلافت اور خلا صا جیسے لفظوں کی ٹانگ ٹوٹنے کی آوازیں ضرور سنائی دیں گی جن پر آپ کو ہنسنے اور اناؤنسروں کے شین قاف پر ترس کھانے کا موقع بھی مل جائے گا لیکن اُن کی اِس سنجیدگی کا مذاق اڑانا یقیناً آپ کو ایک ظلم محسوس ہوگا جو وہ اردو کے زیادہ سے زیادہ الفاظ کو اپنی ووکیبلری Vocabulary میں جگہ دے کر اپنے بیانئے کو زیادہ عام فہم اور زیادہ پر اثر بنانے کے سلسلے میں دکھا رہے۔ یہاں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ ہندی والوں میں اتنی فراخ دلی اور دور اندیشی بہر حال موجود ہے کہ وہ اردو کے ڈکشن سے قدرے مشکل لیکن مترنّم الفاظ اپنی جھولی میں ڈال کر ہندی کو اور مٹھاس دینے اور قابلِ قبول بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، جب کہ اردو والے اس معاملے میں بے حد ذکی الحس ،اور سچ کہنے دیں تو خاصے متعصب نظر آتے ہیں۔انہیں جب بھی عربی یا فارسی کی مشکل تراکیب اور اصطلاحات سے پنڈ چھڑانا ہوتا ہے وہاں وہ جھٹ انگریزی کا ہم معنی لفظ ڈال دیتے ہیں۔ ہندی کے آسان ترین لفظوں سے بھی اچھوتوں جیسا برتاؤ کرنا ہندوستانی اردو دانوں کی ایک عام روش ہے۔اور یہاں بھی عجیب بات یہ ہے کہ پاکستانی اردو لکھاریوں میں یہ مزاج نہیں پایا جاتا۔ وہ پوری بے تکلفی سے ہندی پنجابی اور اپنے یہاں کی دوسری علاقائی زبانوں کے لفظ اپنے بیان میں داخل کرتے چلے جاتے ہیں۔

بہر کیف کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستانی ٹیلی ویژن نے جس طرح ہندی زبان کو، کوٹنا، پیسنا اور چھاننا شروع کیا ہے اس سے وہ مسلسل اردو کے زیادہ قریب ہوتی جارہی ہے اور سنتھیسس synthesis کا یہ عمل یوں ہی جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب پاکستانی اور ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا کی زبان میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ اور عملاً دونوں طرف کی عوامی زبانیں رسم الخط کے فرق کے باوصف ایک ہو جائیں گی۔

تو جناب! اس طرح اردو یقیناً دونوں ملکوں کے درمیان ایک تہذیبی پُل بنا رہی ہے جس سے مستقبل کے بہت سے معاملات کو سلجھانے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔ اچھا ہوتا اگر پرنٹ میڈیا بھی اس عمل میں شریک ہو جاتا۔ دونوں طرف کے اخبارات و رسائل میں ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں آج بھی زیادہ رپورٹنگ نہیں ہوتی۔ جتنی ہوتی ہے وہ معاملات کو ایک کٹّر قسم کی وطن پرستی کے چشمے سے دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اطلاعات کو ایک خاص رنگ یا رُخ دے دیا جاتا ہے اور غیر جانب دارانہ و حقیقت آمیز جائزے بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں اردو کا کردار آدھا اور یک طرفہ نوعیت کا ہے۔ یعنی پاکستان میں تو پرنٹ میڈیا پر اردو کی حکومت ضرور ہے ۔لیکن یہاں ہندوستان میں پورے ملک کی صحافت پر بس انگریزی کا راج چل رہا ہے۔ اور اخباری سرکولیشن کے لحاظ سے اردو، ہندی کے بعد تیسرے مقام پر بھی نہیں ہے۔

ہاں اردو کی کتابیں دونوں طرف خوب چھپ رہی ہیں۔لیکن ان کا ایک دوسرے کے یہاں پہونچنا تقریباً یک طرفہ سا ہو کر رہ گیا ہے۔ پاکستان میں ڈاک کی شرحیں ہندوستان کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہیں اور ترسیلِ زر دونوں ملکوں کے درمیان اتنی مشکل ہے کہ کتابیں بس ذاتی رابطوں سے آتی جاتی ہیں۔ دونوں طرف ایک دوسرے کی اردو کتابوں اور رسائل و جرائد کی اچھی خاصی مانگ ہے لیکن ان کی عوامی تقسیم و ترسیل کا کوئی معقول، سستا اور آسان بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے پرنٹ میڈیا دونوں ملکوں کو قریب لانے میں وہ رول ادا نہیں کر پارہا ہے جو وہ ادا کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سیمینار کے ذریعے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو یہ سمجھایا جا سکے کہ پرنٹ میڈیا کا ایک ریم چھپا ہوا کاغذ یہاں سے وہاں آ جا کر دونوں کے لئے کروڑوں روپے کے ایک ٹینک کی ضرورت کم کر سکتا ہے تو یہ بھی ہند پاکستان دوستی کے عظیم کاز کی ایک عظیم خدمت ہو جائے گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اردو زبان کے جس تہذیبی پُل کی بات میں ماس میڈیا کے تعلق سے کر رہا ہوں وہ ہمارے آپس کے تمام جھگڑوں کو حل کر دے گا۔ کل سے بم پھٹنا بند ہو جائیں گے۔ جماعتِ اسلامی اپنی دوکان بند کر لے گی۔ آر ایس ایس کے سپیرے اپنی پٹاریاں لپیٹ لیں گے۔ دونوں طرف کا کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ جی نہیں۔ ایسے کسی چمتکار کی توقع کرنا حماقت کی حدوں سے بھی آگے نکل جانے والی خوش امیدی ہوگی۔ لیکن اس تہذیبی ارتباط سے ہمارے تمام مسئلوں کی جڑ، یعنی دونوں ملکوں کی سیاسی مفاد پرستی ضرور کم زور ہوگی یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ خدا حافظ۔

”تقسیم بّرِصغیر کے بعد ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کے لئے اردو، ہندی تنازعہ میں شدت پیدا کرائی گئی۔ ہندی کو قومی زبان قرار دلوانے کے لئے شدید بھاگ دوڑ کے باوجود اسمبلی میں ووٹ برابر پڑے۔تب اسپیکر کے کاسٹنگ ووٹ سے اردو کے مقدر کا فیصلہ کیا گیا۔ ہندی کو، دراصل دیوناگری رسم الخط کو ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ مل گیا۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی، ہندوستان بھر کی رابطہ کی زبان کو علاقائی زبان بنا کر اس کے اپنے علاقوں میں بھی دوسرے درجہ، بلکہ تیسرے درجہ کی زبان بنا دیا گیا۔ اردو کو یہ سزا قیام پاکستان کے ”جُرم“ میں دی گئی۔ اُدھر پاکستان میں بھی اگرچہ اردو کو سرکاری زبان تو بنا لیا گیا تاہم وہاں کی اشرافیہ کی زبان انگریزی ہی رہی۔ اور گزشتہ ترپن برسوں سے وہاں ہماری بیوروکریسی اور سیاست تک کالے انگریزوں کا ہی عمل دخل رہا ہے۔ یوں اردو زبان کو اس کے اپنے گھر سے بھی بے دخل کر دیا گیا اور پاکستان میں بھی اسے جائے اماں نہ مل سکی۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، یہ زبان صرف اپنے بولنے والوں اور لکھنے والوں کے بل پر نہ صرف زندہ ہے بلکہ قائم و دائم ہے۔“ (**حیدر قریشی** کے مضمون **اردو زبان اور ادب کے چند مسائل** مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔ سے اقتباس

بحوالہ **حاصل مطالعہ** صفحہ نمبر ۱۸، ۱۹)

ڈاکٹر شہناز نبی (کولکتہ)

میر تقی میرؔ۔ شاعرِ آہ

میر تقی میرؔ پر اب تک اتنے تنقیدی مضامین آچکے ہیں اور ان کے فن سے متعلق اتنی اہم کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں کہ میرؔ پر قلم اٹھاتے ہوئے ذہن میں پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ میرؔ پر کیا لکھا جائے اور کیوں۔؟ کیا واقعی میرؔ اتنا پراسرار شاعر ہے کہ اب تک اس کی شاعری کے تمام گوشوں تک رسائی ممکن نہیں ہوسکی ہے یا پھر یہ کہ میرؔ پر کچھ لکھنا واقعی کچھ نیا اور الگ لکھ کر میریاتؔ میں اضافہ کرنا ہے یا پھر میرؔ کے متعلق کہی گئی باتوں کو دہرا کر محض خامہ فرسائی کا حق ادا کرنا ہے۔ میرے خیال میں میرؔ اردو کے ان خوش قسمت شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں اچھے اور بڑے ناقد میسر آئے ہیں۔ بات اگر مولوی محمد حسین آزادؔ کے تذکرے آبِ حیات سے شروع کریں تو یہ کم بڑی بات نہیں کہ آزادؔ نے میر پر تفصیلی مضمون لکھا اور اپنے تذکرے میں ان کے کلام کا وافر حصہ شامل کیا۔ گرچہ آزادؔ نے 'میرؔ کا کلام آہ ہے تو سوداؔ کا واہ' والا مشہور فقرہ خواجہ باسطؔ کے حوالے سے شامل کیا ہے لیکن تحقیقی شواہد کی غیر موجودگی میں اسے آزادؔ کا ہی فقرہ مان لیا گیا ہے۔ آزادؔ کے اس نظریے سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں میر کا کلام آہ ہے تو سوداؔ کا واہ، لیکن تقریباً نصف صدی تک اگر آزادؔ کے اس جملے کی گونج سنائی دیتی رہی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادؔ کسی معمولی شخصیت کا نام نہیں تھا۔ کلیم الدین احمدؔ آبِ حیات میں آزادؔ کی رنگیں بیانی پر لاکھ معترض ہوں اور اردو تنقید پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تذکرہ آبِ حیات کی دھجیاں بکھیر دیں لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ آبِ حیات نے کچھ ایسے نظریے ضرور پیش کئے ہیں جو اردو ادب کی دنیا میں تہلکہ مچانے کو کافی تھے۔ ایک طرف آزادؔ نے اردو زبان کی ابتدا سے متعلق یہ نظریہ دیا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے تو دوسری طرف تو دوسری طرف خواجہ باسطؔ کے حوالے سے یہ فرما دیا کہ میرؔ کا کلام 'آہ' ہے۔ آزادؔ کے یہ دونوں نظریے بعد ازاں رد کر دئے گئے لیکن آزادؔ نے لسانیات اور کلاسیکی شعری جمالیات پر بحث کے نئے دروازے کھول دئے۔

ماہرینِ لسانیات نے بڑی شد و مد سے یہ ثابت کر دیا کہ کہ اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی ہے اور اردو کے ناقدین نے میرؔ کی شاعری کے سنجیدہ مطالعے کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا کہ میرؔ کا کلام صرف آہ نہیں ہے۔ مجنوں گورکھپوریؔ کے مضمون 'میرؔ اور ہم' سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی کی کئی جلدوں پر محیط تنقیدی و تحقیقی کتاب شعرِ شور

انگیز تک میر کی شخصیت اور شاعری کی بہت ساری پرتیں دریافت کی گئیں اور میرؔ کو یک رخا ہونے کے الزام سے بری کر دیا گیا۔ میرؔ کے تعلق سے یہ بات بڑی امید افزا ہے کہ میرؔ کی شاعری کے بہت سارے پہلو دریافت کر لئے گئے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ مزید پہلو دریافت کر لئے جائیں تاہم خواجہ باسطؔ کے اس نظریے پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ میرؔ کا کلام آہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اسے میرؔ کو ایک مخصوص خانے میں فٹ کرنے کی سازش قرار دے لیکن اس میں کلام نہیں کہ میرؔ کی شاعری کا اصلی رنگ یہی ہے نیز یہ کہ میرؔ کی شاعری کا غالب حصہ 'آہ' پر ہی مبنی ہے۔ اگر آزادؔ نے میرؔ کی شاعری کو آہ سے عبارت کر دیا تو ایسی کیا غلطی کر دی کہ اسے میرؔ کے ساتھ ناانصافی پر محمول کیا جائے۔ میرؔ کے پہلے دیوان کے دوسرے شعر سے لے کر چھٹے دیوان کے آخری شعر تک دل کے اضطراب کا بیان ملتا ہے اور اس اضطراب کا سلسلہ اس 'آہ' سے ملتا ہے جو بقولِ آزادؔ، میرؔ کی شاعری کا خاصہ ہے۔ 'آہ' کلمۂ افسوس ہے۔ اس کے علاوہ یہ سانس، دم، نفس کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (فیروز اللغات۔ صفحہ ۴۶) اگر ہم آزادؔ کی بات کو درست مان لیں تو میرؔ کی شاعری کلمۂ افسوس کی شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ حیاتِ انسانی کی شاعری ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ اسے دور کی کوڑی لانے سے مماثل کریں لیکن فی الحال اگر صرف 'آہ' والی بات پر غور کریں تو اس سے انکار کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ میرؔ نے اپنے کلام میں زیادہ تر افسوس کا اظہار ہی کیا ہے۔ میرؔ کو خود اس کا احساس تھا کہ نوحہ گری کی روایت انہی سے قائم ہے اور رہے گی۔

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

میرؔ کی شاعری میں اگر درد و غم، گریہ و زاری، آہ و نالہ ہے تو اس وجہ سے کہ میرؔ 'دلِ گداختہ' رکھتے تھے۔ وہ ایک حساس شاعر ہیں۔ انہوں نے اگر ایک طرف زمانے کے سرد و گرم پہ نگاہ رکھی، اس کے اتار چڑھاؤ کا اثر لیا تو دوسری طرف اپنے دل کی آواز پہ بھی کان دھرے بغیر نہ رہ سکے۔ میرؔ کے یہاں آہ بھرنے والی کیفیت ہے تو اس لئے کہ میرؔ ہر حادثے سے متاثر ہوتے ہیں۔ چاہے وہ حکومتوں کے زوال کا واقعہ ہو یا نگروں کے اجڑنے کا، دل کی بستی کے خراب ہونے کا معاملہ ہو یا ہستی کے بے ثبات ہونے کا، میرؔ آہ بھرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میر کبھی عشق جیسے قیمتی جذبے کے رائیگاں جانے کا افسوس کرتے ہیں تو کبھی محبوب کی بے حسی و بے رخی اور اپنی ناقدری کا۔ کبھی یہ افسوس جوانی کے شتاب گذر جانے کا ہے تو کبھی اپنوں کے بچھڑ جانے کا۔ کبھی وہ ہجرت کا غم مناتے ہیں اور کبھی قدروں کی شکست و ریخت کا۔ غرض میرؔ اس دنیا سے مطابقت کرنے سے قاصر ہیں جس میں وہ جی رہے ہیں۔ شاید اس لئے وہ خود کو اکثر و بیشتر نالہ و فریاد میں مصروف دکھاتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک نہ ایک غم کا بیان ضرور ملتا ہے۔ کبھی وہ شدتِ غم سے چیخ چیخ کر روتے ہیں اور کبھی اندر اندر گھلتے ہیں، کبھی آنسوؤں کا دریا بہاتے ہیں تو کبھی سوکھے ہوئے دوآبے کا افسوس مناتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے سر ٹکراتے ہیں، پتھروں سے نبرد آزما ہوتے

ہیں،کبھی ریگ زاروں میں خاک چھانتے ہیں تو کبھی گھر کی ویرانیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔غرض میرؔ کے یہاں غم والم کی مختلف کیفیتیں ہیں،تنہائی سے لڑنے اور جوجھنے کی بھرپور کوششیں ہیں۔آہ وزاری کے نت نئے ڈھنگ، نالہ وفریاد کے الگ الگ رنگ ہمیں میرؔ کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔کبھی ان کے نالے شورِنشور کو شرماتے ہیں تو کبھی سینے کے اندر طوفان بپا کرتے رہتے ہیں۔میر جب روتا ہے تو مجلسیں اس کے ساتھ رو پڑتی ہیں۔میرؔ کی محزونی اور رقیق القلبی صرف ان کے دل تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ساری دنیا کو زمانے کے اتار چڑھاؤ کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور اپنے تجربے میں ساری دنیا کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔میرؔ کی شاعری کے حزنیہ رنگ کو پیش کرنے کے لئے ناقدین نے مثال میں ان کے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جو ان کی طبیعت کی محزونی کے غماز ہیں لیکن میرؔ کا غم اکثر ان کی طاقت بن گیا ہے۔وہ اس غم کو ڈھال بنا کر زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ میرؔ کی زندگی میں اگر یہ غم نہ ہوتا تو میرؔ، میرؔ نہ ہوتے 'گنجفے کا پتہ' ہوتے۔

'شاعرانہ صداقت اور تاریخی صداقت' کے ذیل میں ارسطو کا کہنا تھا کہ:

''شاعر کا کام یہ نہیں کہ جو کچھ حقیقت میں گذرا اس کو فی الواقعی جوں کا توں بیان کر دے بلکہ ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جو ہو سکتی ہیں یعنی جو ان حالات میں ہو سکتی تھیں کیونکہ ان حالات میں یا تو ان کا ہونا ضروری ہے یا وہ قرین قیاس ہیں۔شاعر اور مورخ میں یہ فرق نہیں ہے کہ ایک نظم میں لکھتا ہے اور دوسرا نثر میں۔۔فرق یہ ہے کہ تاریخ اس چیز کو بیان کرتی ہے جو ہو چکی ہیں جبکہ شاعری اس قسم کی چیزوں کو سامنے لاتی ہے جو ہو سکتی ہیں۔ اس وجہ سے شاعری بمقابلہ تاریخ کے زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ توجہ کے قابل ہے۔شاعری آفاقی صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے جبکہ تاریخ مخصوص واقعات سے سروکار رکھتی ہے۔'' **(ارسطو سے ایلیٹ تک۔از جمیل جالبی۔ص۱۰۲)**

میرؔ نے اپنی شاعری میں آفاقی صداقتوں اور تاریخی حقیقتوں کو ایک کر دیا ہے۔ میرؔ کو ہم مورخ نہیں کہنا چاہتے لیکن ہمیں اس بات کے ماننے سے بھی انکار ہے کہ میر کی شاعری کا ان کی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔میرؔ کی واقعہ نگاری ہمیں میرؔ کی شاعری میں میرؔ کے کردار کو تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اردو کے معتبر ناقد شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں کہ:

''واقعیت کے اس رنگ نے بہت سے نقادوں کو اس دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے کہ کلیاتِ میرؔ میں عاشق دراصل میرؔ خود ہیں اور جو معشوق ہے وہ بھی کوئی واقعی شخص ہے۔'' **(شعرِ شور انگیز۔جلد اول۔صفحہ۱۴۳)**

ارسطوؔ کے نظریات کی روشنی میں میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ میرؔ نے اپنی زندگی کے سارے واقعات کو ہو بہو قلمبند نہیں کیا ہوگا۔لیکن میرؔ اپنے زمانے، ماحول اور سماج سے بے خبر ہوں گے یا انہوں نے اپنی نفسیات، اپنے دل کے معاملات اور اپنے تجربات کی روشنی میں کوئی بات نہیں کہی ہوگی، اسے ذہن

قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔فاروقیؔ صاحب بھی آگے چل کر کہتے ہیں کہ:

''یہ اور بات ہے کہ ہر شاعر (اور غزل کا شاعر عام شاعر سے زیادہ) اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات سے کام لیتا ہے لہذا ممکن ہے کہ میرؔ نے بھی بہت سی ایسی باتیں کہی ہوں جو پوری کی پوری یا کم وبیش یا اس سے ملتی جلتی باتیں، خود ان پر گذری ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کر رہے ہیں یا اپنے دل کا دکھڑا رو رہے ہیں۔'' **(شعرِ شور انگیز۔جلد اول، صفحہ۔۱۴۴)**

میرؔ کی شاعری سرتا سر المناک نہیں ہے۔خود خواجہ باسطؔ یا محمد حسین آزادؔ نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ میرؔ کا کلام 'صرف' آہ ہے۔لیکن ان کی شاعری کا غالب حصہ غم والم سے ہی عبارت ہے۔اگر ہم میرؔ کی زندگی اور ان کے عہد کے حالات سے واقفیت نہ رکھتے ہوں تو بھی ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ شاعری کسی ایسے شاعر کی ہے جو رنج والم کے بیان میں دلچسپی رکھتا ہے۔خواجہ باسطؔ نے میرؔ کی شاعری کو 'آہ' کی شاعری ثابت کرنے کے لئے صرف ایک شعر پڑھا تھا

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

لیکن میرؔ کے چھ چھ دیوان اس بات کے گواہ ہیں کہ میرؔ کی شاعری کا بیش تر حصہ غم والم، آہ وافسوس سے عبارت ہے۔میرؔ کبھی کبھار اپنے خول سے باہر نکل کر ہنس بول لیتے ہیں یا جی بھر کر زندگی جی لیتے ہیں وگرنہ میرؔ کو واقعی غموں سے فراغ حاصل نہیں تھا۔زمین سے الجھاؤ اور آسمان سے جھگڑا رکھنے والا یہ شخص اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے تو اس لئے کہ وہ دنیا کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کر چکا تھا، دوستوں کو جھیل چکا تھا، رشتے داری کے مزے اس نے چکھ لئے تھے، حیاتِ انسانی کے اسرار ورموز سے وہ واقف ہو چکا تھا، اب اگر کوئی آدم بیزار ہو جائے اور ہر بات پہ کلمۂ افسوس سے کام لے تو غلط کیا ہے۔دنیا کی بے ثباتی اسے فقر وقناعت سکھاتی ہے۔وہ اس دنیا کا ایسا مسافر ہے جو ہمہ وقت سفر میں رہتا ہے۔جہاں رات ہوتی ہے وہیں بسرام کر لیتا ہے۔

ریگستاں میں جا کے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی رات ہوئی جس جاگہ ہم کو، ہم نے وہیں بسرام کیا

(کلیاتِ میر، مرتبہ احتشام حسین۔مطبوعہ رام نرائن لال، بینی مادھو، الہ آباد۔دیوانِ پنجم۔ص: ۶۲۸)

رات کو جوں توں صبح اور صبح کو جوں توں شام کرنے والے اس انسان کے پاس اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ اپنے بل بوتے تمام عمر خوش خرمی سے بسر کرتا۔اگر محمد حسین آزادؔ کے بیانا ے سے صرفِ نظر کر کے میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیں تو بھی میرؔ کی شاعری کے المناک ماحول سے واقف ہونے میں دیر نہیں لگتی۔المناک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرؔ کی المنا کی ان کے منفی رویے کی غماز ہے۔میرؔ کی المنا کی کا ایک پہلو یہ بھی ہے میرؔ نے اس دنیا سے سرسری گذرنے کے باوجود ہر 'جہانِ دیگر ' سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری میں اگر وہ سانس آہستہ لینے کی

ہدایت کرتا ہے تو محض اس لئے کہ صناعی میں فرق نہ آئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجہول ہے۔ میر زندگی کا ایک واضح تصور رکھتے تھے۔ 'شاعرانہ صداقت اور تاریخی صداقت' کے باب میں ارسطو کا کہنا ہے کہ:

''جو چیز ممکن ہے وہ قابلِ یقین بھی ہوتی ہے، جبکہ ہمیں کسی ایسی چیز کے امکان کا یقین نہیں ہوتا جو واقع نہیں ہوئی ہے۔ جو بات ہو چکی ہے وہ بالکل ممکن معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگر وہ ممکن نہ ہوتی تو وہ ہوئی بھی نہ ہوتی۔'' **(ارسطو سے ایلیٹ تک۔ از جمیل جالبی۔ ص: ۱۰۲)**

لہٰذا میر کی شاعری کو ہم ان کی زندگی سے جوڑ کر دیکھیں یا نہ دیکھیں، یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ میر نے اپنی شاعری میں جو تجربات بیان کئے ہیں، وہ ممکن ہیں اور پیش آسکتے ہیں، چاہے میر کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ۔ ٹریجیڈی، بقول ارسطو 'ایک مکمل عمل ہی کی نمائندگی یا نقل نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات کی بھی جو خوف اور ترس کے جذبات پیش کرتے ہیں۔' **(ارسطو سے ایلیٹ تک۔ از جمیل جالبی ص: ۱۰۳)**

ہوسکتا ہے کوئی یہ کہے کہ ارسطو کے ان نظریات کا اطلاق ڈرامے پر ہوتا ہے، شاعری پر نہیں۔ لیکن بات اگر شاعری میں المیہ کے پیشکش کی ہو تو ارسطو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی، انتظار حسین کو نظیر اکبر آبادی میں ایک افسانہ نگار اور میر میں ایک ناول نگار نظر آتا ہے (شعرِ شور انگیز۔ جلد اول۔ ص: ۵۱) لیکن سچ تو یہ ہے کہ میر ناول نگار سے زیادہ اک ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی شعری دنیا میں رنگا رنگ کردار نظر آتے ہیں۔ میر کو شمس الرحمٰن فاروقی کی بحث کی روشنی میں اگر ہم عاشق نہ بھی مانیں، اگر یہ فرض کرلیں کہ کوئی دوسرا ہے تو بھی یہ عاشق، عشق کا بھرپور تجربہ رکھتا ہے۔ محبوب کے ناز نخرے اٹھاتا ہے، اس کے لئے جان دینے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے اور کبھی اسے راہ پر لانے کی کوشش میں جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا **(دیوان اول)**

میر یا وہ شخص جو میر کی شاعری میں عاشق کا کردار نبھا رہا ہے، یا پھر وہ بہت سارے لوگ جو الگ الگ طور پر عاشق کا کردار نبھا رہے ہیں، میر کا ایک معشوق یا پھر وہ بہت سارے معشوق جو میر کے یہاں الگ الگ روپ میں سامنے آتے ہیں، میر کے سماج سے تعلق رکھنے والے یا پھر میر کے متقدمین کے سماج سے تعلق رکھنے والے یا مستقبل کے سماج کا حصہ بننے والے کردار مثلاً قاصد، شیخ، واعظ، رقیب، ساقی، ہمصفیر، ہمسفر، وغیرہ شاعر کے تجربے کا حصہ ہیں یا پھر وہ ویسے ہوسکتے ہیں جیسا کہ شاعر قیاس کر رہا ہے۔ یہ میکانکی نہیں ہیں بلکہ زندگی سے بھرپور ہیں۔ اگر صرف شاعر یا معشوق کے تجربے کا احاطہ کریں تو ارسطو کے مطابق اپنے تجربے بیان کرکے وہ خوف اور ترس کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ عشق میر کے نزدیک افضل ترین جذبہ ہے

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

اس کے باوجود دل لگانے کا تجربہ میر یا ایک عاشق یا بہت سارے عاشقوں کے نزدیک، اندوہ ناک ہے۔ وہ عشق کرکے پچھتاتے ہیں۔ محبوب کا ہجر جھیلتے ہیں، شب و روز آنسو بہاتے ہیں، وصل کی شادکامی کو یاد کرکر کے کڑھتے ہیں، نادم ہوتے ہیں، چاہتے ہوئے بھی شکوہ نہیں کر پاتے، کبھی حیا، کبھی محبوب کی دلآزاری کا خیال زبان پر تالے ڈال دیتا ہے۔ عشق کا تلخ تجربہ شاعر کو نہ چین سے جینے دیتا ہے، نہ مرنے۔ ذیل کے اشعار سے اس بات کی وضاحت ہوسکتی ہے۔

ہوس تھی عشق کے کرنے میں لیکن بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم **(دیوان اول ص: ۱۱۷)**
فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر برنگِ سبزۂ نورستہ پائمال کیا
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ **(دیوانِ اول، ص: ۱۷۱)**
دل دینے کی ایسی حرکت ان نے نہیں کی جب تک جئے گا میر پشیمان رہے گا **(ص ۲۲)**
کیا کیا زیان میر نے کھینچے ہیں عشق میں دل ہاتھ سے دیا ہے جدا، سر جدا دیا **(دیوان دوم، ص: ۲۶۲)**
لگ جاوے دل کہیں تو اسے جی میں اپنے رکھ رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا **(ص: ۲۶۲)**
عشق نہ پوچھو آہ ہمارا، کیا کیا رنگ بدلتا ہے خون ہوا دل، داغ ہوا پھر، درد ہوا، پھر غم ہے اب **(ص ۶۴۳)**
زخم جھیلے، داغ بھی کھائے بہت دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت **(دیوانِ سوم، ص: ۴۶۷)**

میر کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع بے ثباتئ دنیا ہے۔ اردو کے بیشتر ناقدین نے اس کے لئے اس صوفیانہ اور درویشانہ ماحول کو ذمہ دار قرار دیا ہے جس میں میر کی پرورش ہوئی تھی۔ میر/شاعر/عاشق دنیا کی بے ثباتی کے پیشِ نظر اس سے دل لگانے کو بے وقوفی جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس بے ثبات دنیا کے لئے اتنی تگ و دو بے کار ہے۔ زندگی کسی نہ کسی طور گذر ہی جاتی ہے لہٰذا مال و متاع کے پیچھے بھاگنا عبث ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھئے:

منعم کے پاس قاقم و سنجاب ہے تو کیا اس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا **(دیوانِ اول، ص: ۱۹)**
شبنم کی سی نمود سے تھا میں عرق عرق یعنی کہ ہستی ننگِ عدم تھی، خجل گیا **(دیوانِ پنجم، ص: ۶۳۸)**
کوئی نہیں شاہانِ سلف میں خالی پڑے ہیں دونوں عراق
یعنی خود گم اسکندر ہے ، ناپیدا ہے دارا آج **(دیوانِ پنجم، ص: ۶۴۵)**
اس کارواں سرائے کے ہیں لوگ رفتنی حسرت سے ان کا کرتے ہیں نظارہ دردمند
(دیوانِ پنجم۔ ص: ۶۵۰)
ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا **(دیوانِ اول، ص: ۲۰)**
منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا **(دیوانِ اول۔ ص: ۲۲)**

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انہوں کا جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا **(دیوانِ اول، ص:۲۰)**

انوکھا تو کہ یاں فکرِ اقامت تجھ کو ہے ورنہ سب اس دل کش جگہ سے رخت اپنا بار کرتے ہیں

(دیوانِ دوم، ص:۳۵۹)

دراصل میرؔ دنیا والوں کو یہ ہدایت دینا چاہتے ہیں کہ دنیا سے زیادہ امید لگانا فضول ہے۔ زندگی اگر ہموار ڈھنگ سے گذارنی ہے تو توقعات کا حد میں رہنا ضروری ہے۔ میرؔ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح انسان کو عشق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے رنج و کرب سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی قدروں کی شکست و ریخت، رشتوں کی پامالی، سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔ ارسطوؔ کے مطابق ٹریجیڈی ہمارے جذبات کو فارم عطا کرتی ہے۔ میرؔ نے اپنی حزنیہ شاعری کے ذریعہ انسانی جذبات کو ایک فارم میں لانے کی کوشش کی ہے، انہیں توازن عطا کرنے کی پہل کی ہے۔ بقول ارسطوؔ، ٹریجڈی ترس اور خوف کے جذبات کو اس حد تک ابھارتی ہے کہ وہ جذبات تھک کر ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جذبات کا ظہور ہوتا ہے جو امید و ہمت سے عبارت ہیں۔ یہ عمل، ارسطوؔ کے نزدیک اس یونانی طریقۂ علاج کی طرح ہے جس میں بیماری کو پہلے ابھارا جاتا ہے اور پھر اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ ارسطوؔ اسے 'کتھارسس' کا نام دیتا ہے۔ میرؔ کے یہاں غم و اندوہ کی یہ بہتات دراصل ایک طرح کے کتھارسس کا کام کرتی ہے۔ میرؔ انسان کو خوف میں مبتلا کر کے ایسے اعمال سے دور رکھنا چاہتے ہیں جو انسان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر کر کے انسان کو دنیا کے لہو ولعب میں گرفتار ہونے سے روکتے ہیں اور عشق کے خوفناک نتائج سے آگاہ کر کے اس سے باز رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ ایسا عبرت ناک ماحول تیار کرتے ہیں جو ڈرامائیت سے بھرپور ہے۔

میرؔ کے یہاں رونے کے کئی ڈھنگ ہیں، یہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ میرؔ کا رونا کبھی چیخ و پکار کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی خاموشی سے آنسو ڈھلتے ہیں۔ کبھی وہ دکھوں کے اظہار کے لئے روتے ہیں، کبھی محبوب کو پرچانے کے لئے اور کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے۔ ان کے لئے رونے رلانے کی طرف توجہ کرنا دردمندی کی علامت ہے اور یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

یا روئے یا رلایا، اپنی تو یونہی گذری کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا **(دیوانِ اول، ص:۲۰)**

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد **(دیوانِ سوم، ص:۴۷۱)**

سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے یہی کر جب تلک معطل ہے **(دیوانِ اول، ص:۲۴۶)**

ہر گل زمین یاں کی رونے ہی کی جگہ تھی مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا **(دیوان اول، ص:۶۳)**

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو **(دیوان اول، ص:۱۶۹)**

میرؔ کی نظر میں وطنِ عزیز کی بڑی اہمیت تھی۔ اپنی مٹی چھوڑنے کی کسک میرؔ کو تڑپاتی رہتی ہے۔

لکھنو دلی سے آیا، یاں بھی رہتا ہے اداس میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا **(دیوانِ چہارم، ص:۵۵۳)**

کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں **(دیوانِ دوم، ص:۳۶۲)**

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں **(دیوانِ چہارم، ص:۵۹۷)**

بے وطنی اور ہجرت کا یہ درد بیان کر کے کیا میرؔ ہماری توجہ ان حالات کی طرف نہیں موڑ دیتے جن کے نتیجے کے طور پر میرؔ کو بے وطنی کا درد جھیلنا پڑا۔ جب ایتھینز میں مسلسل جنگوں کی وجہ سے عام انسانی زندگی متاثر ہو رہی تھی تو یورپیڈیزؔ نے المیے لکھ کر جنگ و جدل سے ایک طرح کی بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا تھا۔ بقول فاروقیؔ:

> ''اس کے المیے میں دراصل کتھارسس اس طرح ہوتی ہے کہ وہ قاری اور ناظر کو دردمندی اور قوت کے تجربات سے روشناس کر کے حقیقی زندگی میں جنگ بازی اور اس کے نتائج کے خلاف رجحان کا حامل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔''

(شعریات۔ ترجمہ و تعارف: شمس الرحمٰن فاروقی (۱۹۹۸ء) مطبوعہ قومی کونسل، ص:۴۳)

اسی طرح میرؔ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں ایسے بہت سے کردار دیکھتے ہیں جو اخلاقی طور پر پست ہیں۔ میرؔ ان کی برائی کر کے، ان کا مذاق اڑا کے یہ جتانا چاہتے ہیں کہ ان کرداروں کے یہ اعمال لائقِ تحسین نہیں ہیں۔ یہ کبھی بھی مثالی کردار نہیں بن سکتے۔ ان سے اتفاقاً غلطی سرزد نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو آزار پہنچانا ہے۔ منعم، شیخ، ناصح جیسے کرداروں کا شاعر مضحکہ اڑاتا رہتا ہے۔

ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے ہمارے عندیے میں تو ہے وہ خبیث پلیت **(دیوانِ سوم، ص:۴۶۵)**

یہ سر نہیں ہے شایاں شورِ قلندری کا گو شیخِ شہر باندھے زنجیر و زنگ آیا **(دیوانِ سوم ، ص:۴۴۴)**

گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو کہ جبہ ہے یک بار و عمامہ سربار **(دیوانِ اول ص:۹۴)**

کب اس عمر میں آدمی شیخ ہوگا کتابیں رکھیں ساتھ گو ایک خربار **(دیوانِ اول ص:۹۴)**

میدانِ محبت میں اپنی اہمیت جتانے کے لئے بڑے بڑے عاشقوں کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے۔

دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا لڑکا سا ان دنوں تھا، اس کو شعور کیا تھا **(دیوانِ چہارم، ص:۵۵۱)**

کوہِ فرہاد سے کہیں آگے سر مرا اور سنگ خارا تھا **(دیوانِ چہارم، ص:۵۵۶)**

میرؔ کو اس بات کا غم ہے کہ دنیا سے انسانیت ختم ہو گئی ہے۔ میرؔ/شاعر/عاشق کا کہنا ہے کہ محبت دنیا سے ختم ہو گئی ہے، وفا کا نام و نشان نہیں ہے، لیکن کم از کم مروت کو تو زندہ رہنا چاہیئے تھا۔ جب انسان انسان ہی نہیں رہے گا، جب اس کے اندر انسانیت کی کم سے کم پہچان بھی نہیں پائی جائے گی تو پھر وہ انسان کہلائے گا کیسے؟

آدمی اب نہیں جہاں میں میرؔ اٹھ گئے اس بھی کاروان کے لوگ **(دیوان چہارم، ص:۵۸۳)**

غرض میرؔ کی شاعری رنج و الم کی شاعری ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک ایسی طاقت رکھتی ہے جو

انسان کو دنیا کے عظیم ترین سانحوں سے باخبر کرتی۔ وہ دل کے جانے کا سانحہ ہو یا دلّی کے اجڑنے کا، میرؔ اس کا بیان ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح انسان کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اسے اس کی خامیاں اور کمزوریاں یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اسے محتاج اور کمزور بنانے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی اہمیت کا اندازہ کراتے ہیں۔ وہ انسان کی خوبیوں کے قائل اور اس کی کمزوریوں کو معاف کر دینے کے حق میں ہیں۔ شعریات میں ارسطو کے کتھارسس والی بحث کا ترجمہ کرتے ہوئے فاروقیؔ صاحب فرماتے ہیں کہ

> ''المیہ کے ذریعہ ہم خوف اور دردمندی کے جذبات سے اس قدر اور اس کثرت سے دوچار ہوتے ہیں کہ ہمارے یہ جذبات (جو ایک طرح کی کمزوری ہی ہیں)، سرد پڑ جاتے ہیں اور اس طرح حقیقی زندگی میں ہمیں اس کمزوری کے نقصانات نہیں بھگتنے پڑتے۔۔۔۔ المیے کی حدود میں خوف اور دردمندی کے جذبات کو برت کر ہم ایک طرح کی مضبوطی حاصل کرتے ہیں اور عملی زندگی میں جب ایسے مواقع آتے ہیں جہاں ان کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم ان جذبات کا شکار آسانی سے نہیں ہوتے اور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔'' **(شعریات، ص:۴۲)**

مجھے نہیں پتہ کہ میرؔ ارسطوؔ کے ان نظریات سے باخبر تھے یا نہیں تھے، اور اگر باخبر تھے تو انہوں نے کس حد تک اسے اپنایا، لیکن میرؔ کی شاعری میں رنج والم کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اور جس طرح انسان کو زندگی کے منفی پہلوؤں سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے وہ ایک معلمِ اخلاق ہی کر سکتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ میرؔ کسی معلم اخلاق کی طرح اخلاقیات پر عالمانہ اور خشک گفتگو کرنے کے بجائے مختلف موضوعات کے ذریعہ بہتر انسان بننے اور اچھی زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھا جاتے ہیں۔ آزادی کے معنی بتا جاتے ہیں۔ یہ وہ دیوانہ ہے جو زندگی کے عظیم حقائق سے واقف ہونے کے بعد دوسروں کو بھی ان کا احساس دلا جاتا ہے۔ میر کی ہنسی میں آنسوؤں کی نمی ہے اور آنسوؤں میں تبسم زیرِ لب:

تھا میرؔ بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

(دیوانِ سوم، ص:۵۵۰)

میرؔ کی شاعری انسان کو زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے، مرنے پر آمادہ نہیں کرتی۔ وہ اپنے غم کو جس طرح cherish کرتے ہیں وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ ظرفی شرط ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر شہناز نبی (کولکاتا)

اکبر الہٰ آبادی اور تعلیمِ نسواں

اکبر الہ آبادی کو کسی نے طنز و مزاح کا شہنشاہ قرار دیا تو کسی نے مصلحِ قوم بتایا۔ اکبرؔ کا زمانہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں پر محیط ہے (۱۸۴۵ء سے ۱۹۲۱ء)۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ دور دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کا زمانہ تھا۔ بہت سارے واقعات تیزی سے پیش آتے جا رہے تھے۔ ایک طرف انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار دوسری طرف ہندوستانیوں کے دل میں کھوئی ہوئی زمین کی بازیافت کا ولولہ۔ کہیں انگریزوں کی پالیسیوں کو ماننے کی ترغیب دی جا رہی تھی، ان کے نقشِ قدم کو اپنانے کا مشورہ دیا جا رہا تھا، ان کی تہذیب و تمدن کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے، ان کی زبان و ادب، انکے طرزِ معاشرت کی خوبیاں گنوائی جا رہی تھیں تو کہیں ان کے خلاف بغاوت کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ان کا تختہ الٹنے کی سازشیں ہو رہی تھیں، ہندوستان کو ان کے ناپاک وجود سے آزاد کرانے کے لئے جنگی قواعد اور مشقیں جاری تھیں۔ پورا ہندوستان گویا دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ کچھ لوگ انگریزوں کے وفادار تھے اور کچھ ان کے مخالف۔ کسی کو مشرقی زبان و ادب اور ہندوستانیت سے لگاؤ تھا تو کوئی مغرب کی تقلید میں فخر محسوس کر رہا تھا۔

جب ہم اکبر الہ آبادی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے جو انگریزی تہذیب کا شدید مخالف ہے۔ اکبر کو نہ صرف انگریزی تہذیب بلکہ انگریزی زبان، انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت سے بھی اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سر سید ہی ہوں کیونکہ اکثر محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے سر سیدؔ کی مخالفت میں ہر طرح کی آزادی اور ترقی کی مخالفت کی۔ محمد حسن اس کی نفسیاتی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ان کے اندر بھی ویسی ہی مقبولیت، ویسے ہی اعزاز و عظمت کی تمنا کروٹیں لیتی رہی جو ان کے ہم عصر سر سیدؔ کو حاصل تھی۔ لیکن قوم و ملت نے سر سید کی جیسی قدر شناسی کی، مسلم پبلک کے ایک بڑے تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ حلقے میں ان کی جیسی آؤ بھگت ہوئی، اکبر الہ آبادی اس سے محروم رہے۔ سرکار برطانیہ نے بھی جس کے وہ نمک خوار تھے جہاں سر سید کو 'سر' کے خطاب سے نوازا، انہیں صرف خان بہادری کے لائق سمجھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر سید کے

لئے رشک وعناد کے جذبات اکبرالہ آبادی کے اندر پرورش پانے لگے۔ چنانچہ سرسید کی شاید واحد ذات ہے جسے انہوں نے بحیثیت ایک فرد کے اپنی طنزیہ شاعری کا نشانہ بنایا ہے۔ سرسید کو ملعون و مطعون بنانے انہوں نے کوئی کسر چھوڑ نہ رکھی۔'' **(بحوالہ: طنزیہ ادب کی نفسیات اور اکبرالہ آبادی کی طنزیہ شاعری۔ سید محمد حسن۔ ص:۶-۷)**

ہوسکتا ہے کہ سرسیدؔ سے پرخاش کی یہ ایک بہت بڑی وجہ رہی ہو لیکن سرسیدؔ کی مخالفت کی دھن میں اکبرؔ نے ہندوستان کی ایک بہت بڑی آبادی کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی رجعت پسندی نے ہندوستانی مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی تنگ نظری نے جہاں مردوں کو ایک عرصے تک انگریزی تعلیم سے دور رکھا وہاں عورتوں پر تعلیم کے دروازے کو کھلنے ہی نہ دیا۔ انیسویں صدی کا یہ زمانہ مسلمان عورتوں کو ہندوستان کی دوسری غیر مسلم عورتوں کے مقابل کھڑا کرسکتا تھا اور تعلیم کے میدان میں وہ اپنی دوسری بہنوں کے شانہ بہ شانہ چل سکتی تھیں تاہم اکبرؔ نے تعلیمِ نسواں کے خلاف آواز اٹھا کر پوری قوم کو گمراہ کیا۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم کو عورت کی گمرہی بتانے کی کوشش کی اور تعلیم یافتہ عورت کی ایسی مکروہ تصویر پیش کی کہ والدین نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم سے دور رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ تعلیمِ نسواں کی طرف سے سرسید کی لاپرواہی کا ایک سبب اکبرؔ کی مخالفتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ شاید سرسیدؔ تنقیدی بوچھاروں کا مقابلہ ایک حد تک کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں سرسید کی بے توجہی خود سرسیدؔ کی دور بینی اور دانشمندی پر ایک سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ اگر سید محمودؔ اور جسٹس امیر علی نے عورتوں کی تعلیم کا لائحہ عمل تیار نہ کیا ہوتا تو شاید اس نیک کام کی شروعات میں مزید تاخیر ہوتی۔ یہ سید محمود ہی تھے جنہوں نے لندن سے واپس آنے کے بعد مسلمان عورتوں کی تعلیم پر خاص طور سے زور دیا اور ۱۸۹۲ء کے ایک تعلیمی کانفرنس میں مسلمان عورتوں کی جدید تعلیم کا تصور دیا۔ ان کے لئے الگ اسکول کھولنے اور نصاب ترتیب دینے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ گرچہ سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں ہی قائم کردیا تھا تاہم اس میں کوئی ایسی شق شامل نہیں تھی جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ سرسیدؔ تعلیمِ نسواں کا کوئی ٹھوس منصوبہ رکھتے تھے۔ الٹے سرسید نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ

''عورتوں کی تعلیم کے لئے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندوستان کی موجودہ حالت کے لئے کسی طرح مناسب نہیں اور میں اس کا سخت مخالف ہوں۔''

(بحوالہ: مسلم خواتین کی تعلیم۔ محمد امین زبیری۔ ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۵۶ء ص:۹۵-۹۶)

اب ایسے میں جب قوم کے رہبر و رہنما، ترقی یافتہ ذہن رکھنے والے سالارِ کارواں ہی عورتوں کی تعلیم کے تعلق سے ایسی منفی باتیں کہنے لگیں تو ان کا کیا نظریہ ہوگا جو عورتوں کی تعلیم کو پوری قوم، پورے ملک، پورے معاشرے کی تباہی کا ذریعہ مان بیٹھے تھے اور جن کا خیال تھا کہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوکر بدکردار اور بدچلن ہوجائیں گی۔ تعلیمِ نسواں کی ضرورت اور اہمیت پر کھل کر بحث اس وقت ہوئی جب ۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا

اور جسٹس سید امیر علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

''میری رائے میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے متوازی چلنا چاہئے تا کہ سوسائٹی پر اس کا سودمند اثر پڑے۔ جب تک ترقی کے دونوں جزو برابر تناسب سے نہ ہوں گے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں ہوسکتا۔'' **(مسلم خواتین کی تعلیم، ص:۱۰۲)**

اکبرؔ نے اپنی شاعری میں جابجا عورتوں کی تعلیم پر چھینٹے کسے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم عورتوں کو بے شرم بنا دے گی۔ وہ گھر کی چاردیواری میں قید رہنے کے بجائے آزادانہ گھومتی پھرے گی۔ اکبر صحیح معنوں میں ایک Male Chauvinist ہیں جو عورت کو محکوم، مجبور، بے بس اور مرد کا غلام دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ان سے عورت کی خوداعتمادی اور اس کی آزادی برداشت نہیں ہوتی۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں
پئے تکریمِ مہماں بن سنور کے بیبیاں آئیں

طریقِ مغربی سے ٹیبل آیا ، کرسیاں آئیں
دلوں میں ولولے اٹھے، ہوس میں گرمیاں آئیں

امنگیں طبع میں ہیں، شوقِ آزادی کا بلوا ہے
کھلیں گے گل تو دیکھو گے، ابھی کلیوں کا جلوا ہے

اکبرؔ اس واعظ کی طرح ہیں جو انسان کے دل میں ان ہونی کا خوف پیدا کرتے رہتے ہیں اور عقبیٰ کا واسطہ دے دے کر دنیا سے بھی واقف ہونے نہیں دیتے۔ انہیں یہ تصور ہی لرزا دیتا ہے کہ جب پڑھی لکھی لڑکیاں سڑک پر نکلیں گی تو وہ منظر کیسا دلخراش ہوگا۔

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوش رو، ساختہ پرداختہ

یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اکبرؔ کے نزدیک تعلیم حاصل کرنا بے حیائی کی علامت ہے۔ وہ روشن خیالی سے خوف زدہ ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ گریجویٹ ہونے والے صرف لیٹ کر ہی بات کرسکتے ہیں

میں بھی گریجویٹ ہوں، تو بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ

دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحان
ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں

بولی یہ سچ ہے علم بڑھا، جہل گھٹ گیا
لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا
اک پیر نے تہذیب سے لڑکی کو سنوارا

پتلون میں وہ تن گیا، یہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

صغریٰ مہدیؔ نے اپنی کتاب میں بیگم خواجہ حسن نظامی سے لئے گئے ایک انٹرویو کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے

کہ بقول بیگم خواجہ حسن نظامی، اکبؔر عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر اکثر گفتگو کرتے تھے۔

''اکبؔر کہتے کہ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ انہیں تعلیم ملنی چاہیئے۔ انہیں مذہب سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بھی انہیں واقف ہونا چاہیئے۔ حساب کتاب بھی آنا چاہیئے۔ اور اخلاقی اور سبق آموز کتابیں بھی ان کے مطالعے میں رہنی چاہئیں تا کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرسکیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے تو مخالف نہیں تھے، مگر اس حق میں تھے کہ عورتوں کو وہی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے جو امورِ خانہ داری، بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہوں۔''

(اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء۔ ص:۷۴)

روسوؔ (Rousseau) اور اکبؔر کے خیالات، زمانی بعد کے باوجود ایک سے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں روسوؔ کا کہنا تھا کہ:

The first and most important quality of a woman is gentleness. Made to obey a person as imperfect as man, often so full of vices, and always so full of faults, she ought early learn to suffer even injustice, and to endure the wrongs of a husband without complaint, and it is not for him but for herself that she ought to be gentle.

(Rousseau's Emile, p: 270 ., By William. H. Payne)

ایک دوسری جگہ روسوؔ کہتا ہے کہ

" Thus the whole education of women is ought to be relative to men.To please them, to be useful to them, to make themselves loved,and honored by them, to educate them when young, to care for them when grown, to counsel them, to console them, and to make life agreeable and sweet to them - these are the duties of women at all times, and what should be taught them from their infancy." **(Rousseau's Emile., p: 263)**

اکبؔر کے خیالات اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ بھی روسوؔ کی طرح عورت کی زندگی کا مقصد مرد کی خدمت اور غلامی سمجھتے تھے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبر نے قدم قدم پر عورت کو پردے میں رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کے خیال میں ایسے مرد بے وقوف ہیں جو عورت کو پردے سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا
پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ

سن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک — یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیرِ نا بالغ ہیں وہ
خون میں باقی رہی غیرت تو سمجھے گا کبھی — خوب تھا پردہ، نہایت مصلحت کی بات تھی

اکبر اپنی شاعری میں دو طرح کی عورت کا تصورر پیش کرتے ہیں۔ ایک مشرقی، دوسری مغربی۔ مشرقی عورت قابلِ احترام ہے لیکن مغربی عورت مالِ مفت ہے۔ وہ مشرقی عورت کو ستر پردے میں چھپا کے رکھنا چاہتے ہیں لیکن مغربی عورت کے حسن سے آنکھیں سینکنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ مغربی عورت کو دیکھتے ہی ان کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن کا مذاق اڑانے کے جوش میں انہوں نے مغربی عورت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ انتہائی چھچھورا ہے۔

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے — گال ایسے پریزادہوں اور کِس نہ لیا جائے
تھی مرے پیشِ نظر وہ بتِ تہذیب پسند — کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی، کبھی شربت ِ قند
رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں جو دو چار — ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید — قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں — گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
تہذیبِ مغربی میں ہے بوسے تلک معاف — اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

وہ مغربی عورتوں کو بدقماش اور بدکردار ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے کہ ساری انگریز عورتیں دن رات ہوٹل میں تاش کی بازی کھیلتی رہتی ہیں اور انہیں ہر وقت عاشقوں کی تلاش رہتی ہے۔

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز وطریق — ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم — ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کردو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا، پریوں کا سایہ ہو گیا — جن سے تھی دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیانِ زہرہ وش، جادو نظر — یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

غرض اس مالِ مفت پر اکبر کا دلِ بے رحم کوئی رعایت نہیں کرتا اور سرِ عام ان عورتوں کو ننگا کر کے اکبر گویا انگریزوں سے ان کے ظلم واستبداد کا بدلہ لیتے ہیں۔ وہ ہندوستانی مردوں کا تو کیا ہندوستانی عورتوں کا بھی ان انگریز عورتوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ اکبؔر نے پوری قوم کو انگریزی تہذیب، انگریزی تعلیم، اور انگریز عورت سے دور رہنے کا مشورہ دیا لیکن جب ان کی اولاد خود کسی موم کی پتلی پر لٹو ہو جاتی ہے تو اکبؔر سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں کرتے۔ نقوش آپ بیتی نمبر میں محمد عبدالرزاق کانپوری کے مطابق اکبؔر نے ظریفانہ شاعری اس لئے کی تھی کہ وہ اودھ پنچ کی فرمائش پوری کرنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں

''میں نے سید اکبر حسین سے ایک موقعہ پر سوال کیا کہ آپ جیسے مذہبی شخص نے ظریفانہ شاعری کیوں اختیار

کی اور سرسید اور کالج کے خلاف مضامین کس بنا پر لکھنا شروع کئے۔ ہنس کر فرمایا کہ 'یہ رنگ اودھ پنچ کے مضامین کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور ظریفانہ مذاق بھی اس زمانے کے ماحول کا نتیجہ تھا' سچ تو یہ ہے کہ شہرت و ناموری کا ذریعہ اس عہد میں اخباری مضامین ہی تھے۔ لہٰذا اکبر حسین سے جو غلطی ہوئی وہ معافی کے قابل ہے اور مجھے بھی یہ خبر ہے کہ اخیر دور میں سید اکبر حسین کے احباب نے بھی ان کو سرسید کی اور کالج کی مخالفت سے منع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا رنگ اس کے بعد بدل گیا تھا۔"

(نقوش۔ آپ بیتی نمبر۔ جون ۱۹۶۴ء۔ مدیر: محمد طفیل۔ لاہور۔ ص: ۴۲۸۔۴۲۹)

اگر عبدالرزاق کانپوری کی بات کو سچ مان لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اکبر نے اودھ پنچ کے ذریعہ مقبول ہونے کے لئے طنز و مزاح کا سہارا لیا، سرسید کی مخالفت کی اور وہ مغربی تہذیب جس کے وہ بظاہر اتنے مخالف معلوم ہوتے ہیں، کا اس لئے مذاق اڑایا کہ وہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھ کر جلدی سے شہرت حاصل کر لینا چاہتے تھے بھلے ہی اس کا خمیازہ ان معصوموں کو بھگتنا پڑے جنہوں نے اگر ملک و قوم کو آگے لے جانے میں کوئی نمایاں رول ادا نہیں کیا تو اسے پیچھے گھسیٹنے کا جرم بھی ان پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔

"اکبر الٰہ آبادی کی طنز کے بارے میں ایک اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کہیں کہیں اس کے پس پشت مجروح شخصیت اور احساسِ کمتری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ ان کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کرنے پر بے نقاب ہو سکتی ہیں۔۔۔ ان کے زمانے کے حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ سرسید کی طرح وہ بھی قومی ترقی پر اپنی توجہ مبذول کرتے اور اپنی قوم کو مغرب کے بعض ترقی پسند رجحانات سے قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے لیکن ہوا یہ کہ 'یارانِ تیز گام' تو برق رفتاری سے اس راستے پر گامزن ہو گئے اور اکبر اپنی زنجیروں میں ہی جکڑے رہ گئے۔ ایک طرح سے زندگی کے اس بڑے موقع کو گنوا کر اکبر نے اپنی تگ و تاز کے میدان کو خود ہی محدود بھی کر لیا۔ لاشعوری طور پر انہیں اس بات کا افسوس بھی تھا۔ چنانچہ ایک وفادار چیلے کی طرح سرسید کی تحریک میں شامل ہونے کی بجائے انہوں نے اس ساری تحریک اور اس کے پس منظر یعنی مغربی تہذیب کے رجحانات ہی کو ہدفِ طنز بنانے کا آغاز کیا اور اگرچہ اپنے خانگی معاملات میں انہوں نے مغربی رجحانات کی اس شد و مد سے مخالفت نہیں کی (اکبر الٰہ آبادی نے اپنے صاحبزادے کو اعلیٰ مغربی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا، جہاں وہ کئی برس مقیم رہے) تاہم اپنے اشعار میں ہمیشہ ان پر لعنت بھیجتے رہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی زندگی کے یہ دو متضاد رجحانات اس "مجروح شخصیت" کو ایک حد تک بے نقاب کرتے ہیں جو ان کے طنزیہ کلام کے پس پشت موجود تھی"

(اردو ادب میں طنز و مزاح از **ڈاکٹر وزیر آغا** صفحہ نمبر ۱۰۶، ۱۰۷)

ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر)

عمر خیام: شرابِ حقیقت کا طلب گار

ایک مرتبہ کچھ لوگ سقراط کے پاس کسی مسئلہ کے حل کرنے کی غرض سے گئے۔ جواب میں سقراط نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ ہم میں اور تم میں کیا فرق رہا۔ ہم بھی نہیں جانتے اور تم بھی نہیں جانتے۔ سقراط نے کہا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا اور تم لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ یہاں ایسی ہی ایک مشہورِ زمانہ ہستی کا ذکر مقصود ہے' جو شعبہ ہائے علوم و فنون کا ماہر تھا' لیکن اس کا کہنا تھا کہ زمین آسمان' سورج چاند' تو جاہل بھی جانتا ہے' کسان بھی زمین سے دوبار' اناج نکالنا جانتا ہے' لیکن عالم بھی خدا کو نہیں جان سکتا۔ اس لیے عالم کو اپنی لاعلمی پر ناز کرنا چاہیئے' کیونکہ ہر آدمی لاعلمی کے مرتبے پر نہیں پہنچ سکتا۔

فلسفہ' ادب اور تاریخ میں جس خیام کو' بوعلی سینا کی ہمسری حاصل ہے' وہ' 440 ہجری' مطابق 1019 عیسوی اپنے وطن نیشاپور میں پیدا ہوا۔ نام عمر' اور والد کا نام ابراہیم تھا۔ آبائی پیشہ چونکہ خیمہ دوزی تھا' جس کی وجہ سے لقب خیام پڑا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ خیام' حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی کا بچپن ایک ساتھ بسر ہوا۔ درسِ یونانی تینوں نے ایک ساتھ حاصل کیا اور آپس میں تینوں نے ایک معاہدہ کیا تھا کہ جو بھی مستقبل میں بڑے عہدے پر پہنچے اور دولتمند بنے' وہ اپنی دولت میں دونوں دوستوں کو بھی شریک کرے گا۔ چنا چہ نظام الملک طوسی' الپ ارسلان کا وزیرِ سلطنت ہو گیا تو اس نے دونوں دوستوں کو سالانہ وظیفہ مقرّر کر دیا' لیکن حسن بن صباح نے سازش کے ذریعے نظام الملک کو ختم کروایا۔

عمر خیام کی شہرت کی وجہ فنِ ادب و شاعری و تاریخ میں یکتا' ایک زبردست حکیم' یونانی علوم کا فلسفی' علمِ نجوم' علمِ ریاضی و علمِ ہیئت کا ماہر ہونے سے ہے۔ خیام کا مطالعہ کرنے پر مذکورہ علوم و فنون میں اس کی ذہانت و فطانت کو تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ علاوہ ازایں مذہبی معلومات کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ قاضی عبدالرشید سے خیام کی بات چیت چار قل پر حمام میں ہوئی' خیام نے جو تفسیر بیان کی اگر اسے ضبطِ تحریر کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ علمِ نجوم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہِ وقت شکار پر جاتے تو خیام سے پوچھ کر جاتے کہ کہیں راستے میں بارش تو نہیں ہوگی؟ ایک مرتبہ خیام نے کہا کہ آئندہ پانچ دنوں تک بارش نہیں ہوگی'

لیکن راستے میں بارش ہوئی پھر بادل چھٹ گئے اور پانچ دن تک بارش نہ ہوئی۔حافظہ بھی خیام نے غضب کا پایا تھا ۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ خیام نے اصفہان میں ایک کتاب سات مرتبہ پڑھی اور نیشاپور آ کر حرف بہ حرف لکھادی۔خیام میں ایک عادت یہ اچھّی نہیں تھی کہ اسے اپنی زبان پر قابو کبھی نہ رہا۔اس ذیل میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ سلطان سنجر نے جب اپنا علاج اس سے کروایا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ آثار اچھّے نہیں ہیں۔اس کے برتاؤ سے سلطان کبھی خوش نہ رہے۔مگر امرائے سلطنت' خیام سے برابر کا سلوک کرتے تھے اور اسے "قناعت کا شہنشاہ" کہتے تھے۔خیام کے طبیبِ بے مروّت ہونے کے سلسلے میں یہ واقعہ بے محل نہ ہوگا کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ خواب دیکھا تھا کہ اس کے سبھی دانت گر گئے ہیں' اس نے ایک نجومی سے تعبیر پوچھی تو اس نے کہا۔سب مر جائیں گے تمہارے سامنے۔اسی خواب کی تعبیر دوسرے نجومی نے یوں بیان کی تھی کہ خدا نے تمہاری عمر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کی ہے۔خلیفہ نے اسے انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔

ایک عرصے سے خیام سے متعلق یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ اس کی فارسی شاعری چونکہ خمریات سے بھری پڑی ہے' اس لیے وہ ایک عادی شرابی رہا ہوگا۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت وہ نیشاپور میں یونانی فلسفے کا درس دے رہا تھا' تب لوگوں نے اسے بے دین سمجھ کر قتل کرنا چاہا۔اس نے جان بچانے کی خاطر مکّہ شریف کا سفر اختیار کیا اور فریضہء حج بھی ادا کیا۔ویسے بھی یہ ضروری نہیں کہ جو آدمی خمریات کی شاعری کرے وہ شرابی ضرور ہو۔ سید سلیمان ندوی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ

"خیام کے شرابی ہونے کی دلیل کسی صورت وہیئت سے نہیں ملتی' البتہ حکیم ہونے کی سند ضرور ملتی ہے اور خیام کے ماحول میں عالم شراب نہ پیتا تو بولتا ضرور تھا۔" **(خیام اور اس کی سوانح وتصانیف پر ناقدانہ نظر)**

دیدہء بینا سے عاری لوگوں نے شیکسپیئر کے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں اڑائی تھیں کہ اس نے اپنے ڈراموں میں ایک کامیاب وکیل کا رول نہایت انداز سے پیش کیا ہے' اس لیے وہ اپنی زندگی میں وکیل ضرور رہا ہوگا۔کسی نے کہا کہ وہ کسان' سپاہی' یا معلّم رہا ہوگا اور ایک مشہور ایکٹریس نے ان باتوں کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ وہ اس لحاظ سے وہ عورت ضرور رہا ہوگا۔تاریخ کے معلّمِ اوّل علاّمہ شبلی نعمانی کی محققانہ رائے یہ ہے کہ

"ایک دن خیام بوعلی سینا کی کتاب الشّفا کا مطالعہ کر رہا تھا کہ وحدت وکثرت کی بحث آ گئی تو اٹھ کھڑا ہوا۔عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا۔اس کو ورق میں رکھ کر اٹھا' نماز پڑھی۔وصیت کی۔شام تک کچھ نہ کھایا۔نمازِ عشاء پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا۔اے خدا جہاں تک میرے بس میں تھا' میں نے تجھ کو پہچانا۔اس لیے مجھے بخش دے۔یہی کہتے کہتے جان گئی۔" **(مضامینِ شبلی۔شبلی نعمانی)**

خیام کی موت کے علاوہ دفن کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے۔اس نے اپنے ایک شاگرد نظامی عروضی کو بہت پہلے بتایا تھا کہ بعد وصال اس کی قبر ایسی جگہ بنے گی کہ جہاں ہر سال دو بار درخت اس پر پھول برسائیں

گے۔اس نے دیکھا تو واقعی خیام کی قبر امرود اور زرد آلو کے درخت کے نیچے باغ کی دیوار سے متصل تھی۔خیام کو شعر وادب وتاریخ کی خدمت کے صلے میں علاّمہ خراساں' اور علامتہ الزماں کے خطابات بھی ملے۔اس کے علاوہ وہ اپنے دور کا ماہر ہیئت داں' اور قابلِ قدر نجومی بھی کہلایا' اور ایسا حکیم بھی کہلایا' جس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ اس کے برستے بادل بوسیدہ ہڈیوں کو بھی آبِ حیات پلاتے ہیں' لیکن آج اس کا نام صرف فارسی شاعری کی وجہ سے زندہ اور باقی ہے۔خیام ان دنوں انگریزی ادب میں بہت زیادہ زیرِ مطالعہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فارسی شاعری کا فٹز جیرالڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا' مگر کسی نے اس ترجمے کی جانب توجہ نہیں کی۔بعدِ ازآں مشہور نقاد وشاعر جان کیٹس نے فٹز جیرالڈ کے ترجمے پر ایک تنقیدی کتاب لکھی' جس کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ عمر خیام مغربی شعر وتنقید کی دنیا کا اہم نام بن گیا۔

خیام کی جملہ (۱۲) تصانیف میں عربی اور فارسی شعری مجموعوں کے علاوہ جو کتب ہائے علم وفن اس کی یادگار ہیں' ان میں آسمان وستاروں کی حرکات میں "زیچ ملک شاہی" ' گھوڑا تلوار اور قلم کے بارے میں "نوروز نامہ" دنیا اور عبادتوں کے لزوم کے موضوع پر" کون وتکلیف" اور" جبر ومقابلہ" اہم ہیں۔دیگر تحریروں میں مثلث' اور مربع کے ضلعے' موسم اور آب وہوا اور خیام کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ذیل میں خیام کی فارسی رباعیاتِ شاعری کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

: اطاعت کے بدلے بہشت دے گا تو یہ خرید وفروخت کا معاملہ ہوا۔میں سینکڑوں برس جان کر گناہ کروں گا' دیکھنا یہ ہے کہ میرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت زیادہ ہے۔

: دنیا میں اکثر بے وقوفوں کو دولت ملتی ہے۔آسمان والا بے وقوفوں سے محبت کرتا ہے تو میں بھی کچھ زیادہ عقلمند نہیں ہوں۔

: مشہور ہے کہ انسان جیسا کام کرے گا' ویسا ہی قیامت میں اٹھے گا۔میں شراب اس لیے پیتا ہوں اور معشوق کے ساتھ اس لیے رہتا ہوں کہ اسی حالت میں قیامت میں اٹھوں۔

: شرابی کو پیالے سے ذرا سا تعلق ہونے پر وہ اس کو توڑنا نہیں چاہتا' پھر خدا اپنے بندے کو دوزخ میں ڈال کر اس کو خراب کیسے کرے گا۔

: لوگ کہتے ہیں کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔صحیح بولنے پر تلخی ہوتی ہے۔گوارہ کرنا چاہیے۔پس شراب تلخ اور کڑوی ہوتی ہے۔پھر کسی اور نصیحت کی کیا ضرورت؟ ---------------------------

بشنو از نَے چوں حکایت می کند و ز جدائیہا شکایت می کند

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

مبشر احمد میر (گجرات)

برِصغیر میں فارسی ادب کی روایت

''کیا انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا راز اس کی معاشرتی زندگی میں پوشیدہ ہے؟''اِس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے معاشرتی زندگی بسر کرنے والے پرند، چرند، درند اور حشرات الارض کی انواع سے بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں البتہ انسان اور دیگر مخلوقات کی معاشرتی زندگی میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت اکتسابی و ابلاغی ہے۔ انسان جس معاشرے میں رہتا ہے وہ اس سے کچھ وصول کرتا اور کچھ دیتا رہتا ہے۔ لین دین کا یہ عمل صرف مادی نہیں ہوتا بلکہ ذہنی اور علمی بھی ہوا کرتا ہے۔ انسان معاشرے سے سیکھتا بھی ہے اور اپنی استعداد اور رجحان کے مطابق دیتا بھی رہتا ہے۔ اس لین دین اور سیکھنے سکھانے کے نتیجے میں معاشرے کے مجموعی رویے ظاہر ہوتے ہیں۔ معاشرے کے انھی مجموعی رویوں کو عصرِ حاضر کی اصطلاح میں کلچر کہا جاتا ہے۔ انیس ناگی کے مطابق، ''کلچر ایک اسلوبِ زیست ہے جس میں معاشرے کے خواب اور ہوش کی جملہ وارداتیں شامل ہوتی ہیں۔ کلچر ایک معاشرے کی باطنی تنظیم کا مظہر ہوتا ہے جو ایک معاشرتی عمل اور جغرافیائی حدودِ اربعہ اور مذہبی روایات اور رسوم سے اپنے خدوخال مرتب کرتا ہے۔''(۱)

انسان کی انفرادی زندگی کی مانند اجتماعی زندگی میں بھی تغیر و تبدل اور عروج و زوال آتے رہتے ہیں۔ کسی معاشرے کے کلچر کی تشکیل میں اس کے عقائد، روایات اور ماحول اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب کہ کلچر میں تبدیلیاں، تبدیلی عقائد، نقلِ مکانی اور دوسرے معاشروں سے ربط و ضبط کے علاوہ علمی ترقی یا انحطاط کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ عوامل ہمیشہ افراد اور معاشروں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اس لیے ہر معاشرے کے کلچر میں تبدیلی کا عمل ایک جاری و ساری عمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ، ''کلچر اس کا نام نہیں کہ معاشرے میں موجود تمام رسوم و رواج اور عقائد و نظریات اور علوم و فنون کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے، بلکہ اکتساب میں انتخاب کا عمل کلچر ہے۔..........آبا و اجداد سے ورثے میں ملنے والی یا منتقل ہونے والی تمام اقدار کلچر کا حصہ نہیں ہوتیں بلکہ ان اقدار میں سے انتخاب کر کے اقدار کو اپنانا کلچر ہے۔''(۲)

ویسے تو کلچر میں معاشرے کے مجموعی رویوں اور طرزِ عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کا اظہار اس

معاشرے کے رسوم و رواج اور فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔ تاہم کسی معاشرے کے کلچر کو سمجھنے کا سب سے موثر ذریعہ اس معاشرے کے اہلِ قلم کا تخلیق کردہ ادب ہوا کرتا ہے۔ ادب کے مطالعے سے ہی افراد معاشرہ کے اعتقادات، خیالات، روایات اور عادات کا علم ہوتا ہے۔ ادب میں ہی کسی معاشرے میں فرد کی پیدائش سے پہلے سے لے کر اس کی موت کے بعد تک کی رسوم، رویوں اور کیفیات کا مفصل بیان ملتا ہے۔ فیض احمد فیض کے نزدیک، ''ادب کلچر کا سب سے ہمہ گیر، سب سے نمائندہ، سب سے جامع اور سب سے موثر جزو ہے۔ کلچر کے باطنی اور نظریاتی پہلو پر نظر ڈالیے تو مجموعی قدروں، تجربوں اور امنگوں کا تعین، تعریف اور تفسیر سب سے زیادہ ادیب ہی کے نطق و قلم سے ہوتی ہے۔ وہی اس کی پریشان اور پوشیدہ صورتوں کو ترتیب اور اظہار کی صورت بخشتا ہے۔ لاشعور سے شعور، احساس سے ادراک، تصور سے تصویر تک کے منازل اسی کی مساعی سے طے ہوتے ہیں۔''(۳)

برِصغیر کے جن علاقوں پر پاکستان مشتمل ہے ان کا قدیم زمانے سے وسط ایشیا اور ایران سے گہرا تعلق رہا ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے کلچر پر وسط ایشیائی اور ایرانی اثرات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے مابین تفریق دشوار ہے۔ پاکستان کا قدیم شہر ملتان کسی دور میں پارسی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ملتان کی زبان میں اردو یا پنجابی کی نسبت فارسی سے زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی کے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے نتیجے میں پنجاب کا براہ راست وسط ایشیا کی ریاستوں سے تعلق استوار ہو گیا۔ معزالدین محمد ابن سام غوری کے عہدِ حکومت (۱۱۷۴ء۔۱۲۰۶ء) میں شمالی ہند کی فتح کے بعد برِصغیر میں وسط ایشیا اور ایران سے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا جو مغلیہ سلطنت کے زوال تک جاری رہا۔ وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے ان سپاہیوں ہنرمندوں، فن کاروں اور قلم کاروں نے برِصغیر کی معاشرت کو ہر جہت سے متاثر کیا جس کے نتیجے میں ہندی مسلم تہذیب نے جنم لیا۔

❋❋❋

مسلمانوں نے برِصغیر پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس ہزار سالہ دور میں بالعموم فارسی کو سرکار، دربار اور مقتدر طبقات کی زبان کا مقام حاصل رہا۔ غزنوی دورِ حکومت میں لاہور سے تعلق رکھنے والا ابو عبداللہ جو مسعود اول (۱۰۳۰ء۔۱۰۴۰ء) کے دربار سے وابستہ تھا فارسی زبان کا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ غزنوی دور ہی کے معروف شاعر مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ء۔۱۱۲۱ء) کے کلام میں مسلم طبقۂ خواص کے احساسات کی اولین عکاسی ملتی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں صحرائے گوبی سے اٹھنے والے منگولوں کی طوفانی یلغار کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی نے ماوراء النہر اور خراسان کے شرفا کو اپنے آبائی گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ برِصغیر سے روابط

ہونے اور منگولوں کی یلغار سے محفوظ ہونے کے سبب اکثریت نے اسی کا رخ کیا۔ ماوراء النہر کے ان شرفا کی آمد کے نتیجے میں اس دور میں ’’دہلی، صوبائی مراکز اور قلعہ دار شہروں میں فارسی زبان اگرچہ مختلف چشموں سے رواں تھی لیکن بنیادی طور پر ماوراء النہری بول چال، لہجہ سے بہت مشابہ تھی۔‘‘(۴)

سلطنتِ دہلی کے دور سے تعلق رکھنے والے امیر خسرو کی فارسی شاعری میں تاریخی علیت کا نمایاں شعور پایا جاتا ہے۔ جس کا اولین اظہار منگولوں سے لڑتے ہوئے جان قربان کرنے والے شہزادہ محمد بلبن کے مرثیہ میں ملتا ہے۔ جبکہ تاریخی رزمیہ اپنے نقطہ عروج پر عصامی کی ’’فتوح السلاطین‘‘ میں دکھائی دیتا ہے۔ تغلقوں کے دور میں وسط ایشیا سے آنے والوں نے برِصغیر کی فارسی شاعری کو تشکیکی عقلیت اور ابہام نویسی سے روشناس کرایا۔ اس دور میں عبیدؔ کی تشکیک اور بدر چاچؔ کی ابہام گوئی نے برِصغیر کی سیدھی سادی فارسی شاعری کو چیستان اور معمہ بنا دیا۔

مغلیہ دور کے آغاز میں ترکی اور فارسی زبانوں کے مابین دربار میں فوقیت حاصل کرنے کے لیے کشمکش ہوئی۔ مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر ترکی زبان کا شاعر تھا لیکن اس کا وارث نصیر الدین ہمایوں فارسی میں شعر کہتا تھا۔ شیر شاہ سوری سے کشمکش کے نتیجے میں ہمایوں کو ایران میں پناہ لینا پڑی۔ جہاں سے واپسی پر فارسی اہلِ دانش کی کھیپ در کھیپ آمد کے نتیجے میں ترکی زبان کا اثر جلد ہی ختم ہو گیا۔

ایران میں صفوی دورِ حکومت میں فارسی شاعری کے تنزل کا بالواسطہ برِصغیر کے فارسی ادب کو فائدہ پہنچا۔ اسی دور میں نظیریؔ، ظہوریؔ اور عرفیؔ جیسے قادر الکلام شاعر سرزمینِ ایران سے برِصغیر میں وارد ہوئے۔ جہانگیر اور شاہجہان کے درباروں سے وابستہ ملک الشعرا طالبؔ آملی، قدسیؔ مشہدیؔ اور کلیمؔ ہمدانی سب ایران کے رہنے والے تھے۔

جلال الدین اکبر کے مذہبی و سیاسی تجربات نے برِصغیر میں فارسی شعر و ادب کو ایک حد تک متاثر کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں کی شاعری میں مقامی اثرات ملتے ہیں۔ ملا شیریؔ نے اکبر کی بدعت کی پوشیدہ ہجو لکھی۔ ملک الشعرا فیضیؔ کے ہاں تشکیک اور ذہنی کشمکش کا اظہار انیسویں صدی آتے آتے اسد اللہ خاں غالبؔ کی شاعری میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

برِصغیر کی فارسی شاعری نے مسلم اشرافیہ کی اقدار کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے انحطاط کی عکاسی بھی کی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سیاست کے میدان میں بھی انحطاط کا عمل تیز ہو گیا لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ عمل پہلے سے جاری تھا۔ جس کی عکاسی ظہوریؔ کے ’’ساقی نامہ‘‘ میں کی گئی ہے۔ غنیمتؔ کنجاہی کی مثنوی ’’نیرنگِ عشق‘‘ معاشرے میں پائی جانے والی ہوس رانی کا احوال بیان کرتی ہے۔

شاعری کے علاوہ نثری ادب میں ابوالفضل، ملا بدایونی اور فرشتہ نے بیش بہا اضافے کیے۔ انشا یعنی سرکاری خط و کتابت اول اول تو ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے اہلِ قلم کے ہاتھ تھی جن کا معیار کسی اعتبار سے

ایران کے صفوی دربار سے کم نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ انشا پردازی کا شعبہ ہندو کائستھوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ کائستھوں کی فارسی انشا پردازی کا آغاز ہرکرن سے ہوا۔ جس نے چندر بھان سے ہوتے ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ’’انشائے مادھو رام‘‘ کی صورت میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیا۔(۵)

❁❁❁

برِصغیر کی فارسی شاعری ابتداً وسط ایشیائی اسلوب میں کہی گئی تاہم بتدریج اس میں عقلیت اور ذہنی بازی گری کے عناصر شامل ہوتے چلے گئے۔ اس کا بنیادی سبب منگولوں کا خوف، ازبکوں کے ہرات و سمرقند پر قابض ہونے کے علاوہ ازبکوں اور صفویوں کی چپقلش کے نتیجے میں پھیلنے والی ابتری کے باعث ترکِ وطن کر کے جنوبی ایشیا میں آباد ہونے والی اشرافیہ کا رویہ تھا جنھوں نے ذہنی طور پر برِصغیر کی تہذیب اور ماحول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے شاعری کو عزیز احمد کے الفاظ میں ’’جذباتی ذہنی ریاضی کے طور پر لکھنا شروع کیا جس میں تمثالی پیکروں کو اعداد کی طرح جمع تفریق اور ضرب کے عمل سے گزارا جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے اعشاریات میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔‘‘(۶)

برِصغیر کے فارسی اسلوب کی نمایاں خصوصیات تصنع اور دماغی کاوش ہیں۔ اس اسلوب کو سبکِ ہندی کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اس کا خالق عبدالباقی خاں، فغانیؔ شیرازی (وفات ۱۵۱۹ء) کو سمجھا جاتا ہے۔ اس اسلوب کے ابتدائی آثار امیر خسرو کی شاعری میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم شاعری میں ان کی ذہنی کاوش تجربے کی حد تک محدود تھی۔ برِصغیر کی فارسی شاعری کو دماغی اور ذہنی ورزش بنانے میں لودھیوں کے عہد میں داخلِ نصاب شاعر بدر چاچؔ کا کلام خاص رکھ رکھاؤ کا حامل تھا۔ فغانیؔ کی وفات ۱۵۱۹ء میں ہوئی۔ اس صدی کے اختتام تک برِصغیر میں روایتی ہندوستانی شاعری اور فغانیؔ کا انداز کسی حد تک ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ فیضیؔ اور عرفیؔ کے ہاں یہ دونوں اسلوب علی الترتیب الگ الگ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ دونوں میں انضمام کا عمل بھی جاری تھا۔ حکیم ابوالفتح گیلانی نے فارسی شاعری پر دانشورانہ رنگ چڑھا کر اسے ایک مشکل فن بنا دیا۔

انضمام کا یہ عمل سترہویں صدی میں ’’سبک ہندی‘‘ کی صورت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ جس کی نمایاں خصوصیت متوازی بیانی ہے۔ متوازی بیانی کا کچھ حصہ تصویر اور کچھ حصہ موضوعِ تصویر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دعویٰ کر کے اس پر شاعرانہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔ یہ طریق غنیؔ، صائبؔ اور کلیمؔ کے ہاں ملتا ہے۔ سبک ہندی میں ایسے دور از کار تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا جاتا ہے کہ سامع کا ذہن آسانی سے اس طرف منتقل نہ ہو۔ ’’سبک ہندی‘‘ کی جڑیں برِصغیر کی مسلم اشرافیہ کے احساسِ تفاخر اور انفرادیت پسندی کے علاوہ گرد و پیش کے ماحول سے ذہنی عدم مطابقت کے نتیجے میں بال کی کھال نکالنے کی بھول بھلیوں میں گرفتار رہنے میں پوشیدہ ہیں۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ (وفات ۱۷۲۱ء) کے ہاں یہ اسلوب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ ’’اس کے باوجود

ان کی داخلی تشخیص کی شدت جو اتنی حقیقی اور تیز ہے اور ان کے مابعدالطبعیاتی تجربے اتنے شدید ہیں کہ صنائع و بدائع کی چہار دیواریوں کے باوجود حقیقی شاعری پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔''(۷) انیسویں صدی کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے ذہن پر مرزا بیدل کے اسلوب کا گہرا اثر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے بیدل کے اسلوبی عجائبات سے اجتناب کرتے ہوئے عرفیؔ و فیضیؔ کی طرف رجوع کرتے ہوئے بالآخر خود کو پالیا۔ آگے چل کر بیسویں صدی میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؔ نے طرزِ بیدل کی بجائے فکرِ بیدل سے کچھ رہنما اصول اخذ کرتے ہوئے اپنا پیغام برِصغیر کی حدود سے آگے مسلمانانِ عالم تک پہنچانے کے لیے فارسی شاعری کا انتخاب کیا۔

❋❋❋

اگرچہ علامہ محمد اقبالؔ کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنے نظریات کا ابلاغ تھا لیکن ان کے اسلوب نے برِصغیر کی فارسی شاعری کو نئی رفعتیں عطا کیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے محمد اسلم جیراجپوری نے تحریر کیا، ''ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی، مثنوی مولانا رومؔ، گلستانِ سعدیؔ اور دیوانِ حافظؔ۔ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں کتاب سمجھنی چاہیے جو کہ معنویت اور نافعت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔''(۸)

عزیز احمد کے مطابق علامہ محمد اقبالؔ نے مسلمانانِ عالم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے فارسی زبان کا انتخاب کیا جب کہ خود علامہ محمد اقبالؔ نے 'اسرارِ خودی'' میں شاعری کے لیے فارسی کے انتخاب کا سبب بیان کرتے ہوئے بتایا، ''اگرچہ اردو زبان کی مٹھاس میں کوئی شبہ نہیں مگر فارسی میں جو رسیلا پن ہے اردو اس سے محروم ہے۔'' (۹)

پیامِ مشرق کا ترجمہ کرتے ہوئے فیض احمد فیضؔ نے فارسی زبان کے اس رسیلے پن کا راز منکشف کرتے ہوئے لکھا، ''اردو اور فارسی میں قربت کے باوجود اظہار و آہنگ کے پیرائے کافی مختلف ہیں۔ فارسی زبان کو تراکیب اور مشتقات کی وجہ سے اجمال و اختصار کی جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اردو میں موجود نہیں۔''(۱۰)

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تقریباً ایک ہزار سال تک فارسی برِصغیر کی سرکاری، ثقافتی اور ادبی زبان رہی مزید برآں فارسی وسیع تاریخی و ادبی پس منظر کی وجہ سے احساسِ برتری کی غماز بھی تھی۔ چنانچہ دورِ انحطاط کے مسلمان شعرا بالخصوص مرزا اسداللہ خان غالبؔ اور علامہ محمد اقبالؔ اردو پر قدرت رکھنے کے باجود اگر فارسی میں اظہار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تو فارسی کی دیگر خوبیوں کے علاوہ اس کے جذباتی، نفسیاتی اور ثقافتی اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔

علامہ محمد اقبالؔ نے اپنے آفاقی نظریے اور شاندار اسلوب کی بنا پر فارسی شعر و ادب میں اعلیٰ ترین

مقام تو حاصل کر لیا لیکن فارسی ادب کی انحطاط پذیر روایت کو مٹنے سے نہ بچا سکے۔ اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا سکتا کہ علامہ محمد اقبال کے خوابوں کی تعبیر یعنی پاکستان میں جنم لینے والی نسل میں ان کے فارسی کلام کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کا اندازہ تعلیمی درسگاہوں کے شعبہ فارسی میں داخلہ لینے والے طالب علموں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔

برِصغیر میں فارسی شعر و ادب کی روایت کو سمجھنے کے لیے اس کی تاریخ پر ایک مرتبہ پھر سے نظر ڈالنا ہو گی۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے عددی اقلیت میں ہونے کے باوجود تقریباً ایک ہزار سال برِصغیر پر شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس اقتدار و اختیار کے نتیجے میں ''وہ ہمیشہ خود کو ہندوستانی آبادی کا اعلیٰ و ارفع طبقہ تصور کرتے تھے اور یہ کہ وہ ملک پر ان خصوصی اوصاف کی بنا پر حکومت کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے خاص فضل و کرم سے عنایت فرمائے تھے۔''(۱۱)

ابتدائی دور کے اکثر شعرا کا تعلق ان علاقوں سے تھا جہاں فارسی زبان نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ اکثر شعرا کی مادری زبان فارسی ہی تھی۔ چنانچہ وہ فارسی زبان میں طبع آزمائی کو ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ چند شعرا نے مقامی زبانوں میں طبع آزمائی بھی کی جن میں امیر خسرو اور دورِ اکبری کے عبدالرحیم خانخاں کے نام بھی شامل ہیں تاہم شاہی دربار میں فارسی گو شعرا کا غلبہ ہونے کے نتیجے میں یہ عمومی رویہ نہ بن پایا۔ اسی طرح درمیان میں ایک دور ایسا بھی آیا جب ترکی زبان و ادب نے اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن ہمایوں کی ایران سے واپسی اور نور جہاں کے زیرِ اثر فارسی زبان و تہذیب کو مغل دربار میں فیصلہ کن غلبہ حاصل ہو گیا۔

وسط ایشیا اور فارس سے آنے والے شعرا کا احساسِ تفاخر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ برِصغیر کی ہر چیز کو حقیر گردانتے ہوئے انہیں اپنی تخلیقات میں بار دینے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ برِصغیر میں تخلیق ہونے والی شاعری میں بھی مقامی موسموں یا مقامی تہواروں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ فارسی شاعری کے زیرِ اثر اردو شاعری کی اصناف اور موضوعات پر بھی وسط ایشیائی اور ایرانی معاشرت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

شاعری میں استعمال ہونے والی تشبیہات استعارات اور تراکیب وسط ایشیا اور ایران سے برآمد کی جاتی تھیں۔ یہ عجیب حقیقت ہے کہ برِصغیر میں تخلیق ہونے والی شاعری میں بالعموم مقامی رنگ اور بو باس مفقود تھی۔ وسط ایشیا اور ایران سے ترکِ وطن کر کے برِعظیم پاک و ہند میں آنے والے فارسی شاعروں نے یہاں کے دلفریب نظاروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے سابقہ وطن کے خیالوں میں کھوئے رہے۔ ان کے زیرِ اثر مقامی شاعروں نے بھی ایسی زندگی اور مناظر کو موضوعِ سخن بنایا جن کے متعلق انہیں کوئی ذاتی علم و تجربہ نہیں تھا۔ اس طرح برِصغیر میں کہی جانے والی فارسی شاعری کی جڑیں دھرتی میں پیوست نہیں تھیں۔ تاہم متقدمین میں امیر خسرو اور بعد ازاں جلال الدین اکبر کے دور کی فارسی شاعری میں مقامیت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن

ایرانی امرا کے بڑھتے ہوئے رسوخ کے نتیجہ میں یہ رجحان خود بخود ختم ہو گیا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ برِصغیر کے فارسی گو شعرا کے ہاں معاشرتی شعور سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ خالصتاً برِصغیر سے تعلق رکھنے والی صنفِ سخن شہر آشوب جو یہاں کے مخصوص حالات میں لکھی گئی ان کے سماجی شعور کی تصدیق کرتی ہے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں تحریر کیے گئے شخصی مرثیوں اور جنگ ناموں میں اس دور کے حالات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ فرخ سیر کے دور میں تو جعفر زٹلی کو اپنی ایک ہجو میں ملکی انتظام و انصرام میں پائی جانی والی بد نظمی کی نشاندہی پر ۱۷۱۳ء میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

فارسی روایت کے زیرِ اثر برِصغیر میں کہی جانے والی شاعری کے اہم موضوعات تصوف اور وحدت الوجود کے نظریات رہے ہیں۔ اگرچہ سولھویں اور سترھویں صدی میں عرفیؔ اور کلیم جیسے اہلِ تشیع شعرا کے زیرِ اثر صوفیانہ شاعری کی جانب توجہ کم ہوئی لیکن دارا شکوہ اور بیدل نے برِصغیر کی فارسی شاعری میں تصوف کو از سرِ نو بحال کر دیا۔

❁❁❁

برِصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی ادب ہمیشہ داخلِ نصاب رہا ہے۔ اس نصاب میں نظم و نثر دونوں شامل تھے۔ اسی نصاب کے نتیجے میں ایران و ترکی سے تعلق رکھنے والے فارسی اہل قلم آج بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ شیخ سعدی شیرازی کی گلستان و بوستان، دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم کے ناموں سے ہر پڑھا لکھا شخص آگاہ ہے۔ گلستان و بوستان کا موضوع اخلاقیات ہے۔ دیوان حافظ، کو تصوف کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے جبکہ مثنوی مولانا روم کو ''ہست قران در زبانِ پہلوی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دیوان حافظ نے برِصغیر میں تصوف پھیلانے میں اہم کردار کیا۔ خوش عقیدہ لوگ مہمات و مشکلات کے مواقع پر دیوانِ حافظ سے فال نکالا کرتے تھے۔ حافظ سے ان کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ علامہ محمد اقبال نے تصوف کے منفی پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے حافظ کے نظریات کو ''مسلک گوسفندی'' قرار دیا تو انھیں مذہبی حلقوں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح مولانا روم کے افکار سے بھی مسلمانانِ برِصغیر بہت متاثر تھے۔ علامہ محمد اقبال بھی مولانا روم کے افکار و نظریات سے بہت متاثر ہیں اور انہیں اپنا مرشد قرار دیتے ہیں۔ اکثر شارحینِ اقبال کے نزدیک ان کا نظریہ خودی براہ راست مولانا روم کے افکار سے اخذ کیا گیا ہے۔

برِصغیر کی زبانوں بالخصوص اردو کی اصنافِ نظم و نثر پر فارسی اصناف کے گہرے اثرات ہیں۔ اردو کی اصناف قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی اور داستان سب فارسی کی معرفت اردو ادب کا حصہ بنیں۔ اگرچہ بیسویں صدی میں غزل کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس کے باوجود اس کے موضوعات میں بہت وسعت آئی اور آج بھی اسے اردو ادب کی شناخت سمجھا جاتا ہے۔ یہ فارسی ادب کی معرفت ہی اردو ادب کا حصہ بنی ہے۔ سرائیکی اور سندھی کی کافی کو

بھی ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے غزل کہا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح پنجاب و سندھ کی تمام تر صوفیانہ شاعری فارسی شاعری کی مقروض ہے۔

ان تمام اثرات کا اہم سبب فارسی شعر و ادب کی شاندار روایت کے علاوہ سرکار دربار تک اس کی رسائی کے باعث اہلِ قلم کی مرعوبیت بھی ہو سکتی ہے۔ ۱۸۵۷ء تک اردو کی تمام تر اصناف سخن ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے فارسی کی مثنی تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے انحطاط اور سلطنت میں طوائف الملو کی پھیلنے کے نتیجے میں فارسی کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا۔ مزید براں وسط ایشیا اور ایران سے اہلِ علم کی آمد کا سلسلہ ختم ہونے کے نتیجے میں اردو کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ ولی دکنی کے اردو کلام سے شمالی ہندوستان کے اہلِ ادب کو اردو کی تخلیقی قوت کا احساس تو ہوا لیکن وہ فارسی سے اتنے مرعوب تھے کہ انیسویں صدی کے وسط تک اردو شعرا کے تذکرے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

فارسی کے مقابل پر اردو کو بڑھاوا دینے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اہم کردار ادا کیا، جس نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اردو اور ہندی کی سرپرستی کرتے ہوئے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ ان کی اس پالیسی سے جہاں اردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچا وہیں ہندی کے سنسکرت کی جانب جھکاؤ سے مقابلے کے باعث ارادی یا غیر اردی طور پر فارسی کا تمام تر ورثہ اردو نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے اردو کا شمار ایسی زبانوں میں ہونے لگا جس میں ہر نوعیت کا اعلیٰ ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس امر کا احساس اسداللہ خان غالبؔ اور علامہ محمد اقبالؔ کو بھی تھا لیکن فارسی ادب کی شاندار روایت کی موجودگی میں انہیں اس کا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو غالبؔ کا اردو کلام فارسی کلام سے کم درجے کا نہیں۔ اسی طرح بال جبریل میں شامل اقبالؔ کا کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلے میں کسی پہلو سے کم نہیں۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے حصول کے بعد نفسیاتی اعتبار سے ہندی سے مسابقت کی دوڑ ختم ہونے، خود مختاری کے احساس اور بدلے ہوئے عالمی تناظر میں فارسی زبان کی وہ اہمیت باقی نہ رہی۔ ایران سے قریبی اور بردرانہ تعلقات کے باوجود پاکستان کا اس سے وہ تعلق نہ رہا جو عہدِ مغلیہ میں تھا۔ ویسے بھی انیس ناگی کے مطابق، ''فارسی زبان سے ہمارا تعلق کچھ مبہم سا ہوتا جا رہا ہے۔ لسانی سطح پر ابھی تک ہمارا تعلق کلاسیکی فارسی سے رہا ہے اور عمداً کلاسیکی فارسی کے لہجوں کو اپنایا ہے۔ اردو زبان نے جو کچھ فارسی سے حاصل ہے، وہ کلاسیکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اہلِ ایران سے ہمارا رابطہ ختم ہو چکا تھا اور اودو زبان نے اپنے تشکیلی مراحل میں انگریزی کی طرف رجوع کیا تھا۔''(۱۲)

مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو آج جس مقام پر کھڑی ہے اس نے اس مقام پر پہنچنے کے لیے فارسی زبان و ادب سے بہت کچھ لیا ہے لیکن جس طرح انگریزی زبان لاطینی زبان و ادب کی روایت کا تسلسل ہونے کے

باوجود اس سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔اسی طرح فارسی ادبی روایت کا تسلسل ہونے کے باوجود اردو زبان فارسی کے تابع نہیں بلکہ اس کی ہیت ایک خودمختار زبان کی ہے جسے دنیا کی زبانوں میں اعلیٰ مقام دلانے کے لیے ہمیں ہر جہت میں ترقی کرنا ہوگی۔صرف اعلیٰ ادب تخلیق کر کے اپنوں کی محفل میں ڈینگیں تو ماری جا سکتی ہیں لیکن اہل دنیا سے اردو ادب کی عظمت تسلیم کرانے کے لیے دورِ جاہلیت کے شعرا کی مانند سیاسی غلبے کا انتظار کرنا ہوگا۔

❁❁❁

حوالہ جات و حواشی

۱۔انیس ناگی،''تصورات''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء،ص ۲۶

۲۔ایم۔خالد فیاض، پوراکلچر،مشمولہ کتابی سلسلہ''سطور نمبر۳''،بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۱ء،ص ۴۵

۳۔فیض احمد فیض،''پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء،ص ۸۶

۴۔امیر خسرو کی کلیات میں غرۃ الکمال کا دیباچہ بحوالہ عزیز احمد''برصغیر میں اسلامی کلچر''، مترجم جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔۱۹۹۰ء،ص ۳۴۳

۵۔جنوبی ایشیا میں فارسی شاعری کے ارتقا کا موادعزیز احمد کی تصنیف''برصغیر میں اسلامی کلچر''، مترجمہ جمیل جالبی کے دسویں باب''قرونِ وسطیٰ کا ادب'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

۶۔عزیز احمد،''برصغیر میں اسلامی کلچر''، مترجم جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۳۴۸

۷۔عزیز احمد،''برصغیر میں اسلامی کلچر''، مترجم جمیل جالبی،ص ۳۵۱

۸۔محمد اسلم جیراجپوری، جاوید نامہ، مشمولہ نیرنگِ خیال اقبال نمبر، بحوالہ''نقوش اقبال نمبر''، لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء،ص ۱۱۶

۹۔عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص و

۱۰۔فیض احمد فیض،''پیام مشرق......اردو ترجمہ''، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء،ص ۵

۱۱۔رالف رسل،''اردو ادب کی جستجو''، مترجم محمد سرور رجا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲

۱۲۔انیس ناگی،''تصورات''،ص ۴۵

❁❁❁

محمد اسلم رسولپوری (جام پور)

میزانِ شناسائی

انسانی اقدار کی شاعری

میں جناب صادق باجوہ کو کبھی نہیں ملا۔لیکن ان کی شاعری کو ایک نظر دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے، کہ یہ ایک شریف النفس اور انسانی اقدار کے حامل شخص کی شاعری ہے۔جو ماضی کے شاندار روایات کی نہ صرف پاسداری کرتی ہے۔بلکہ نظریاتی طور پر اس کا پرچار بھی کرتی ہے۔لیکن باجوہ صاحب اپنے نظریات کے اظہار میں کہیں بھی سطحی پروپیگنڈہ کا شکار نہیں ہوتے۔وہ ہر سطح پر شاعری کو شاعری ہی رہنے دیتے ہیں۔اور اپنے تمام خیالات کو بھرپور تخلیقی انداز میں برتتے ہیں۔

ان کی نظریاتی فکر میں انسانی توقیر کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔وہ انسانی عظمت کی بحالی کے خواہشمند ہیں۔اور انسان کے انسان پر ظلم پر کڑھتے ہیں۔اور انسان کی انا پرستی پر خود کو دکھی محسوس کرتے ہیں۔اور اس طرح کی انسانی کمزوریوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔اور ایسی کمزوریوں کو اعلا انسانی اقدار میں بدلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

باجوہ صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔تاہم ان کے مجموعہ کلام میزان شناسائی میں انانیت کے نام سے ایک نظم شامل ہے۔اور پانچ کے قریب قطعے یار باعیاں بھی موجود ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔انسانی توقیر باجوہ صاحب کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔

خدمت انساں کی کچھ تدبیر بھی　　کاش ہو اس خواب کی تعبیر بھی
حرمت توقیر انساں کر عزیز　　چھوڑ دے یہ نفرت و تحقیر بھی

وہ اپنی اس اچھی خواہش کے ساتھ اس بات کا دکھ بھی محسوس کرتے ہیں۔کہ آج دنیا میں اس احسن التقویم کی کوئی قدر نہیں رہی۔

قدر سگ کی تو ہے مگر انساں　　پس دیوار و در پیاسا ہی رہا

اور اس کی وجہ باجوہ صاحب کے ہاں یہ ہو سکتی ہے۔کہ وہ اپنی عظمت کو خود بھول گیا۔

اپنی پہچان بھول کر صادق　　دربدر خاک چھانتا ہی رہا

اور شاید اس کی انا پرستی اسے اس منزل پر پہنچا رہی ہو۔

میری انا ہی میرے راستے کا پتھر ہے   اس کے دام فسوں ساز میں پھنسا ہوں میں

حصار ذات میں محصور کر دیا اس نے   خود اپنے آپ سے دور کر دیا اس نے

جو انا کے اسیر ہوتے ہیں   ان کی محور تو ذات ہوتی ہے

خود اپنی ذات کے گرداب میں پھنسا ہے بشر   نصیب فرصت پرواز شش جہات نہیں

اور یہی انا پرست لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

دستور اس جہاں کا نرالا ہے دوستو   دیکھا غریب کو تو نشانہ بنالیا

ظلم کا خوگر نئے بہروپ میں   دندناتا پھر رہا ہے بے خبر

جب بھی کم ظرف کو ملا رتبہ   اس نے کیا کیا نہ پھر خدائی کی

اور شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے۔کہ انسانوں میں ایک دوسرے کا احساس ختم ہو گیا ہے۔اور اس احساس کے ختم ہونے سے محبت کے تمام بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

دنیا میں رشتے بندھن احساس سے قائم ہیں صادق

جب یہ مالا ٹوٹ گئی پھر ہر رشتہ کملایا ہے

مگر اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتے۔بلکہ اس ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔

جبر کے سامنے بھی سینہ سپر ہو ہو کر   اپنے اسلاف کے ورثے کو بچا رکھا ہے

اور اپنی اس جدوجہد کے نتیجے آس کی لو کو بھی سنبھالے رکھتے ہیں۔

چراغ آس کی لو کچھ تو ٹمٹمانے دے   ہجوم یاس گریبان تار تار نہ کر

نوید صبح مسرت کے منتظر ہیں صادق   چراغ آس سر شام ہیں جلائے ہوئے

پھر سلاسل کی صدا اٹھی جنوں کی خیر ہو   پھر نوید فصل گل باد صبا لائی تو ہے

اور اس طرح وہ اپنی اس تمنا پر قائم رہتے ہیں جو میزان شناسائی کا آغاز بھی ہے۔

بانٹیں دکھ پائیں سکوں امن واماں ہو ہر سو   عرصۂ دہر ہو میزان شناسائی کا

باجوہ صاحب کا انسانی تجربہ اور مشاہدہ بھی بڑا گہرا ہے۔حقیقتاً وہ انسانی فطرت سے مکمل طور پر آشنا ہیں۔

انسانی مسرت بڑی محدود ہوتی ہے۔مہاتما بدھ نے کہا تھا یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔باجوہ صاحب کا تجربہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ہندی زبان پر قدرت کے اظہار کے ساتھ وہ اپنے اس تجربے اور مشاہدے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

دکھیارے من کی بات نہ کر دکھیارا کون نہیں جگ میں   کچھ سندر سپنوں کے پیچھے دکھ درد بسیرا کرتے ہیں

غم دو جہاں کو صادق کہاں بانٹنے چلے ہو   یہ جہاں ہے پر دکھوں سے رہا دل غموں کا مارا

چند لمحات مسرت غنیمت ہیں صادق   ساعت سعد تو محدود ہوا کرتی ہے

انسانی فطرت کا تجزیہ ان کی شاعری میں ہمہ پہلو ہے۔اور اس کا مختلف اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔عام انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔کہ اس کا عشق اور شوق منزل کی تلاش میں جگہ جگہ اپنا ٹھکانہ بنالیتا ہے۔جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا   واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

باجوہ صاحب اس کو اپنے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

کیا انتہائے شوق تھی دیدار کے لئے   ہر راہگزر کو اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

بوعلی سینا کا قول ہے۔جو انتقام کی سوچتا رہتا ہے وہ اپنے زخم ہرے رکھتا ہے۔ہمارا شاعر اس تجربے کو یوں بیان کرتا ہے۔

لمحہ لمحہ سکوں نہیں ہوتا   جب عداوت کی بات ہوتی ہے

انسان جفائیں یاد رکھتا ہے مگر وفائیں بھول جاتا ہے۔باجوہ صاحب کا شعر ملاحظہ ہو۔

جانے دستور زمانے کا ہے کیسا صادق   یاد آتی ہے جفا خوئے وفا جاتی ہے

اے۔کے بروہی نے لکھا ہے۔کہ دولت مند آدمی بد قسمت ہوتے ہیں۔وہ انسانی بصیرت کو کبھی نہیں پا سکتے۔باجوہ صاحب کے ہاں اس کا اظہار اپنے طور پر اس طرح ملتا ہے۔

راز حیات و مرگ سے کب آشنا ہوئے   نشہ تھا اقتدار کا ایسے خدا ہوئے

اپنی قلبی واردات تو ہر شخص جانتا ہے مگر محبوب کی قلبی واردات سمجھنا مشکل بات ہے۔کیونکہ محبوب اسے چھپانے اور عاشق کو فریب دینے کا ماہر ہوتا ہے۔مگر باجوہ صاحب محبوب کے دکھوں کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔

بے چینیاں سمٹ کے نگاہوں میں آ گئیں   منظر کسی کی آنکھ کا کتنا اداس تھا

کوئی کہے نہ کہے کچھ سبب تو ہے ورنہ   وہی نظر جو قیامت تھی سوگوار ہے کیوں

اور محبوب کے دکھوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود وہ اس کے خود ساختہ بہانوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔

قول و قرار رسم وفا کچھ نہ کر سکے   ہر بار اس نے بہانہ بنالیا

شاید اس بات سے انکار نہیں کیا جاتا کہ شاعر کے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے اس کی شاعری کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں۔باجوہ صاحب کے بعض اشعار ایسے لگتا ہے ان کے ذاتی تجربوں کا حصہ ہیں۔

داغ حسرت سے ملی تسکین جاں   حسرتوں سے لوگ کچھ جلتے رہے

جن کو دعوی تھا رہیں گے ساتھ ساتھ   وقت رخصت ہاتھ ہی ملتے رہے

دیکھنا صادق مآل دوستاں   نار بغض و کیں میں جلتے رہے

یہاں ایسے لوگوں کے لئے شاعر کا دکھ پھر بھی شامل رہتا ہے۔ جو عام طور پر وہ دوسروں کے لئے محسوس کرتے ہیں۔

اپنے دردوغم تو باہم بانٹ لیا کرتے ہیں لوگ   ہم کو دشمن کے دکھ درد نے بھی اکثر تڑپایا ہے

فکری اور انسانی تجربے کے اظہار کے لئے باجوہ صاحب نے شاعرانہ فن کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ ان کی شاعری بھرپور تخلیقی رویوں کے ساتھ فنی حسن سے بھی مالا مال ہے۔ جگہ جگہ آپ کو رواں اور کلاسیکی بحریں ملیں گی

کتنی دلکش حیات ہوتی ہے   جب کہیں دل کی بات ہوتی ہے

غم کی تاریکیوں میں روشن تر   ان کے وعدے کی رات ہوتی ہے

اس کے علاوہ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے بھی ظاہر ہے وہ اکثر اوقات چھوٹی بحریں استعمال کرتے ہیں۔

پھر سے تجدید آرزو کرلیں   آیئے کچھ تو گفتگو کرلیں

زندگی کے حسین دوراہے پر   کچھ تمنائے رنگ و بو کرلیں

وہ اپنے اس قدرت فن کا اظہار جگہ جگہ مختلف انداز میں کرتے ہیں۔ لفظوں کی تکرار عام طور پر طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ لیکن باجوہ صاحب کے ہاں وہ شعر میں ایک نیا لطف پیدا کرتی ہے۔

اک قیامت کا شور تھا پہلے   پھر دل کچھ ڈرا ڈرا سا رہا

جہاں پالیا تو کچھ بھی نہیں   وہ اگر کچھ خفا خفا سا رہا

سن کے روداد غم زمانے کی   جانے دل کیوں بجھا بجھا سا رہا

میزان شناسائی میں کتنے موضوعات ہیں جو لکھنے کا تقاضا کرتے ہیں مگر وہ کسی اگلی نشست کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

میزانِ شناسائی

''تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب خوبصورت غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے اور ایک ایسے شاعر کا ہے جسے اپنا شاعر ہونا یاد ہی نہ تھا۔ کبھی کبھار غزلیں کہہ کر وہ گھڑے میں ڈال دیا کرتے تھے۔ اب دوستوں کے اصرار پر اسے ''میزانِ شناسائی'' کے نام سے دلی سے چھپوا کر اپنے اور ناصر صاحب کے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کیا ہے۔ ''میزانِ شناسائی'' سادہ و معصوم جذبات کی معصوم سی غیر رسمی آبجو ہے۔ شاعر نے لفظوں کے موتی محبت کی لڑی میں پرو کر پیش کیے ہیں اور میرے دل میں اپنے استاد کی محبت کے پھول ایک بار پھر مہکا دیئے ہیں۔''

(نوٹ: استاد سے مراد پروفیسر ناصر احمد مرحوم ہیں، جن کے نام میزانِ شناسائی کا انتساب کیا گیا ہے۔ ح۔ق)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالم ''دل پشوری'' **اچھے انسان مرا نہیں کرتے** سے اقتباس

مطبوعہ روزنامہ **آج** پشاور۔ مورخہ ۵ اگست ۲۰۰۸ء

محمد خالد انجم عثمانی (دہلی)

انیسویں صدی کے نثری اسالیب

انیسویں صدی ہندوستان میں تاریخی، سیاسی، تہذیبی و سماجی تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ اس صدی میں مغل حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور باقاعدہ انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس میں مشرقی تہذیب و ثقافت کو صدمہ پہنچا اور مغربی علوم کی آمد کے ساتھ فکر و خیال کی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس عہد کی سیاسی صورت حال کی ابتری کی تصویر کشی یوں بھی کی گئی ہے

سلطنت شاہ عالم   از دہلی تا پالم

لیکن انیسویں صدی کے ہندوستان میں صرف تاریخی سماجی و معاشی تبدیلیاں ہی نہیں ہوئیں بلکہ افکار و خیالات کے دھارے بھی تبدیل ہوئے۔ جدید علوم کی آمد نے ہندوستانی عوام کے لیے نیا راستہ ہموار کیا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ ہر تخریب کے پیچھے تعمیر کا عمل پوشیدہ ہوتا ہے۔ جس کی مثال بذات خود دہلی بھی ہے جو کئی مرتبہ برباد ہوکر پھر سے آباد ہوئی۔ بغداد کی بھی تاریخ ایسا ہی کہ جب ہلاکو خاں نے اس پر قبضہ کیا پھر اس نے وہاں کے عوام کو قتل کر کے سروں کے پہاڑ بنا دیئے اور ہل چلا کر پھر سے آباد کیا اور علم و دانش کا مرکز بنا دیا۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی تین سو سال پرانی مغلیہ تہذیب و تمدن پارہ پارہ ہوگیا۔ مگر جدید علوم و فنون نے لوگوں کے لیے غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔ زندگی کے اقدار بدلیں تو ادب پر بھی اس کے اثرات رونما ہوئے۔ چوں کہ دہلی کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ حملہ آوروں کی آماجگاہ بھی رہی ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں اور افکار و خیالات کی آمد نے دلی کی زبان کو نئے موضوعات و اسالیب دیئے۔ اس نے دہلی کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حیثیت کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ علمی، ادبی اعتبار سے بھی ان تغیرات کے اثرات رونما ہوئے۔ انیسویں صدی کے تقریباً نصف تک گرچہ فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن عوام میں مقبولیت و محبوبیت اردو کو ہی حاصل تھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج تک ادبی فن پارے حکمراں طبقوں کے زیر اثر لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس بدلے ہوئے ماحول کو عملی جامہ پہنانے کی شروعات سب سے پہلے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج سے ہوئی۔ جس کا مقصد ہندوستان میں انگریزوں کا ایسا گروہ قائم کرنا تھا جو ہندوستانی زبان سے پوری طرح واقف ہوتا کہ ان کو یہاں حکومت کرنے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنی پڑے۔ اس کے لیے سہل زبان کی

ضرورت تھی۔ لہٰذا کالج کے ادیبوں کو یہ بات باور کرادی گئی کہ ترجمے میں عام بول چال کی زبان استعمال کریں، محاورے واستعارے بے جا بے محل نہ ہوں۔اس اصول کو سب سے پہلے میر امن نے ''باغ و بہار'' میں برتا۔جس کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے وہ سب باتیں ادا کرالیے گئے ہیں جو عام قاری کو بھی مسحور کر لینے کی قوت رکھتے ہیں۔اور میر امن گفتگو چین کی کریں یا روم کی مگر پورا معاشرہ دہلی کا معلوم ہوتا ہے۔وہ یوسف سوداگر کو مدعو کرتے وقت لکھتے ہیں:

''تمام حویلی میں فرش کیا مکلّف لایق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پان دان، گلاب پاش، عطر دان، پیک دان، نرگس دان، قرینے سے دھرے ہیں۔طاقوں میں رنگترے، کنوے، نارنگیاں اور گلاب دان رنگ برنگ کے چنے ہیں، ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی مٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھار اور سرو کنول کے روشن ہیں۔۔۔سب آدمی اپنے عہدے پر مستعد ہیں''۔[1]

''باغ و بہار'' میں میر امن نے جو تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں پیش کی ہیں وہ سب دہلی کے رسم و رواج کی غماز ہیں۔ان کا اسلوب اجتہادی کوشش کا نتیجہ ہے۔ بلکہ جس طرح میر تقی میر کی چھوٹی چھوٹی بحریں ان کی شاعری کو انفرادیت دیتی ہیں تو میر امن کے چھوٹے و چست درست جملے اور مکالماتی انداز بیان ماجرے کو پر لطف بنا دیتے ہیں۔دراصل ان کے اسلوب کی سادگی و دلکشی ان کی نثری خوبیوں کو دوبالا کر دیتا ہے۔ چوں کہ ادبی نثر انسانی جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات کا ترسیلی عمل ہے اس لیے ''باغ و بہار'' میں اس عہد کا سماج، تہذیب وثقافت، معمولات زندگی سب کچھ پایا جاتا ہے۔

گرچہ فورٹ ولیم کالج نے کلکتہ میں سادہ و عام فہم اسلوب کی بنیاد ڈالی تھی۔لیکن دہلی میں بھی کئی طرح کے اسالیب آچکے تھے۔مثلاً خطوط نگاری کا اسلوب، صحافت کا اسلوب، ادبی نثر کے اسالیب اور علمی نثر کے اسالیب وغیرہ۔خطوط نگاری کا انوکھا اسلوب غالبؔ کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔غالبؔ کے خطوط کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی تحریر دل سے نکلی ہوئی اور الفاظ کے پیکر میں ڈھلی ہوئی زبان معلوم ہوتی ہے۔اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جذبات الفاظ میں ڈھل گئے ہوں۔روایت سے بغاوت غالبؔ کا محبوب مشغلہ تھا۔اور اس کو غالبؔ نے اپنے ہر تخلیق کے لیے استعمال کیا۔وہ اپنے ہر فن پارے کے لیے منفرد اسلوب اپنانا چاہتے تھے۔اسی لیے غالبؔ نے خطوط نویسی کے لیے القاب و آداب سے مبرا گفتگو میں آنے والی زبان کی بنیاد ڈالی مثلاً مارہرے کی خانقاہ کے بزرگ سید صاحب عالم نے غالب کو ایک خط لکھا۔ان کی تحریر نہایت شکستہ تھی۔اسے پڑھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔غالب نے انہیں جواب دیا:

''پیرو مرشد، خط ملا، چوما چاٹا، آنکھوں سے لگایا۔آنکھیں پھوٹیں جو ایک حرف بھی پڑھا ہو۔تعویذ بنا کر تکیہ میں رکھ لیا۔نجات کا طالب۔غالبؔ''[2]

اور اپنے دوست امراؤ سنگھ جوہر گوپال تفتہ کے عزیز دوست تھے ان کی دوسری بیوی کے انتقال کا حال تفتہ نے مرزا صاحب کو بھی لکھا۔تو انہوں نے جواب دیا:

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ پچاس برس سے اوپر پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے''۔[3]

اس طرح غالبؔ نے مکتوب نگاری کو تصنع سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی کی سچائیوں سے جوڑ دیا۔اور مقفی، مسجع روش کو چھوڑ کر سادگی اور بے تکلفی پیدا کی۔لیکن غالبؔ اردو سے زیادہ فارسی کو عزیز رکھتے تھے اور اپنے فارسی کلام کو بہتر مانتے تھے جس کا اظہار انہوں نے خود کیا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کے بے رنگ من است

غالبؔ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اردو کے ساتھ فارسی کے بھی جیّد عالم تھے اس لیے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اردو مکتوب نگاری میں نئی روش قائم کرنے کی وجہ ''تزک بابری'' ہے۔کیوں کہ ''تزک بابری'' میں بابر نے ہمایوں کو خطوط نویسی کے زبان و بیان کے بارے میں نصیحت کی ہے۔جس کو قمر رئیس صاحب نے ''تزک بابری'' کے اس حصے کو ترجمے کے بعد اس طرح نقل کیا ہے:

''مجھے اس خط کا مطلب نکالنے میں کافی پریشانی ہوئی۔۔۔پیچیدگی کی وجہ سے خط کا مطلب واضح نہیں ہوتا اس کی وجہ مشکل الفاظ ہیں۔آئندہ جب بھی لکھو الفاظ میں دکھاوا اور بناوٹ سے پرہیز کرو۔جو کچھ کہنا ہے آسان الفاظ میں لکھو''۔[4]

۵۲۹۱ء میں دلی کالج کے قیام سے یہاں کے اسالیب میں تنوع پیدا ہوا۔اور علمی نثر کا نیا اسلوب ابھر کر سامنے آیا۔چوں کہ اسلوب مظہر بالذات ہے۔اس میں مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب کی کارفرمائی ہوتی ہے۔اسلوب ان سبھی کے سنگم کا نام ہے۔دلی کالج میں یہی سنگم علم و دانش کی ترقی کا ضامن بنا۔فورٹ ولیم کالج نے بامقصد ادب کے بیج بوئے۔دلی کالج نے آب پاشی کا کام کیا، سرسید نے معقولیت اور مقصدیت کا لباس پہنایا اور آخر میں ترقی پسند تحریک نے اس کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیا۔

دلی کالج میں تخلیقی نثر سے زیادہ علمی تراجم پر زور دیا گیا۔اور ترجمے کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں ان میں لفظ بہ لفظ ترجمے کی جگہ مفہوم کی ادائیگی پر خاص خیال رکھا گیا۔اور علمی نثر کے لیے سادہ عام فہم الفاظ کے استعمال پر زور دیا گیا۔ترجمے کے موضوعات ریاضی' نیچرل فلاسفی' تاریخ' معاشیات' جغرافیہ اور اصول قانون وغیرہ تھے۔علوم جدیدہ کو ہندوستان میں فروغ کی کوشش کرنے والوں میں مسٹر ٹیلر' مسٹر بتروس' ڈاکٹر اسپرنگر' جے

کارگل، مولوی مملوک علی، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر وزیر علی، ماسٹر رام چندر، ماسٹر امیر علی، پیارے لال آشوب، بھیروں پرشاد، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی احمد علی، میر اشرف علی، مولوی کریم الدین، پنڈت من پھول، ماسٹر نور محمد اور مولوی حسن علی خاں وغیرہ اہم ہیں۔ ''دہلی کالج ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کے تحت ابتدا میں ۱۲۸/کتابیں شائع ہوئیں۔ جس کا ذکر ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' میں اس طرح کیا گیا ہے:

''ورنیکلر سوسائٹی نے تقریباً ۱۲۸/کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔ ان کتابوں میں تاریخ پر تقریباً ۱۵، طب، میکانیات، طبیعات اور کیمیا پر ۲۰، ریاضیات پر ۱۰، قانون پر ۱۰، جغرافیہ پر ۵، علم ہیئت پر ۲/ اور باقی کتابیں سیاسیات، معاشیات، ادبیات، صرف ونحو، فلسفہ اور مشاہیر کے تذکروں سے متعلق ہیں۔ ان کتابوں نے پہلی بار اردو میں مغربی علوم کے فروغ کی راہ ہموار کیں اور یہ صحیح طور پر نشأۃ ثانیہ کا باعث بنیں۔'' [۵]

ہندوستان میں مغربی علوم کا فروغ آسان کام نہیں تھا لہٰذا رام چندر نے معاشرے میں پھیلی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے رسالہ نکالنا شروع کیا۔ تاکہ علوم جدیدہ کے لیے سازگار ماحول بنایا جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے رام چندر نے پہلے ''خیر خواہ ہند'' اور اس کے بعد ''فوائد الناظرین'' کے نام سے دوسرا رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس میں ان کا طرز تحریر عام فہم اور سادہ ہے۔ رام چندر پیچیدہ عربی فارسی الفاظ سے گریز کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ چونکہ رام چندر کا میدان علمی نثر تھا لہٰذا ان کے اسلوب میں بھی سادگی، سلاست اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ ان کے طرز تحریر پر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

''رام چندر کا طرز تحریر اپنے دور کا سب سے اہم طرز تحریر ہے۔ ان کے نگارشات میں اس دور کی خوبیاں بھی اپنے شباب پر ہیں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی زبان عام بول چال کی زبان ہے۔ انہوں نے دقیق الفاظ، دوراز کار محاورے اور بے جا و بے محل تشبیہات و استعارات کہیں استعمال نہیں کیے۔۔۔ رام چندر کی تحریروں کا بنیادی مقصد اشاعت فکر تھا۔ وہ ابلاغ سے زیادہ تبلیغ کے لیے فکر مند تھے۔'' [۶]

مولوی ذکاء اللہ کی تحریروں میں سرسید کی معقولیت اور مقصدیت دونوں پائی جاتی ہے۔ یہ منفرد اسلوب کے حامل اور بے باک نثار ہیں۔ ذکاءاللہ کا میدان علمی نثر تھا۔ اور ان کی تحریروں کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ ذکاءاللہ نے ریاضی، تاریخ، ادب، جغرافیہ، اخلاقیات، طبیعات، علم ہیئت اور سیاسیات وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ چونکہ اس عہد میں جدید علوم سے نفرت کی وجہ مذہب کو مانا جاتا تھا لہٰذا ہر ادیب مذہب و سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ذکاءاللہ نے بھی سدھی ہوئی برجستہ تحریروں کے ذریعہ سائنس و مذہب میں رواداری لانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب جدید علوم کی ترقی کا دشمن نہیں ہے بلکہ اسے ہم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ ذکاءاللہ نے اپنے مضمون ''کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسر تنزل ہے'' میں لکھتے ہیں:

''اب مذہب پر خیال کیجیے کہ پہلے کیا اصول تھے۔ اب کیا ہیں۔ جن باتوں کو متقدمین یہ جانتے تھے کہ

ان سے انسان ملکی صفات بن کر فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ حقیقت میں ان کو بہائم سیرت بنا کر وحشی جانور بناتی تھیں۔ انہوں نے خلاف فطرت تزکیہ نفس کے لیے جو چلہ کشی اور خلوت نشینی و مجاہدات و کم خوابی، بے خوراکی اور استغراق ذات اور فنا فی الفنا ہونا مقرر کیا تھا۔۔۔ اب اس کی جگہ یہ اصول قائم ہوئے ہیں کہ انسان اپنے دل و دماغ کو کام میں لا کر دنیا کی ساری چیزوں سے جو نفع اٹھا سکتا ہے اٹھائے۔ یہی اس کی فرشتہ منشی ہے۔۔۔ ایک آدمی جوگی بن کر پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے تو اس سے کوئی نفع انسانیت کو نہیں پہنچے گا۔'' [۷]

منشی ذکاءاللہ بہت وسیع اور خلاق ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے اخلاقیات اور تہذیبی اقدار کی بات کی۔ اور اردو نثر کو نت نئے اسالیب سے روشناس کرایا۔ مثلاً ان کی تاریخ ہندوستان اور ریاضی سے متعلق کتب وغیرہ۔ علمی نثر کے فروغ دینے میں منشی ذکاءاللہ کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ مگر ان کی تحریروں میں اس زمانے کے رواج کے مطابق مقفٰی و مسجع رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے اپنے مضمون ''دیوان حالی'' میں لکھتے ہیں:

''جناب مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالؔی کی یہ تصنیف اردو زبان کے علم ادب کے لیے سرمایہ فخر و ناز ہے۔ وہ ہماری زبان کے علم ادب کا تاج ہے۔ جس میں فصاحت بلاغت کے جوہر، محبت اور اخلاق کے گوہر، پند و حکمت کے زر میں جڑے ہوئے اپنی روشنی سے ہمارے دل و دماغ کو منور کرتے ہیں''۔ [۸]

لیکن اس مقفٰی اسلوب کے باوصف اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ذکاءاللہ نے اردو نثر کو تاریخ نگاری کا اسلوب بھی دیا اور دیگر علوم کے اظہار کا ذریعہ بھی بنا دیا۔

لیکن ۱۸۵۷ء کے حادثے نے اردو نثر پر بھی گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اس سانحہ کے بعد نثر کے موضوعات بھی بدلے اور مقاصد میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ اور ادب کو ہندوستانی سماج کی اصلاح و ترقی اور فلاح و بہبود کے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید منفرد افکار و خیالات کو لے کر سامنے آئے۔ اور مرصع مقفٰی اسلوب کی جگہ بامقصد ادب، سادہ، عام فہم اور استدلالی طرز تحریر کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کوششوں سے مصنفین کی ایک ایسی جماعت بن گئی جس نے معاشرے کے معاملات اور ان کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو نثر کو مختلف اسالیب بخشے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کے رجحان کی بنیاد ڈالی مختلف علوم و فنون کے تراجم کیے۔ حالی نے سوانح، تنقید اور مضمون نگاری کو رواج دیا۔ محمد حسین آزاد نے مختلف سمتوں میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ مثلاً انہوں نے تاریخ، تنقید، تحقیق، مضمون نگاری اور انشائیہ نویسی کے رنگا رنگ اسالیب کو فروغ دیا۔ گرچہ محمد حسین آزاد کی نثر شعری لطافتوں سے بھی مالا مال ہے۔ رنگینی و قافیہ پیمائی کی جھلکیاں بھی جابجا موجود ہیں لیکن ہر چیز اچھی نثر کی خوبیوں میں شمار نہیں ہوتیں مگر محمد حسین آزاد کا اسلوب اتنا توانا اور پر اثر ہے کہ ان کی خامیاں بھی خوبیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً آب حیات میں ذوق کے بیان میں لکھتے ہیں:

’’حافظ احمد یار نے چندروز پہلے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔وہاں حافظ عبدالرحیم جو حافظ احمد یار کے والد تھے۔ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں اور شیخ علیہ الرحمہ کو اس میں سے چمچہ بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم ان کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔‘‘ ۹

انیسویں صدی کے دہلوی کا یہ مختصر سا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ اس زمانے کے مصنفین نے ملک وقوم کے بدلتے ہوئے حالات کو نہ صرف سمجھا بلکہ ان تمام اہم تبدیلیوں سے روشناس کرایا جو ادب کو متاثر کر رہی تھیں۔اس صدی میں شروع سے آخر تک ہمیں اسالیب کی دھوپ چھاؤں کا منظر ملتا ہے۔کہیں عربی، فارسی کا گہرا رنگ ہے۔کہیں صحافتی اسلوب زندگی کے مسائل سے دوچار ہیں۔کہیں غالب کی سرگوشیاں ان کے خطوط کو زندگی کے سربستہ رازوں کو منکشف کرتی سنائی دیتی ہیں۔کہیں دلی کالج کے تحت منظر عام پر آئے مصنفین اور اساتذہ نے سادہ، سلیس اور عام فہم علمی اور سائنسی مضامین لکھ کر خالص علمی اسلوب کو بڑھاوا دیا۔اور صرف یہی نہیں بلکہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے زندگی کے مسائل سے زبان کو اتنا قریب کیا کہ ان لوگوں کی نثر صرف اس دور کے سیاسی معاشرتی تقاضوں کی شارح ہی نہیں بلکہ عام انسانی زندگی کی عکاس بن گئی۔ ان لوگوں نے سوانح، تنقید، تحقیق، ناول نگاری، مضمون نویسی، انشائیہ نگاری اور تاریخ نویسی کے علیحدہ علیحدہ رجحانات قائم کیے اور اس دور کے نثری اسالیب کو جدید علوم کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔

حواشی:-

۱۔ باغ و بہار مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ص ۲۵۔۱۵
۲۔۳۔ ادیبوں کے لطیفے مرتبہ نارنگ ساقی ص۔۳۵
۴۔ ظہیرالدین بابر (ویکتتو اور کاوے) پروفیسر قمر رئیس ص۔۷۵
۵۔ تارخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد سوم ص ۱۹۔۰۹
۶۔ ماسٹر رام چندر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ص ۴۴۱
۷۔ انتخاب ذکاءاللہ مرتب اصغر عباس، ص ۹۲
۸۔ انتخاب ذکاءاللہ ص ۲۱
۹۔ آب حیات، محمد حسین آزاد ص ۲۴۵

☆☆☆☆☆

عبداللہ جاوید (کینڈا)

مدیر جدید ادب کے نام خط

گرامی قدر حیدر قریشی ! السلام علیکم

جدید ادب شمارہ ۱۱ (کچھ رشتے ٹوٹ گئے۔ برتن مٹّی کے۔ ہاتھوں سے چھوٹ گئے) ایک تحفۂ خاص کے طور پر ملا۔شکر گزار ہوں۔ حسین گرد پوش نفیس کاغذ، نظر نواز طباعت اور روشنیٔ طبع کو افزود کرنے والے مشمولات نے اس شمارے کو محض ایک اور ادبی جریدے سے کہیں زیادہ معتبر بنا دیا۔رشتوں کے ٹوٹنے کے دکھ میں شریک ہونے کا دعویدار تو نہیں بن سکتا۔البتہ اپنے ماضی کے ایسے ہی تجربوں کو یاد کر کے۔۔آپکے ساتھ خود بھی اداس ہو سکتا ہوں۔ سو ہو رہا ہوں۔ ’’گفتگو‘‘ میں آپ پہلے پیرا گراف میں ماورائیت پر ایک مثبت انداز اختیار کرتے ہیں اور دوسرے میں آپ کا تخاطب ان پر مرکوز ہو جاتا ہے جن کی نشان دہی انکے ناموں سے کرنے کے بجائے ان کے رویوں سے کرتے ہیں۔اس ضمن میں آپ کی یہ منطق اچھی لگی کہ جعلی سکّہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اصلی سکّہ اپنا وجود رکھتا ہے۔۔۔نقل اپنی اصل کی شاہد ہے۔۔۔تو پھر یہ نتیجہ بھی اخذ کرنا ممکن ہے کہ نقل جب پکڑی جاتی ہے تو اصل کو اور زیادہ مستحکم یا روشن کر دیتی ہے۔رہا یہ معاملہ جس کا تعلق مشاہدے سے ہے تو بقول غالب ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

سامنے کی حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت تک رسائی حواس خمسہ کے ذرائع بصارت وغیرہ کی مدد سے ممکن نہیں ہے اس کے لئے بصیرت (وژن) کی ضرورت پڑتی ہے لیکن بصیرت بھی لامحدود نہیں اسی طرح مادہ پرست سائنس مادّے کے پارٹیکلز کے اندر داخل ہو کر الیکٹران اور پروٹان کے رقص وصال طلب و وصال گریز کے تجربہ گاہی (لیبارٹری ریسرچ) مشاہدے سے آگے نکل چکی ہے لیکن ہنوز دلّی دور ہے اور اس دور والی دلّی کی جانب انسان کی پیش رفت جاری ہے۔ وجدان اور سائنس دونوں واسطوں اور راستوں سے۔ یہ نامناسب بات ہے کہ وجدان کے واسطے کو قطعی طور پر رد کر دیا جائے اور سائنس کے واسطے کو قدر اور اعتبار سے نوازا جائے یا اس سے بھی بڑی زیادتی کا ارتکاب یعنی ماورائیت کی جانب ادب کی پیش رفت کو مطعون قرار دے کر مسترد کر دیا جائے۔آپ کی جامع گفتگو پر میں نے گفتگو کی۔خواہ عبث ہی کی۔لیکن اگر نہیں کرتا تو اپنے ضمیر کا مجرم بن جاتا۔آج کے عہد میں

کتنے ادبی جرائد کے مدیران گرامی ادب کو اس سنجیدگی سے لے رہے ہیں جس سنجیدگی سے اس نوع کی ''گفتگو'' اور اندرونی اوراق میں معتبر مطالعاتی ادبی مواد پیش کرنے والا یہ مدیر 'جدید ادب' کر رہا ہے۔ میرے خیال میں کسی اچھے کام کو دیکھ کر چپ رہ جانا بذات خود ایک برا کام ہے۔

آغاز میں صباؔ اکبر آبادی کی پہلی دعا نے رلا دیا۔ کسی شعر کو ہونٹوں نے کاغذ پر چوم لیا۔ کلیم شہزاد کا لوک شاعری کا شائبہ لیا ہوا لہجہ بھی دل کو چھو گیا۔ شبانہ یوسف کا مقالہ ''سارتر کا فلسفۂ وجودیت'' میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ سارتر کی وجودیت آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی۔ مضمون میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں اور بعض گتھیوں کو جس طرح سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے میں نے ہمیشہ یہ آواز اٹھائی ہے کہ مشرق کی وجودی فکر جو مغرب کی وجودی فکر سے قطعی مختلف ہے توجہ کی طالب ہے۔ مجھ میں تو اتنا دم خم نہیں کاش کوئی اور اس طلب پر نگاہ کرے۔۔ اس نصف فقرے سے شبانہ یوسف کی توانائی اظہار کا اندازہ لگا لیجئے۔

''۔۔۔انفرادی اچھائی کی ندیا تو مجموعی برائی کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔''

غزلوں میں انور سدیدؔ، احمد صغیر صدیقی، غلام مرتضی راہی، اکرم باجوہ طاہر عدیم، مبشر سعید کی غزلیں بھلی لگیں۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانے ''موسم کی پہلی بارش'' میں مرکزی کردار کی جنسی جبلّت کا مطالعہ جس طرح معصومیت کی حدود کے اندر اور فطرت کے قریب رہتے ہوئے کیا گیا ہے وہ عصمت' منٹو' تینیسی ولیم اور ڈی۔ ایچ لارنس سے رویّے اور برتاؤ کے ضمن میں قطعی مختلف ہے اس سے افسانہ نگار کے فنّی ریاض اور وجہ امتیاز دونوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''کھارے پانی کا کنواں'' میں سلیم آغا قزلباش نے جس طرح جہاز اڑایا ہے اس طرح کنویں میں کود کر جان دینے والی کے کردار کو اڑاتے تو بات بنتی۔ وہ تو اڑنے سے پہلے ہی لینڈ کر گیا' شفیق انجم کا 'میں پلس میں' شاید کسی اور شعبے سے پھسل کر افسانے کے شعبے میں آ گیا ہے۔ مونگیر کے اقبال حسن آزاد نے 'رونے والے' خوب لکھا اور کمال یہ ہے کہ اسکی ریڈ ایبلیٹی برقرار رکھی۔ اسکے بعد آپ نے ٹیبل پیس کے طور پر جوگندر پال سے اقتباس ٹانک کر افسانے کو مزید نمایاں کر دیا۔ چشمہ بیراج والے محمد سراج کو ان کے اس زبردست سٹائر پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسلوب اور زبان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کینیڈا والے ڈاکٹر بلند اقبال کا افسانہ 'بو' طنزیہ ہونے کے ساتھ المیہ بھی ہے۔ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود تفاصیل اور جزئیات سے معمور ہے۔ لائق تحسین ہے۔ مانسہرہ کے جان عالم کا افسانہ ''ارشد جان کیوں نہیں آتا'' افسانے کے لوازمات کا حامل کامیاب افسانہ ہے۔ فیصل آباد کے سیّد علی محسن کا افسانہ کمال چابکدستی سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔ افسانے کے اختتام پر بے ساختہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ نظموں کے شعبے کا انور سدید آغاز کر رہے ہیں۔ بڑی حقیقت پسندانہ نظم ہے اس میں موضوع کو معروضی کر کے ڈرامائی اسلوب سے زندہ اور متحرک کیا گیا ہے۔ پسند آئی۔ نیرّ جہاں کی دونوں نظمیں نسائی توانائی سے معمور ہیں۔ کاشف عباسی کی دونوں نظمیں اچھّی ہیں۔ کراچی کے کسی شاعر سے ایسی اردو کی توقّع نہیں کی جا سکتی تھی یہ اردو پلس

ہندی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اردو اور ہندی کو جڑواں زبانیں کہتا ہوں (اردو پلس ہندی) یا (ہندی پلس اردو) علیحدہ زبانیں نہیں مانتا۔ خواہ اردو میں جتنی چاہے فارسی اور ہندی میں جتنی دل میں آئے سنسکرت داخل کر دی جائے۔ پروین شیر کی نظم افسانے کے سے اسلوب میں ہے اور کامیاب ہے۔ اکمل شاکر کا ایس ایم ایس بھی پسند آیا۔ شبانہ یوسف نے 'پوسٹ ماڈرن ازم' کمال کی نظم لکھ دی ہے۔ کئی مرتبہ پڑھی۔ فکر وہ بھی خالص فکر کو جذبوں میں گوندھ کر لفظوں کے پیڑے بنائے اور ایسے امیج پکائے ''جب جب جھوٹ ہوا دھرتی کی کوکھ میں بنجر پن بوتی ہے / تشنہ سچائی جھوٹ سراؤں میں روتی ہے / ۔۔ گہرے پراسرار سمندر صحرا بن جاتے ہیں'' ۔۔۔۔۔ نظم ''اور سچ تو یہ ہے کہ'' الفاظ کے ساتھ گریز کرتی ہے اپنے انجام کی جانب فکر اور جذبے کے ملاپ کے علاوہ اس نظم میں مجرّد فکر کی خارجی ٹھوس حقائق سے متصادم بھی ہوتی ہے اور ہم آمیز بھی۔ استعارے رمزیت سے مملو ہو کر معنویت اور ابلاغ کا جادو جگاتے ہیں۔ ستیہ پال آنند کی نظمیں تو اتنی عجیب ہیں کہ ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ اس میں اسلوب کی ڈرامائیت کلیدی کردار ادا کرتی ہے یا امیجز اپنا کام دکھاتے ہیں صاف نہیں کھلتا۔ پتہ نہیں کس طرح یہ شخص اس طرح کی شاعری کرتا ہے اور پھر بھی زندہ ہے۔ اسکو تو اپنی شاعری کی آگ میں کبھی کا جل مرنا تھا۔ احمد ہمیش کی شاعری اوور انٹلکچو الائزڈ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ میرا خیال ہے مجھے اپنے اس خیال پر اپنی حد تک اصرار ہے دوسروں تک نہیں سو ناراض نہ ہوا جائے۔ سہیل احمد صدیقی، سلطان جمیل نسیم، ڈاکٹر شفیق انجم، یونس خان، اقبال حسن آزاد، رفیق شاہین، کاوش عباسی، سعید شباب صاحبان کا شکر گزار ہوں میری تحریروں کے مطالعے کے لئے وقت نکالا اور ہمت افزائی فرمائی۔۔ جناب سہیل احمد صدیقی سے دست بستہ عرض کروں گا کہ 'بالراست' عرصۂ دراز سے اردو کا ہو چکا۔ یوں بھی 'براہ راست' سے زیادہ بے ساختہ اور بولتا ہوا لگتا ہے۔ موصوف نے جوگندر پال پر میری تحریر کے ضمن میں یہ جو ارشاد فرمایا ہے ''علاوہ ازیں ان کی تحریر کا انجام بجائے خود نقطۂ آغاز محسوس ہوتا ہے'' کسی حد تک درست ہے لیکن شاید وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ میں اپنے قاری کو ساتھ لے کر جوگندر پال کو پڑھ رہا تھا اور آخر میں اپنے قاری کو تنہا آگے پڑھنے کے لئے راغب کرنا ہی میرا مقصد تھا نہ کہ روایتی مضمون نگاری کی نہج پر چلتے ہوئے بات ختم کرنا۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے متذکرہ مضمون میں توصیفی جادو بیانی کے ساتھ تنقیدی رس کے کم ہونے کا احساس دلایا ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ میں اور جوگندر جی میں کوئی تال میل نہیں اور نہ ہی میری تحریر بقول احمد ندیم قاسمی ''خیر سگالی تنقید'' ہے میں نے تو صرف جیسا پایا ہے ویسا دکھایا ہے۔ پرچے کے مشمولات نے ''لکھتے رقعہ پہ لکھ گئے دفتر'' کے تجربے سے دو چار کر دیا۔۔۔ میں کیا کرتا۔

مخلص

عبداللہ جاوید۔ کینیڈا   ۱۲/ستمبر ۲۰۰۸ء

باتیں مظفر حنفی کی

مصاحبہ: آفرین حسین / مشتاق احمد حامی

آفرین: آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اور ادب کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

مظفر حنفی: کسی مچھلی کو معلوم نہیں کہ وہ پانی کے بغیر کیوں زندہ نہیں رہ سکتی اور کوئی پرندہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیوں چہچہاتا ہے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لکھنا پڑھنا میری زندگی کے لیے ویسا ہی ناگزیر ہے جیسے سانس لینا۔ بچپن سے ہی پڑھنے کا جنون سا تھا۔ مڈل کا امتحان قریب تھا ایسے میں والد مرحوم نے ''طلسم ہوش ربا'' پڑھتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ سرزنش کرتے ہوئے یہ بھی کہہ گئے کہ ایسا ہی شوق ہے تو تعلیم حاصل کر کے خود کچھ ایسی کتابیں لکھو جنھیں زمانہ پڑھے چنانچہ چل مرے خانہ بسم اللہ.........

آفرین: سیکڑوں افسانوں اور تین افسانوی مجموعوں کے باوجود آپ نے اس صنف کو خیرباد کیوں کہا؟

مظفر حنفی: بے شک ادبی زندگی کی ابتدائی گیارہ برسوں میں کہانیاں اور افسانے زیادہ تخلیق کیے ۱۹۶۰ء کے آس پاس ادب میں جدید رجحانات کا بول بالا ہوا۔ جدیدیت نے تمام اصناف ادب میں مرکزیت اشاریت، علامت اور ابہام پر زور دیا۔ لیکن ان کی شمولیت سے شاعری، خصوصاً غزل کے نئے پر و بال مل گئے۔ مجھے تخلیق کار ہونے کے ناتے شاید بروقت احساس ہو گیا اور میں نے افسانے کی جگہ غزل کو اپنا وسیلہ اظہار بنالیا۔ میرا ایک مقطع ہے۔

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنف ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

آفرین: افسانوی ادب آپ کی نظر میں کیا معنی رکھتا ہے؟

مظفر حنفی: ادب میں فکشن کی اہمیت اور افادیت سے کوئی فاترالعقل ہی منکر ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادبی سرمائے میں ایک سے ایک اچھا ناول اور افسانہ موجود ہے لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ فکشن کی عمر شاعری کی ایک چوتھائی ہے اور اس اعتبار سے اردو کا شعری ادب فکشن سے کئی گنا زیادہ بھی ہے اور وسیع بھی۔ کیا سبب ہے کہ تاحال اردو کی تینوں منتظم شخصیتیں (میر، غالب اور اقبال) شعری اصناف ہی سے تعلق رکھتی ہیں!

مشتاق: ادبی تحریکات اور رجحانات سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟

مظفر حنفی: ادبی تحریکات اور رجحانات کے وسیلے سے یقیناً ادب کو بہت سے فائدے ہوئے لیکن اس کے مضرت رساں پہلو بھی تھے مثلاً سرسید تحریک نے اردو ادب کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔ نثر کو عام فہم آسان بنایا۔ مغرب سے اثر پذیری کا دروازہ کھولا۔ اور ناول نگاری کا آغاز اور نظم کا ارتقا اسی تحریک کی دین ہے لیکن اس کے مقصدیت پر زور نے غزل چھین لی۔ حالی خود اپنی شاعری کو ابالی کھچڑی سے تعبیر کرتے تھے۔ آگے چل کر ترقی پسند ادبی تحریک نے اردو افسانے کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ آزاد غزل پر شباب اسی تحریک کے زیر اثر آیا لیکن اس کی ندرت پسندی اور مخصوص نظریے کی پیروی نے نعرہ بازی کا روگ بھی پیدا کر دیا اور اردو زبان کی آبرو کہلانے والی غزل اس تحریک کے ہاتھوں بھی بے آبرو ہوئی۔ جدیدیت کے رجحان نے علامت اور اشاریت و رمزیت پر زور دے کر غزل کو اس کی آب و تاب لوٹائی تو افسانے کو منہ بند بنا کر اسے کہانی پن سے محروم کر دیا اور نظم کو بھی اتنا مبہم بنا دیا کہ اہمال کے نزدیک پہنچ گئی۔

مشتاق: مابعد جدیدیت سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

مظفر حنفی: جدیدیت کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ چند سکہ بند نقادوں کی جکڑبندی اور تنگ نظری کے نتیجے میں رونما ہوئی تھی۔ ہندوستانی مابعد جدیدیت اپنے عہد کے دو بااثر تنقید نگاروں کی باہمی رسہ کشی کے نتیجے میں منظر عام پر آئی ہے لیکن ہر تخریب میں تعمیر اور ہر تعمیر میں تخریب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ توقع ہے کہ اس کے وسیلے سے بالکل نئی نسل کو اپنی شناخت بنانے میں سہولت ہوگی۔

آفرین: ایک عمدہ شعر کی پہچان کیا ہے؟ کیا اس کے اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں؟

مظفر حنفی: آفرین، جس طرح ایک اچھے انسان کی پہچان معیارات حالات اور زمانے کے تناظر میں متعین ہوتے ہیں اسی طرح جمالیات و شعریات ادب کا معاملہ ہے۔ پھر وہ مثنوی کا ہے، نظم کا ہے، قصیدے کا ہے یا غزل کا؟ ان باتوں سے بھی فرق پڑے گا۔ بحیثیت مجموعی میں غزل کے شعر میں نئے خیال اور طرز ادا کی ندرت کو سب سے بڑا معیار قرار دیتا ہوں بشرطیکہ شعر پر تاثیر بھی ہو۔ زبان کی صحت، اصلوب کی برجستگی، فکر کی تازگی اور احساس کی شدت کو بھی اجزائے ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے۔ صنف سخن کا تعین ہو جائے تو ان کے اجزائے ترکیبی کو علمائے ادب نے بہت پہلے متعین کر دیا ہے ان کی پابندی کرنا ہوگا۔

مشتاق: مغربی بنگال میں نئی نسل کے شعرا کہاں تک اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں؟ کیا شعر گوئی کے معاملے میں وہ محتاط اور دیانت دار ہیں؟

مظفر حنفی: بھائی آپ کا سوال بہت خطرناک ہے اور اور بہتوں کو مجھ سے بدظن کر سکتا ہے چوں کہ میری طبیعت میں منافقت نہیں ہے، اس لیے واضح باتیں بے خوف و خطر کرتا رہتا ہوں۔ اب بھی عرض کرتا ہوں کہ چند

شعرا کو چھوڑ کر یہاں کی نئی نسل شعر گوئی کے معاملے میں خاصی غیر محتاط ہے۔ زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے اکثر عدم واقفیت کا ثبوت دیتی رہتی ہے اور ادبی و تخلیقی ذمہ داریوں کے تئیں بہت لا پروا ہے۔ لیکن اس کے لیے میں نوجوانوں سے زیادہ ان سینیئر شاعروں اور ادیبوں، استادوں اور کہنہ مشق اہل قلم کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں، جنہوں نے ناجائز مقبولیت حاصل کرنے کے لیے سچ کہنے اور غلطی پر ٹوکنے کا فریضہ بروقت انجام نہیں دیا اور بے جا حوصلہ افزائی کے نام پر نئی نسل کو خام کاری پر آمادہ کرتے رہے، جس کی وجہ سے ان کی زبان بگڑ گئی، تلفظ خراب ہو گیا، گرامر سے لاعلمی ہو گئی۔ اب خراب میدے، باسی دودھ اور نقلی گھی سے اچھی مٹھائی کیسے بنائی جا سکتی ہے؟ پھر بھی دو چار شاعر نئی نسل میں ضرور ایسے نظر آتے ہیں جن سے امیدیں وابستہ ہیں۔

آفرین: افسانہ اور کہانی میں کیا فرق ہے؟ بیش تر لوگ دونوں کو ایک ہی صنف تصور کرتے ہیں؟

مظفر حنفی: میرے خیال میں کہانی، قصے اور حکایتوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس میں کوئی پر لطف اور عبرت انگیز واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جب کہ افسانہ کسی خاص نکتے پر زور دینے کے لیے نفسیاتی دروں بینی جذبات کی عکاسی کے لیے یا سیرت کے کسی نمایاں پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے جنم لیتا ہے۔ لیکن ادھر چند برسوں سے اردو والوں نے کہانی کو بہ طور اصطلاح افسانے کا مترادف تسلیم کر لیا ہے، کیوں کہ ہندی میں افسانے کے لیے یہی لفظ استعمال میں آتا رہا ہے۔ اس لیے جو لوگ انہیں ایک ہی صنف تصور کرتے ہیں ان سے تعرض نہیں کرنا چاہیے۔

مشتاق: درس و تدریس کے معاملے میں کلکتہ یونیورسٹی کی فضا کو آپ نے کہاں تک سازگار پایا؟

مظفر حنفی: مشتاق میاں، فضا خراب کیا بہت خراب تھی۔ اسے سازگار بنانے میں جان کھپائی ہے۔ میں نے ۱۹۸۹ء میں شعبہ اردو کی اقبال چیئر پر بحیثیت پروفیسر جوائن کیا تو عالم یہ تھا کہ ایم اے (اردو) میں کل پچیس طلبا و طالبات کو داخلہ ملتا تھا۔ مہینوں کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ اساتذہ کہتے تھے کہ اسٹوڈنٹ نہیں آئے، کسے پڑھانے کے لیے کلاس میں جائیں۔ طالب علموں کا رونا تھا کہ دن بھر روم میں بیٹھ کر چلے آتے ہیں کوئی استاد زحمت ہی نہیں کرتا پھر یونیورسٹی میں حاضری دے کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ ایم اے اور بی اے کا نصاب آزادی کے بعد سے وہی چلا آ رہا تھا اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت ہی کمتر معیار کا تھا۔ اساتذہ میں ٹیوشن کی لعنت جڑ پکڑ رہی تھی۔ امتحانات کے پرچے تیار کرنے سے لے کر کاپیاں جانچنے اور نتیجہ تیار کرنے کا سب کام مقامی ٹیچر کرتے تھے۔ امتحانات تین سال پچھڑے ہوئے تھے اور امتحان ہال میں نقل عام تھی۔ عموماً امیدواروں کا امتحان محققوں کے انصاف پر اعتماد متزلزل تھا۔ پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن بہت ہی سطحی بلکہ ایسے فضول موضوعات پر بھی ہو جاتا تھا جن پر اخبار میں ایک آدھ کالمی مضمون لکھ دینا کافی ہوتا ہے۔ شعبے میں استاد بھی ضرورت کے اعتبار سے بہت کم تھے۔ نیز استاد و شاگرد میں اس رشتہ کا سخت فقدان تھا، جس کے بغیر تعلیم و تربیت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ بارہ سالوں میں فضا کتنی تبدیل ہوئی ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے

کہ اب ایم اے (اردو) میں پچیس کی جگہ ۱۸۰ امیدواروں کو داخلہ ملتا ہے۔ کلاسس پوری باقاعدگی سے ہوتی ہیں اور ۶۵ فیصد سے کم حاضری پانے والے طلبا کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یونیورسٹی میں میرا تیار کردہ نصاب تعلیم جاری ہوا اور اس کے معیار کو نمونہ قرار دے کر اب ہندوستان کی کئی دوسری معتبر یونیورسٹیوں نے اپنا نساب تیار کیا ہے۔ اس کے طرز پر کالج سروس کمیشن نے مجھ سے SLET کا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری تفویض کی۔ بہت سے مقامی سینیئر اساتذہ کی مخالفت کے باوجود میں نے بی اے (آنرس) اور پاس کورس کا نصاب بھی یکسر تبدیل کر دیا اور ہر سطح پر بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کو نصاب میں شامل کر کے ان پرچوں کو لازمی قرار دیا گیا۔ ٹیوشن پڑھانے کے سلسلے میں اپنے قول و عمل سے اتنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا کہ اب شعبے کے اساتذہ اس کے نام سے بیزار ہو چکے ہیں۔ امتحانات کو باقاعدہ کیا اور ہر سال کا امتحان بروقت ہونے لگا۔ نقل کے سلسلے میں اصولوں پر اتنی شدت سے کاربند رہا کہ یہ لعنت تقریباً ختم ہو گئی۔ ہر چند کہ مجھ پر سخت گیری کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ امتحانوں کے پرچے بنانے، جانچنے اور نتیجہ تیار کرنے کا ایسا سسٹم رائج کیا، جس میں ہیر پھیر کی گنجائش ہی نہیں تھی (سنتا ہوں کہ میرے سبکدوش ہوتے ہی پھر وہی پہلا سا طریق کار رائج کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، کیوں کہ اس میں اساتذہ اور دفتری اہل کاروں کو سہولت رہتی ہے)۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں آدھے ممتحن ہندوستان کی دیگر دانش گاہوں کے ہوتے تھے۔ پرائیوٹ امتحان دینے والے طلبا نے بھی اس مدت میں اعلیٰ پوزیشنوں سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پرچے کے سوالات آؤٹ ہونے اور Important بتانے کی علت ختم ہو گئی۔ پیروی کرنے والے امیدواروں کی سختی سے سرزنش کی گئی اور کچھ کو سزائیں بھی ملیں۔ ان برسوں میں پی ایچ ڈی کمیٹی کا کنوینر میں رہا سفارش کی بنا پر کسی غیر مستحق ریسرچ اسکالر کو اس مدت میں داخلہ نہیں مل سکا اور ہمیشہ معیاری موضوعات کو ہی تحقیق کے لیے منظور کیا گیا جس کی ہندوستان بھر میں شہرت ہے۔ شعبے میں اساتذہ کی کمی سے نمٹنے کے لیے مری تگ و دو کے نتیجے میں چھ جز وقتی لکچرر فی الفور مقرر کیے گئے اور انہیں جہ صرف ریگولر اساتذہ کی طرح اہم ذمہ داریاں اور اختیار تفویض کیے گئے بلکہ اعلیٰ کمیٹیوں میں مخصوص دعوت ناموں کے ذریعہ بلا کر مشاورت میں شامل کیا گیا۔ اساتذہ اور اسٹوڈنٹ کے درمیان خوشگوار تعلق قائم کرنے کے لیے نہ صرف ایک روزہ پکنک وغیرہ کا رواج عام کیا بلکہ شعبے میں پہلی بار تقریباً تیس اسٹوڈنٹ اور چھ اساتذہ دارجلنگ وغیرہ کے ہفتہ بھر کے تفریحی سفر پر گئے۔ مزید برآں مسلسل لکھنے پڑھنے کی ایسی فضا بنائی کہ ہر سال شعبے میں استادوں میں سے کئی اپنی تصنیفات کو زیور طبع سے آراستہ کرنے لگے ہیں۔ یہ سب کیسے ممکن ہو سکا اس کی طویل داستان کہیں اور بیان کی جائے گی لیکن شعبے کے رفقائے کار کی معاونت کے بغیر فضا کسی صورت میں سازگار نہیں ہو سکتی تھی۔

مشتاق: آپ مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کے اہم رکن ہیں۔ کیا آپ اکیڈیمی کی موجودہ کارکردگی سے مطمئن ہیں؟ تقسیم ایوارڈ کے معاملے میں اکیڈیمی کہاں تک غیر جانب دار ہے؟

مظفر حنفی: مطمئن تو خیر نہیں ہوں، کیوں کہ ہر جگہ ترقی اور تغیر کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ لیکن گورننگ باڈی کا ممبر ہونے کے باعث اس بات کی شہادت دے سکتا ہوں کہ اردو اکیڈیمی کے کام اس کے لیے مقرر قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ اس کے بعض فیصلوں سے باہر کے تمام لوگ اتفاق نہ کریں۔ اگر تعمیری تنقیدیں کی جائیں تو ان کی روشنی میں اکاڈمی کو اپنے ضوابط میں مناسب تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ مجھے اکثر امور میں وجِ اختلافات ہوئے ان کا اظہار متعلقہ کمیٹیوں کی میٹنگ میں کرتا رہا ہوں۔ لیکن فیصلہ کسی خاص شخص کی مرضی سے نہیں بلکہ ممبران کی کثرت رائے سے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا احترام کرنا لازم ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کرنا گورننگ باڈی کے رکن ہونے کے ناتے میرے لیے مناسب نہیں ہے۔

آفرین: آج کل اردو رسائل و جرائد کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور پھر چند شماروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے بیش تر دم توڑ دیتے ہیں، آخر اس کا سبب کیا ہے؟

مظفر حنفی: آفرین، میں سمجھتا ہوں ناتجربہ کاری اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ حالات کا بغور جائزہ لیے بغیر محض شوق کی تسکین کے لیے پرچہ جاری کر لینا اور ہے، اسے جاری رکھنا، خود کفیل اور پھر منافع بخش بنانا، اس کی پالیسی متعین کرنا، سرکولیشن بڑھانا، اشتہارات حاصل کرنا، معیار کو مسلسل بلند کرتے رہنا نئے مدیران کو نہیں آتا۔ ایک ہی شخص مدیر سے لے کر پروف ریڈر اور نامہ بردار تک سب کام بغیر کسی پلاننگ کے کرتا ہے اور یہ سب کسی خاص مقصد مناسب سرمائے اور خلوص کے ساتھ نہیں ہوتا صرف ایڈیٹر کہے جانے اور زیادہ محنت کے بغیر ادبی حلقوں میں جلدی معروف ہو جانے کی سطحی خواہش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسالے دو چار سماروں کے بعد پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں۔ اردو والوں کے پرچے خرید کر نہ پڑھنے کی ادا اس کمزوری کا ایک اور بڑا سبب ہے۔

آفرین: مغربی بنگال میں اردو زبان کا مستقبل کیا ہے؟ اردو سے متعلق ریاستی حکومت کے رویے سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

مظفر حنفی: چار پانچ برس پہلے بی بی سی (لندن) نے اس موضوع پر مجھ سے مفصل انٹرویو لیا تھا جو دو قسطوں میں نشر کیا گیا (اس کا متن میرے سفرنامے ''چل چنبیلی باغ میں'' کے ضمیمے میں شامل ہے)۔ یہاں مختصراً عرض کروں گا کہ اردو کی حالت ہندوستان کی ان ریاستوں میں زیادہ خستہ ہے جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ غالباً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو کی ترقی سے ہندی کی مقبولیت کم ہوگی۔ گجراتی، تیلو، مراٹھی، بنگلہ وغیرہ زبانوں سے متعلق ریاستوں میں اردو کا حال یقیناً بہتر ہے اور وہاں مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بنگال کی ریاستی حکومت نے اردو کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ دوسری ہندی ریاستوں کے مقابلے میں بہت بہتر سہی لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اردو اسکولوں کے اساتذہ کی اسامیاں بڑھنی چاہئیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کالی جگہوں پر تقرر جلد کیے جائیں اور کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ کم از کم دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو میں ایم اے کی تعلیم کا

بندوبست ہونا چاہیے۔ دراصل اس ریاست میں عوام اردو کی تحریک اس جوش و خروش کے ساتھ نہیں چلاتے جیسا کہ مثال کے طور پر بہار والے چلاتے ہیں۔

آفرین: یہاں کے اردو والوں کا آپ کے ساتھ کیسا رویہ رہا؟

مظفر حنفی: کلکتہ اور ریاست بنگال کے دوسرے شہروں میں اردو والوں نے مجھے آنکھوں پر بٹھایا اور دلوں میں جگہ دی جس کے لیے میں عمر بھر ممنون و مشکور رہوں گا۔ یہاں اپنے بارہ سال قیام کے دوران یاد نہیں آتا کہ کوئی بڑا ادبی مشاعرہ یا تقریب ایسی ہوئی ہو جس میں مجھ کو بحیثیت صدر یا مہمان خصوصی مدعو نہ کیا گیا ہو۔ اپنی خرابیِ صحت یا عدم مصروفیت کی وجہ سے اکثر معذرت خواہی کر لیتا تھا۔ خصوصاً گذشتہ دو برسوں میں بہت کم جلسوں میں شرکت کی، کیوں کہ کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ''وضاحتی منصوبے'' کے تحت بہت قلیل مدت میں بڑے پروجیکٹ کی بائیس جلدیں مکمل کرنی تھیں اور اسی دوران میں بلڈ پریشر اور ذیابطیس جیسے مرض کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اردو داں اور اردو کے اہل قلم نے مجھے بے حد احترام، محبت، اپنائیت سے نوازا۔ میری حق گوئی اور بے باک مشوروں کو قبول کیا۔ نیز بڑی سے بڑی شخصیت کی ادبی خامیوں کو برسرِ جلسہ نشان زد کرنے کے باوجود میری نیت اور خلوص پر شبہ نہیں کیا گیا۔ اس کا اس سے بڑا دوسرا انعام نہیں ہو سکتا۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات اور اردو ڈپارٹمنٹ کے ساتھیوں سے بھی بے پناہ محبت اور احترام ملا۔ سب کے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ میری تلخ و ترش باتوں، اعتراضات اور بے لوث طرزِ عمل کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ پچھلی دہائی میں جتنی تعداد میں سہ ماہی رسائل اور ماہنامے شائع کیے گئے اتنے آزادی سے قبل یا آزادی کے بعد کی دہائی میں کبھی نہیں شائع ہوئے۔ اب شاعر، بھی تبدیل ہوا ہے اور تقلید کی جگہ رفتار لے رہی ہے اس علاقے کے شعرا اور ادبا اور ان کی کتابوں پر تبصرے ہندوستان کے معیاری پرچوں اور بعض پاکستانی جریدوں میں بھی چھپنے لگے ہیں۔ اب ادبی محفلوں میں شاعر کچھ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور تلفظ کی صحیح ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی گاڑی حرکت میں آ گئی ہے جلد ہی رفتار اور تیز ہو جانے کا یقین ہے۔

مشتاق: آپ کی نظر میں آزاد نظم کی حیثیت کیا ہے؟

مظفر حنفی: بھائی مشتاق حامی! آزاد نظم اردو کیا عالمی ادب کی ایک اہم ارکار آمد صنفِ سخن ہے، جس کے وسیلے سے بہت سے بڑے فن کار ابھرے ہیں۔ اس کی خرابی بس اتنی ہے کہ پابند شاعری کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔ اس لیے اکثر فن سے نابلد متشاعروں نے اس کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اب تو ان لوگوں کے لیے نثری نظم بھی وجود میں آ گئی۔

آفرین: ہندوستانی ادب اور بیرونی ممالک کے ادب میں کہاں تک مماثلت پائی جاتی ہے؟

مظفر حنفی: میں بیرونی ملک کے ادب سے محض انگریزی کے ذریعہ واقف ہوں۔ اصناف ادب کے

موضوعاتی اور ہیئتی تقاضے سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو ہر ادب اپنی ہم عصر زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔خواہ یہ آئینہ اردو کے فریم میں جڑا ہو یا فرانسیسی طرز کو ہو عکس اس میں زندگی کا ہی ہوگا۔

مشتاق: آپ اپنی شاعری سے کہاں تک مطمئن ہیں؟ اگر مطمئن ہیں تو پھر مزید شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

مظفر حنفی: آپ سے کس نے کہا کہ میں مطمئن ہوں اپنی شاعری سے؟ میرا ایک شعر ہے:

وحشت کب رہنے دیتی ہے گھر پچیسوں بار بنایا

تاحال اٹھارہ سو سے زائد غزلیں، دوسو کے قریب نظمیں، سات آٹھ درجن رباعیاں اور دیگر تخلیقات وجود پا چکی ہیں۔لیکن لگتا ہے اندر کا لاوا اور بڑھ گیا ہے۔ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔آپ کی دنیا بھی تو کتنی ٹیڑھی میڑھی ہے!

مشتاق: کیا شاعر کے لیے زود گوئی اور بسیار نویسی بھی ضروری ہے؟

مظفر حنفی: قطعی ضروری نہیں۔ یہ تو شاعر کے ظرف اور افتادِ استعداد پر منحصر ہے۔ غالبؔ بہت کم کہہ کر عظیم کہلائے۔میر تقی میر اور اقبال بھی عظیم شاعروں میں ہیں اور دونوں نے بہت کہا ہے لیکن ایک پیمانہ یہ ضرور ہے کہ اچھا کہو خواہ کم ہو۔اچھا بھی ہو اور زیادہ بھی تو سبحان اللہ نشان خاطر رہے کہ بہت کم کہنے والوں میں بہت خراب کہنے والے بھی موجود ہیں!

مشتاق: آپ کی نظر میں ہندوستان کا سب سے بڑا ناقد اور شاعر کون ہے؟

مظفر حنفی: میر تقی میر نے تو ویسے ہی کسی سوال کے جواب میں سودا کی ہجو نگاری کے خوف سے اپنے ساتھ ان کا نام بھی شامل کر لیا تھا۔ ہمارے دور میں تو بفضلہٖ سوداؔ جیسا کوئی ہجو گو موجود نہیں ہے۔ سنجیدہ جواب یہ کہ بھائی ابھی ہندوستان میں زندگی بسر کرنی ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب دے کر جان خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ ہر گروپ کا اپنا بڑا بلکہ عظیم شاعر موجود ہے اور ہر جماعت نے قد آور نقاد کھڑے کر رکھے ہیں۔فیصلہ آنے والی نسلیں کر دیں گی۔ایک لطیفہ سنیے۔ پروفیسر وشنو کانت شاستری اس وقت کلکتہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ ہندی تھے۔ موصوف اجودھیا سے کار سیوا انجام دے کر لوٹے تو یونیورسٹی کے اسٹاف روم میں ملاقات ہوئی۔ بندگی کے بعد مصافحے کو ہاتھ بڑھایا تو بھائی نے کچھ اتنی زور سے اور ایسے رخ سے دبایا کہ جان ہی نکل گئی۔عرض کیا حضرت، یہ غریب حنفی کا ہاتھ ہے آپ اسے بابری مسجد کیوں سمجھ رہے ہیں۔آپ کا موجودہ استفسار بھی کچھ ایسے ہی رخ سے کیا گیا ہے!

آفرین: ایک اچھے شاعر یا تخلیق کار ہونے کے لیے کن لوازمات کا ہونا ضروری ہے؟

مظفر حنفی: پہلے تو وہ مادہ یا صلاحیت، 'تا نہ بخشد خدائے بخشندہ' کسی کاوش یا تربیت سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اگر یہ وہبی وصف موجود ہے تو شاعر یا تخلیق کار کو مسلسل کاوش، مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے اسے بڑھاتے رہنا چاہیے۔اظہار پر قدرت، زبان پر مہارت، احساس میں شدت، طرز ادا میں ندرت بھی شرط ہے۔

اپنی زبان کے ادب پر نظر ہونی چاہیے اور کسی دوسری بڑی عالمی زبان کی مدد سے بیرونی دنیا کے ادب کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔

آفرین: بنگال میں اپنے ہم عصر شاعروں میں آپ کس سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

مظفر حنفی: بیٹی! تم بھی ایک لطیفہ سنو۔کلکتہ آمد کے تین سال بعد میرے وائس چانسلر نے پوچھا حنفی صاحب اب تو آپ کو بنگلہ زبان آ گئی ہوگی۔ میں نے کہا جناب میں اپنی اردو بچانے میں لگا رہتا ہوں بنگلہ کب اور کیسے سیکھتا؟ تمہارے سوال کا جواب بھی اس لطیفے سے نکلتا ہے۔

مشتاق: اقبال کی حیثیت آپ کی نظر میں؟ کیا فیض بڑے شاعر نہیں تھے؟

مظفر حنفی: بے شک اقبال ہمارے تین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ اردو نے اتنا بڑا نظم نگار تاحال نہیں پیدا کیا۔ان کے فن اور شخصیت پر سینکڑوں کتابیں آ چکی ہیں۔اس لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔فیض یقیناً اچھے اور اہم شاعر ہیں لیکن انہیں عظیم نہیں کہوں گا۔

مشتاق: کیا مشاعروں کی افادیت آج بھی مسلم ہے اور آج کے مشاعرے بقائے اردو کے ضامن ہیں؟

مظفر حنفی: حال ہی میں ماہنامہ ''افکار'' کراچی نے اس موضوع پر میرا مضمون بطور اداریہ شائع کیا ہے۔ تفصیل تو وہاں مل جائے گی لیکن مختصراً عرض ہے کہ اپنی سطحیت اور مضر اثرات کے باوصف آج بھی مشاعروں سے اردو کی بقا میں مدد مل رہی ہے کچھ اصلاح ہو جائے۔ ان سے متشاعروں، گویّوں، اداکاروں، ادبی طوائفوں، بھانڈ گردی کرنے والے مزاحیہ شعرا کو دور رکھا جائے تو مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر مشاعرے میں عوامی مقبولیت کے حامل چند اچھے اور سچے شاعروں کے ہم راہ ادبی مرتبہ رکھنے والے شاعروں کی کثرت ہونی چاہیے۔جیسا کہ جوش وجگر کے زمانے میں ہوتی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب مشاعرہ کا ادارہ دوہری افادیت کا حامل ہوتا تھا۔ یہ ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ بھی تھا اور نئے لکھنے والوں کی تربیت گاہ بھی تھا۔اس دور کے گزرنے کے بعد ادبی رسائل کی صورت میں وسیع ذریعۂ ابلاغ سامنے آیا جو ادبی تربیت گاہ کا کردار بھی مشاعرہ سے کہیں بہتر کرتا ہے۔اس کے باوجود مشاعرہ کی روایت کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ مجھے مشاعرہ بازی کی مخالفت نہیں کرنی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ادارہ اپنی ادبی افادیت کھو چکا ہے اور ادبی حوالے سے اس کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ثقافتی میلے کی صورت میں یہ بے شک چلتا رہے۔

(**حیدر قریشی** کے مضمون **اردو زبان و ادب کے چند مسائل** سے اقتباس)

پروفیسر ظفر احمد نظامی۔ نئی دہلی

قلمی چہرہ

چہرہ گول گفتار انمول، چہرے پر نمک پیشانی پر علمیت کی دمک، ابھری ہوئی ناک، فکر میں انہماک، بولتے ہوئے لب، رخ پر ذہانت کی تاب وتب، آنکھیں پُرنور، دل مسرور، سر پر سفید بال، برف کی شال، یہ ہیں ممتاز افسانہ نگار، نامور قلم کار، شاعر بے بدل، واقف رموز غزل محقق باریک بیں، شخصیت دلنشیں، صاحب طرز تنقید نگار، اسپ ادب کے شہسوار، ماہر ادب اطفال، ادیب باکمال، قنوطی فکر حیات کی نفی.....یعنی محمد ابوالمظفر ، مظفر حنفی۔

مظفر حنفی یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو واقفِ عالم آب وگل ہوئے، اہل دانش ور صاحب دل ہوئے ابتدائی تعلیم کھنڈوہ میں پائی، مسلم یونیورسٹی سے لو لگائی، دل کے حکم کی تعمیل کی، ایم اے، ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ شاد عارفی کے فن سے مدد لی، برکت اللہ، یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی، عبدالقوی دسنوی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ شاد عارفی کی محبت میں استاد کامل ہوئے۔ ویسے ان کا وطن فتح پور ہسوا ہے جو کھنڈوہ سے کافی دور ہے۔ محکمہ جنگلات میں کھو کر رہ گئے، ہسوا اور بھوپال کے ہو کر رہ گئے ۱۹۷۱ء میں دلی آگئے یہاں کے ادبی حلقوں پر چھا گئے۔ این سی ای آر ٹی کے پروڈکشن آفیسر ہوئے جامعہ ملیہ میں لکچرار اور ریڈر ہوئے۔ شہرت نے کلکتہ کھینچ بلایا، یونیورسٹی میں اقبال چیئر پروفیسر بنایا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب تدریس سے سبکدوش ہو کر اب دلی میں رہائش پذیر ہیں۔ ادبی کارناموں کی چاندنی میں دمک رہے ہیں۔

مظفر صاحب کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق رہا، شعر و ادب کا ذوق رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ادبی سفر شروع کیا۔ مڈل اسکول کے افق پر افسانہ طلوع کیا۔ پھر تو ان کا قلم مسلسل چلنے لگا۔ ہر لمحہ تخلیق کے لیے مچلنے لگا۔ دس شعری مجموعوں جو جنم دیا۔ ☆[یہ تعداد بھی تقریباً تیرہ یا چودہ تک پہنچ چکی ہے۔ مدیر] ایک درجن کتابوں کی تدوین کی، اسی قدر تحقیقی تصانیف کی تزئین کی، چودہ تراجم کیے، ہر کتاب پر انعامات لیے۔

انھوں نے ''یم بہ یم''، ''پردۂ سخن'' اٹھایا، ''طلسم حروف'' سے ص ''دیپک راگ'' گایا، ''کھل جا سم سم'' سے ''دروازہ ٹٹولا''، ''تیکھی غزلوں'' کا قفل کھولا۔ ''پانی کی زبان'' کو ''عکس ریز'' کیا، صریر خامہ'' کو اور تیز کیا۔ ''دو غنڈوں سے'' انتقام کیا، اینٹ کا جواب قلم سے دیا۔ جذبہ فرض شناسی سے کام لیا، احترام کے ساتھ استاد کا نام لیا۔ شاد کی غزلوں سے پردہ اٹھایا، ''ایک تھا شاعر'' سے دنیا کو متعارف کرایا۔ کہیں ان کے کلیات چھپوائے، کہیں

مکاتیب منظر عام پر لائے۔ نثر و غزل کی داد پائی، ہر شعر میں شوخیِ تحریر پائی، گجراتی ڈراموں کی سفارش کی، اڑیا افسانوں پر کرم کی بارش کی، نئی ناول نگاری اختیار کی، جاسوسی ناولوں کی بھرمار کی۔ ''چوروں کے قاتل'' کو ''پیلی کوٹھی'' میں پکڑا۔ ''بین الاقوامی لٹیرے'' کو ''تارِ عنکبوت'' سے جکڑا۔ ''شرلاک ہومز'' کو ہندوستان بلایا، ''پراسرار قتل'' کا پتہ لگایا، دنیائے صحافت میں نام پایا۔ ''نئے چراغ'' کا اجالا پھیلایا، غرضیکہ وہ ہر صنف کے کوچہ گرد ہیں، میدان علم وادب کو مرد ہیں۔ انھیں نثر و نظم پر یکساں قدرت ہے ان کی ہر تحریر میں ندرت ہے، ان کی حیات و شخصیت پر تحقیقی کام ہو چکا ہے، ان کی ادبی خدمات کا نام ہو چکا ہے۔ وہ خود کئی اساتذہ کو ڈاکٹر بنا چکے ہیں، پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سجا چکے ہیں۔

وہ انجمن اساتذہ اردو کے نائب صدر ہیں، جامعات ہند کے لیے قابل قدر ہیں، استاد کی حیثیت سے مقبول ہیں، گلدستہ اردو کا پھول ہیں۔ طلبہ کو بے پناہ عزیز ہیں، اساتذہ کے لیے بیش قیمت چیز ہیں۔ انھیں اپنی حیثیت پر غرور و ناز نہیں، مصنف ہونا ان کے لیے طرہ امتیاز نہیں۔ وہ بڑی سادھی سے رہتے ہیں اس لیے خود کہتے ہیں۔

یہ شہرت کا پرچم، یہ عظمت کا تاج　　　مظفرؔ یہ علت نہیں پالتے

بچپن میں کھلواڑ کیا تھا اک دن ہم نے شعروں سے　　　بھوگ رہے ہیں بچپن برسوں سے اپنی نادانی کو

مظفر حنفی کا یہ شعر خود ان کی شاعرانہ زندگی کی سچّی روداد ہے۔ ان کی شاعری اپنا بھوگ بھی ہے دوسروں سے رشتہ بھی۔ اور یہ رشتہ رزم و بزم دونوں رخ رکھتا ہے اور ان دونوں رخوں کے درمیان دھات کی پرت خود ان کا کشاکش سہتا وجود ہے۔ مظفر حنفی صاحب نے افسانے بھی لکھے ہیں، تنقید بھی کی ہے، تحقیق کا بھاری بوجھ بھی اٹھایا، ترجموں کا درد بھی سہا، سفرنامے کے ذریعہ سیاح مظفر سے ملاقات کرائی اور بچوں کے لیے قلم چلا کر اپنے میں معصوم وجود کے زندہ ہونے کا احساس بھی دلایا۔

میں شاعر تو نہیں اور نہ ہی شاعروں کو الوہی مانتی ہوں۔ البتہ فکر اور جذبے کی بات اور ہے ورنہ شاعر اس کرۂ ارض کے باسی اور اسی کی سی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں (میرے نزدیک) بلندی، لطافت، پھیلاؤ، سنگلاخی، صحرائیت، روانی، ٹھہراؤ، گمبھیرتا، کثافت، گہرائی، گیرائی اور دھواں، روشنی، آتش فشانی اور گرد بادی۔ غرض یہ سب کچھ بندۂ ارضی کے اظہار میں بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات پرتوں کی صورت۔

مظفر صاحب شاد عارفی کے شاگرد ہیں اور شاد صاحب ہماری شاعری کے ''سہل'' شاعر نہیں اس لیے ان کو صحیح تناظر میں سمجھا نہیں گیا اور اسی لیے ان کو ان کا صحیح مقام نہیں دیا گیا۔ رہی بات مظفر صاحب کی تو ان کا معاملہ بھی استاد سے الگ نہیں۔ ایک تو خود ''کج کلاہ'' اوپر سے ''استاد کا اثر''، سو معاملہ ٹھہرا کہ:

اتنا سچ راس نہیں آتا مظفر صاحب　　　سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہو جس تِس کے لئے

(**بلقیس شاہین** کے مضمون ''**بچپن کا کھلواڑ جیون بھر کا روگ**'' سے اقتباس

محمد حسن (دہلی)

صریرِ خامہ

ادھر پے در پے چار چھ اچھے شعری مجموعے چھپے، اچھے مجموعے تھے اور چھپے بھی اچھے۔ شاعری کو چند سال سے اتنی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ ہر طرف شعری مجموعوں کا بازار گرم ہے۔ ان پر اچھی بری رائیں بھی بکثرت سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں اور آوازوں کے اس جنگل میں نئی جہتیں بخشنے والے مجموعے بھی کھو جاتے ہیں۔ ان مجموعوں کے ساتھ بھی زمانہ یہی سلوک نہ کرے اس لیے ان کی بخشی ہوئی نئی جہتوں کی نشاندہی کرنا مفید ہوگا۔

مظفر حنفی کا مجموعہ ''صریرِ خامہ'' تیکھی طنزیہ شاعری کا گلدستہ ہے مگر زور طنز پر نہیں شاعری پر ہے۔ ہماری غزلوں میں جو ایک رونی سی کیفیت طاری رہتی ہے اس کے برعکس مظفر نے اپنے دور پر سخت طنز کے ذریعے شاعری کا مزا بدل دیا ہے۔ وہ شاد عارفی کے شاگرد اور پیرو ہیں لیکن ان کا رنگ محض تقلیدی نہیں۔ شاد کو جس سماج سے سابقہ تھا وہ جاگیرداری دور کا تھا۔ مظفر نے شہروں کی بے امان زندگی کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کے قابل نہیں بلکہ سماجی ناہمواری اور ہپاکریسی کو جوں کا توں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں:

چند کھیتوں کے مقدر میں نہیں ہے پانی ورنہ بادل تو بہر حال برستے ہوں گے

کیا کریں دھبے انہیں کی آستیں پر مل گئے جن کی پیشانی پہ لکھا تھا کہ ہم قاتل نہیں

میرے پیچھے کیوں آتا ہے بستی پیاسی ہے میں بنجارا ہوں میرا کیا، بادل او بادل

وفا سا جرم کر بیٹھے ہیں یارو تبھی تو آگ پر بیٹھے ہیں یارو

کہہ رہی ہے مورتی بھگوان کی کم نہیں ہیں نقش فریادی سے ہم

ترچھی راہوں پر چلتا ہوں رہبر سے کتراتا ہوں یعنی رہزن کی آنکھوں پر آئینہ چمکاتا ہوں

مظفر حنفی نے اپنی غزل کو کھردری غزل کہا ہے جس کے آئینے میں ہماری صدی کے زخم نظر آنے لگیں۔ مظفر حنفی کی شاعری تیکھے امکانات کی شاعری ہے۔ کاش کہ وہ شاد صاحب کی طرح محض زبان کے چٹخارے اور لہجے کے نکیلے پن کے شہید نہ ہو جائیں اور راستے کے اس حسین موڑ سے بعافیت گزر کے زیادہ پُر معنویت اور حسین تر شاعری کی طرف راغب ہوں۔

محمود ہاشمی (دہلی)

صریرِ خامہ: تلاش و تجزیہ

''صریرِ خامہ'' کی شاعری، ہئیت کی نسبت مواد کے غلبے اور تسلط کو پیش کرتی ہے یعنی اس مجموعہ کی شاعری جو بظاہر غزل کی صنف پر مشتمل ہے، معنوی لحاظ سے خالص مواد، جس میں ہئیت کا داخلی کردار یا تو منقود ہے، یا مواد کے لیے انتہائی بے ضرر ہے ہئیت اور مواد کے اتحاد و انتخاب میں، مظفر حنفی نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک مارکسی نظریہ فن کا حامل ہے۔ مظفر حنفی نے خالص اسلوب اور ہئیت والی ''چکنی غزل ا'' سے انحراف کیا ہے اور نئی ہئیت کی نسبت شعری میں مواد کی بنیاد کو لازمی قرار دیا ہے۔

مواد و ہئیت کے ضمن میں اس نظریاتی مارکسیت کے علاوہ شاعر نے اپنے عہد اور اپنی شخصیت کو اجتماعی زندگی اور عوام الناس کے انبوہ سے الگ نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنی آواز کو غیر انفرادی انداز میں تخاطب کا بلند آہنگ وسیلہ بنایا ہے، اس تخاطب کا مواد اپنے عہد کی زندگی، مظاہرات اور عوامل سے حاصل کیا گیا ہے۔ اشیاء اور عوامل کی جانب شاعر کا رویہ ایسے مبصر کا ہے جو پیدل چلنے والے مسافر کی طرح مظاہرات کا قریب سے مطالعہ کرتا ہے اور اس مطالعہ کا ردعمل کو بلند آواز میں بیان کرتا ہے۔ چوں کہ شاعر کا ردعمل خارج کی سمت اختیار کرتا ہے، اس لیے لب و لہجہ کھردرا اور بعض اوقات عامیانہ ہے لہجہ کی اس بے ساختگی اور حقیقت آمیز روش کے باعث اشعار میں نثری منطق بہت نمایاں ہے اور وہ پیچیدگی نہیں ہے جس کے لیے جدید شاعری کو معتوب قرار دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، مظفر حنفی کے مشاہدات کا اظہار، سماجی تنقید اور بورژوا تصورات و عناصر سے ٹکرانے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات حقیقی، ترقی پسندی کو واضح کرتی ہیں۔ لیکن حیرت اور تعجب ہے کہ محمد حسن، جو سچی جدیدیت کو نئی ترقی پسندی کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ اور اس اصطلاح کو رواج دینے کے لیے تدریسی نوعیت کی جدوجہد میں مصروف ہیں، مظفر حنفی کی ان خصوصیات کی جانب متوجہ نہیں ہو سکے، جب کہ مظفر حنفی موجودہ شعرا میں مذکورہ خصوصیات کے لیے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سماجی کش مکش اور عمرانی اقدار سے نبرد آزمائی میں، مظفر حنفی نے شعوری طور پر ایسا رویہ اختیار کیا ہے، جس میں تیکھا پن موجود ہے۔ مظفر حنفی اس تیکھے پن کو طنز کا مترادف سمجھتے ہیں اور اپنے شعور و آگہی کی بے باکی کو تمام تر مردانگی کے ساتھ واضح کرتے ہیں:-

تیرا گماں غلط ہے، شعوری عمل ہے یہ

ابھری نہیں ہے طنز، مرے لاشعور سے

شاعر کی اس توثیق سے نہ صرف یہ کہ جرات مندی کا احساس ہوتا ہے بلکہ شاعر کے ترقی پسندانہ تخلیقی عمل کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ مظفر حنفی کے اشعار کی ایک اور خصوصیت ان کے مقطعے ہیں، جو ہر انفرادی غزل کے مواد کو، ایک تحکمانہ فیصلہ کے ساتھ تکمیل کی نمزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ مقطعوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

مظفر آپ کی ترچھی اڑانیں کام آئیں گی
سنا ہے کہ فن کے دروازے پہ پہرے دار بیٹھے ہیں

اپنے اشعار کے لہجے سے مظفر صاحب
بھیڑ میں دور سے پہچان لیے جاتے ہیں

مظفر ہمیں تجربہ ہو چکا ہے
کہ آساں ہے شاعر سے نقاد ہونا

مظفر آج کے نقاد بھی جانبدار ہوتے ہیں
ہمارا نام ان کے ذہن میں آئے گا مشکل سے

اگر عوام سے نزدیک ہوں مظفر میں
تو اک خفیف سا کج بھی مری کلاہ میں ہے

غزل کا مقطع، صرف شاعر کے تخلص کا اعلان نہیں، بلکہ شاعر کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مظفر حنفی کی غزل کا مقطع ایک ایسے شاعر کی داخلی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، جو جبر و اختیار کی کش مکش میں شامل ہے۔ عوامی اور اجتماعی احساس سے پوری طرح وابستہ رہ کر اپنی انفرادیت اور کج کلاہی کو قائم رکھنا چاہتا ہے، جو ابتلا سے گزر کر ابتہاج اور ابتسام کی منزل تک پہونچتا ہے۔

زندگی اور لازندگی کے درمیان، اظہار کے معرکہ جاری رکھنے والا یہ شاعر اپنی حقیقت پسندانہ شعوری تخلیقی روش سے، اس امکان کی منزل پر ہے جو نئی ترقی پسندی، یا زندگی آمیز تخلیق کی منزل ہے۔

احتشام حسین

نثر و غزلدستہ/ایک تھا شاعر

عام انسانی تاریخ کی طرح تاریخ ادب میں بھی کچھ شخصیتیں اپنے حق سے زیادہ بلند جگہ پا جاتی ہیں اور کچھ ایسے اندھیرے میں پڑ جاتی ہیں جہاں ان کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے۔ لیکن غور کیا جائے تو اکثر و بیشتر اس کے ڈھکے چھپے اسباب ہوتے ہیں۔ بعد کے مورخ اور ناقد انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہی صورتحال شاد عارفی کے ساتھ پیش آئی۔ انہوں نے نظمیں اور گزلیں لکھیں، طنزیہ شاعری کی، مضامین اور خطوط لکھے لیکن انہیں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ان سے کم صلاحیت رکھنے والے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کو حاصل ہوئی۔ اس میں کچھ تو رام پور کی فضا کا ہاتھ تھا، کچھ خود ان کے افتاد مزاج کا، کچھ اس رنگ سخن کی کساد بازاری کا جس کے وہ تاجر تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں مظفر حنفی جیسے شاگرد نصیب ہوئے ہیں جو استاد پرستی کی حد تک وہ سارا رطب و یابس جمع کر رہے ہیں جو شاد عارفی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ نثر و غزلدستہ میں ان کے ادبی مضامین، تعارف، پیش لفظ، چند مطالعے، منظومات اور غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں اور ایک تھا شاعر میں شاد عارفی کی شخصیت اور شاعری پر مضامین اور کو دان کے خطوط شامل ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو جس سلیقہ اور لگن سے ترتیب دیا گیا ہے اس کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق باقی نہیں رہ جاتا کہ شاد عارفی کی طرف سے بے توجہی برتی گئی ہے۔ شاد عارفی ایک طنز نگار غزل گو شاعر تھے اور گو ان کی گزلوں میں بھی فلسفیانہ اور تہہ دار اشعار کی کمی نہیں لیکن اصل جوہر طنزیہ کلام میں کھلتا ہے۔ طنز نگاری کے امکانات کچھ محدود ہوتے ہیں تاہم ان کے اندرونی سماجی مقصد کی وجہ سے ان کا دائرہ کبھی کبھی پھیل بھی سکتا ہے۔ شاد عارفی نے اس حیثیت سے اپنی شاعری کا معیار بلند رکھا تاہم اس کی اپیل آفاقی اور ہمہ گیر نہ ہو سکی۔ ان کے اس رنگ نے ان کی شاعری کی دوسری خصوصیات کو پس پردہ کر دیا ورنہ انہیں اس سے زیادہ ہردلعزیزی حاسل ہوتی۔

مظفر حنفی کی یہ کوشش قابل تحسین ہے کہ انہوں نے ان کی تحریروں کی فراہمی میں کدوکاوش کی ہے اور بہت سے ادیبوں اور نقادوں کے افکار اکٹھا کر دیے ہیں لیکن انہیں بھی اندازہ ہوگا کہ زمانے کے مذاق میں خاصی تبدیلی آچکی ہے اور یہ امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ شاد عارفی کے رنگ اور طرز اظہار کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ تاہم ان کی یہ کاوش رائگاں نہیں جائے گی اور اردو ادب کا مورخ ان کی دستاویزی تالیفات سے فائدہ اٹھائے گا۔ مجھے ذاتی طور پر شاد عارفی کی شاعری نے متاثر کیا ہے، وہ جو تھے وہی ان کی شاعری ہے۔ زندگی نے انہیں جو کچھ دیا ہے وہ ان کے کلام میں کبھی غم و غصہ بن کر، کبھی طنز اور زہر خند بن کر، کبھی دکھے دل کی پکار بن کر محفوظ ہو گیا۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

طلسم حروف

ایک عرصے تک ڈاکٹر مظفر حنفی کو شاد عارفی کے قبیلے کا شاعر شمار کیا جاتا رہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاد عارفی کے ہونہار تلاندہ میں سے ہیں اور بات کو کھردری سچائی سے کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تاہم اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ایک طویل عرصے تک شاد عارفی کے سائے تلے سفر کرنے کے باوجوف مظفر حنفی نے اپنی الگ انفرادیت نکھاری ہے ان کے شاعری کا ذائقہ الگ ہے اور وہ اپنی الگ پہچان بھی رکھتے ہیں، وہ اپنی تازہ ترین کتاب ''طلسم حروف'' میں انبوہ میں گُم نہیں ہوجاتے بلکہ اپنا تشخص اپنی شاعری کے حوالے سے قائم کرتے ہیں۔مظفر حنفی نے قدیم سچائی کو جدید اسلوب میں قائم کیا ہے، وہ نہ تو خود انکشافی سے خوف کھاتے ہیں اور نہ جذبے پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ زمانے کے گرم اور سرد کو چکھنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے باوجود مظفر حنفی کے ہاں تلخی یا زہرناکی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی یہ خوبی انہیں شاد عارفی سے مختلف مزاج کا شاعر ثابت کرتی ہے۔ مظفر حنفی نے اپنا تخلیقی سفر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شروع کیا تھا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اگرچہ اپنی گھن گرج ختم کر چکی تھی لیکن اس کے باقیات میں اونچا لہرا اٹھانے والے دسیوں شاعر موجود تھے۔مظفر حنفی نے مزید اونچی آواز اٹھانے کے بجائے شعر کی داخلی کیفیت کو اُبھارنے کی قابلِ قدر سعی کی اور اس کے لئے ایسا خوبصورت غیر رسمی انداز قبول کیا جو پہلے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا۔ اس غیر رسمی انداز میں قاری کو داخلی سچائی سے مغلوب کرنے کی صلاحیت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ اہل دنیا جب مظفر حنفی کو پڑھتے ہیں تو اکثر اوقات اس کا سامنا نہیں کر پاتے۔ ''طلسم حرف'' اسی قسم کی سچائیوں کا مرقع ہے اور مظفر حنفی صفتِ سیل رواں زمانے کے ہنگام کے ان سچائیوں کو روکتا ہے اور غزل یا نظم کی لڑی میں پرو ڈالتا ہے۔ یہ فعّال شاعر کی بہت اچھی مثال ہے، اس لیے متاثر کرتی ہے۔ کتاب کا معنی خیز لفظ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے۔ شمش الرحمان فاروقی نے انھیں سوؔدا کے نزدیک قرار دیا ہے۔ یہ کتاب شب خون کتاب گھر الہ آباد سے پندرہ روپے میں دستیاب ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

ایک تھا شاعر

شاد عارفی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی ۸۵۰ صفحے کی اس کتاب کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ خدا شاد عارفی جیسا استاد اور مظفر حنفی جیسا شاگرد سب کو نصیب کرے۔ استادی اور شاگردی کا دور ختم ہوجانے سے جہاں ہزاروں فائدے ہوئے وہاں کچھ نقصانات بھی ہوئے۔شاد عارفی چالیس برس تک اردو ادب کو مالا مال کرتے رہے، لیکن ان پر ڈھنگ کی کوئی کتاب یا مضمون لکھا جانا تو کیا، ان کا کوئی باقائدہ مجموعہ بھی مرتب نہ ہوسکا۔ اگر مظفر حنفی کو حق استادی ادا کرنے کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اردو دنیا شاد عارفی کے نام سے تو واقف رہتی لیکن اس سے زیادہ وہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہوتا۔

مظفر حنفی، شاد عارفی کے آخری عمر کے شاگردوں میں سے تھے۔ جس طرح بڑھاپے کی اولاد سب کو عزیز ہوتی ہے، اسی طرح مظفر حنفی بھی شاد صاحب کو بہت زیادہ عزیز تھے۔ (بقول اکبر علی خاں) مظفر حنفی وہ واحد شخص ہیں جن سے شاد صاحب کا جھگڑا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں کی کبھی ذاتی ملاقات نہیں رہی، سارے تعلقات خط و کتابت کی بنیاد پر قائم تھے۔ شاگرد بنانے کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ شاعری ہی شاد صاحب کا ذریعہ معاش تھی۔ اس لیے وہ شاگردی کے درخواست دہندہ کو ''انجمن ارباب ادب'' کا رکن بننے کی شرط پیش کرتے تھے، جس کی شرائط رکنیت کی رو سے، تھوڑی سی رقم سالانہ اور کچھ فیس داخلہ پیش کرنی ہوتی تھی۔ شاد عارفی کی مالی حالت ان دنوں کچھ زیادہ ہی خراب تھی، لیکن مظفر حنفی نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ اگر شاد صاحب (بوجہ عدم ادائیگی فیس داخلہ وغیرہ) انہیں شاگردی میں قبول نہ کریں گے تو وہ نوح ناروی یا ابر احسنی گنوری کے شاگرد ہوجائیں گے اور اس حقیقت کو تشہیر بھی کریں گے۔ شاد صاحب بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے جواب میں اس تہدید کا کوئی ذکر نہ کیا بلکہ انتہائی محبت سے مظفر حنفی کو شاگرد بنانا قبول کیا اور ساری رقمیں معاف کر دیں۔ (ص ۸۴۵۔۸۴۴)

شاد صاحب میں تنگ نظری، کم علمی، احساس کمتری، چڑچڑاپن، انتہائی سخاوت، ذہنی اور قلبی فراخ دلی اور فیاضی، جرائت مندی، اخلاص، اعلیٰ ذہانت و جودت طبع جیسی خصوصیات ایک ساتھ پائی جاتی تھیں۔ وہ واقعی ایک زندہ اور حرارت سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دوسروں کے کلام نثر و نظم (بہ شمول نیاز فتح پوری و جوش

ملیح آبادی) پر سخت بلکہ کبھی کبھی نازیبا لہجہ میں اعتراض کرتے تھے۔اعتراضات اکثر صحیح ہوتے تھے،لیکن خودان کا کلام کبھی فاحش غلطیوں سے پاک نہیں تھا۔اس سلسلے میں زیر تبصرہ کتاب میں بھی کوثر چاند پوری، ماہرالقادری، اور اکبرعلی خاں کے مضامین کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔جگر کے بارے میں انہوں نے لکھا ''جگر کے ہاں فنی خامیوں کی بھرمار ہے، اسی لئے وہ بے چارہ کسی بھی مشاعرے میں مجھ سے آنکھ چار نہ کر سکا، بلکہ ہمیشہ میری تواضع میں لگا رہا۔''اس سے ذرا پہلے لکھا ہے:''روش صدیقی اور عدم تو ٹھیک ہیں،مگرنشور واحدی اور جذبی دونوں کافی غلط گو ہیں، یہ بات تو ظاہر ہے کہ جگر صاحب بڑے، بلکہ بہت بڑے شاعر تھے،اور شکیل، مجروح کی خاک پا کو نہیں پہونچتے۔لیکن شاد عارفی صاحب نے شکیل کو مجروح سے بڑھا دیا۔اس طرح کی خام تنقیدی رائیں ان کی ادبی فہم و فراست کو مشکوک بناتی ہیں۔ص ۵۶۷۔۵۶۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الف وصل اور الف ساقط میں فرق نہیں کرتے تھے۔زبان پر ان کو جو مہارت حاصل تھی وہ وہبی تھی، اکتسابی نہیں،لیکن احساس کمتری کی وجہ سے انہوں نے ہمیشہ خود کو بڑا عربی فارسی اور اردو داں کہا۔اسی احساس کمتری نے ان سے رومان کراچی کو بھیجی ہوئی غزل پر ''پورا صفحہ'' کی ہدایت لکھوائی (عکس تحریر ص ۱۱۸اور صفحہ ۲۰ کے بیچ میں) غزل اچھی ہے تو جہاں بھی اور جس طرح چھپے گی اپنا لوہا منوالے گی،لیکن شاد صاحب کو اس میں اپنی ہیٹی نظر آتی ہے کہ ان جیسے استاد کا کلام ایک کالم میں چھپے۔(اس مرض میں ہمارے بہت سے شعراء مبتلا ہیں، ایک شاد عارفی پر موقوف نہیں،لیکن اس مکرر ہدایت کے پیچھے سے ان کا یہ کوف جھلک رہا ہے کہ شاید مدیر رومان شاد عارفی کی غزل کو پورے صفحے کے لائق نہ سمجھتے ہوں)

شاد عارفی صاحب بہر حال ایک عہد ساز شاعر تھے،ان کے بعد آنے والے ہر شاعر اور علی الخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتساب فیض کیا ہے۔زمانے نے ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی۔اس کتاب میں بھی کم زور ترین تنقیدی آراء کا ہے۔زیادہ تر لوگوں نے سرسری لکھا ہے، ادھر ادھر کے مضامین مختصر اقتباسات ہیں۔ اردو شاعر کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ جب تک وہ کسی سیاسی یا تہذیبی ادارہ سے منسلک نہ ہو،اس کی قدر شناسی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔شاد صاحب کو دونوں طرح کی محرومیاں ملیں، نہ گھر کے فارغ البال اور کوش وخرم اور نہ ادبی دنیا میں با قاعدہ حسب مرتبہ قدر ومنزلت۔لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ان کی شاعری میں بھی یہ دم خم، یہ تیور اور یہ اکھڑ پن نہ ہوتا۔

''ایک تھا شاعر'' شاد عارفی کے ظاہر و باطن کی عبرت ناک، ادبی حیثیت سے قابل قدر اور تاریخی حیثیت سے اہم دستاویز ہے۔ان کی شخصیت پر لکھے ہوئے مضامین میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا مضمون سب سے بہتر ہے، کیوں کہ ان کی شاعری پر بھی تنقیدی اشارے مل جاتے ہیں۔مسعود اشعر کا مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ منظومات میں مظفر حنفی کی نظم ''وصیت'' اردو کے اہم مرثیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔طنز اور افسردگی کا ایسا امتزاج کم دیکھنے میں آتا ہے۔شاد عارفی خود اپنا مرثیہ اس سے نہ بہتر کہہ سکتے۔

شاد عارفی کو کم از کم خراج عقیدت جو پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس کتاب کو خریدے اور پڑھے۔

ندا فاضلی (ممبئی)

پانی کی زبان

''پانی کی زبان'' مظفر حنفی کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔وہ پابندی سے لکھتے ہیں اور شائع بھی ہوتے رہتے ہیں۔ان کا نام اردو پڑھنے والوں کے لیے اب کوئی نیا نہیں ہے۔اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت جو سنجیدہ قاری کو متوجہ کرتی ہے، وہ شاعر اور قاری کے پر اعتماد رشتے کی تلاش ہے جن کے درمیان مظفر حنفی نے کسی تیسرے چہرے کو جھانکنے کی اجازت نہیں دی ہے۔پیش لفظ میں بھی انہوں نے اپنا ہی ایک شعر درج کر دیا ہے:

عظمت سے ہٹ کے ندرت وجدت کو ناپئے   ہم اور چیز، غالب و میر و فراق، اور

''ہم اور چیز'' کا شعوری احساس خود اعتمادی کی دلیل بھی ہے اور خود شناسی کا تجزیہ بھی۔مظفر حنفی کی شاعری کا مزاج طنزیاتی ہے۔اس کی نشو نما میں ان کے اپنے فطری رجحان کے ساتھ لیکن ان کے استاد شاد عارفی کی روایات کا بھی دخل ہے۔طنز فرد کی داخلی ایمانداری کا مظہر ضرور ہے لیکن یہ جلد کی اوپری پرتوں ہی کے ارتعاشات کا رد عمل ہوتا ہے۔اس میں شخصیت کے اپنی پوری تہہ داریوں کے ساتھ ابھرنے کا امکان مقابلتاً کم ہے۔مظفر حنفی کے مزاج میں ایک قسم کی جھلاہٹ ہے جس کے پاس نہ کسی صوفیانہ جنت کا تصور ہے اور نہ یہ کہیں سے اوپر سے اوڑھی ہوئی لگتی ہے۔اس میں ماحول اور شخصیت کے براہ راست تصادم کی سچائیاں پوشیدہ ہیں۔لیکن اس میں رک کر سوچنے اور ٹٹولنے کی کیفیت کچھ کم ملتی ہے۔ایسا لگتا ہے شاعر سفر کے دوران اپنے پیروں پر چلنے کے بجائے کسی ریل کی کھڑکی سے بھاگتی ہوئی دھوپ چھاؤں کا نظارہ کرتا جا رہا ہے اور جو کچھ نظر آ رہا ہے، اسے لفظوں کی تراش خراش میں محفوظ کرتا جا رہا ہے۔وہ مشاہدات کو نہایت لاتعلقی کا خلوص شخصیت کے پھیلاؤ اور اس کے عرفان کا بھی متقاضی ہوتا ہے جس کی کمی لب ولہجہ میں یک سمتی قطعیت پیدا کر دیتی ہے:

نعرے سن کر سوچ رہا ہوں   شاعر ہیں کہ سیاست داں ہیں

تم ہی جو اتحاد کے حامی ہو اس جگہ   موقع ملے تو گوشت سے ناخن جدا کرو

ڈھول پیٹیں گے حضرت اخلاق   ناچ گھر میں حیا مٹکتی ہے

آ چکا ہے ایٹمی چابک مشینی ہاتھ میں   اے خلا میں ناچنے والے ستارو چھپ رہو

ترقیوں کی یہ معراج ہی قیامت ہے   ہر ایک موڑ پہ اک جادہ فنا دیکھا

لب ولہجہ کی قطعیت حالی سے لے کر موجودہ عہد کے اکثر ترقی پسند شاعروں تک پھیلی ہوئی ہے۔

معلوماتی خبروں اور کتابی مقصدیت کو بنا شخصی مزاج عطا کئے بحر اور وزن کے چوکھٹوں میں پیش کرنے کے رجحان نے قارئین کی آزاد سوجھ بوجھ پر پہرے ہی نہیں بٹھائے، اچھے ادب کے ان کے تقاضوں کو بھی گمراہ کیا ہے۔

مطفر حنفی غزلیں اور نظمیں دونوں پابندی سے کہتے ہیں، غزلوں میں ان کا اپنا کوئی مخصوص آہنگ تو نہیں ابھرتا لیکن ان میں ایک تازگی ضرور نمایاں ہے۔ بات سے بات نکالنے میں انہیں بھی شاد عارفی کی طرح مہارت حاصل ہے۔ شاد عارفی نے اپنے مزاج کو پہچان کر اپنی شعری سمتیں متعین کر لی تھیں۔ ان کی نظموں میں نظیر کی نظموں سے زیادہ چہل پہل اور گرمی ہے۔ ان کی آواز بہت گہری اور تہہ دار تو نہیں ہے، مگر اس میں ایک تاثراتی غم آگینی ضرور محسوس ہوتی ہے۔

مظفر حنفی نے ابھی اپنے مزاج کی رو کو نہیں پہچانا ہے۔ وہ کئی سمتوں کے یاتری ہیں، مگر کسی طرف بھی رک رک کر چلنے کے عادی نہیں ہیں۔ صرف طائرانہ نگاہ ہی سے گرد و پیش کا محاصرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں غزلوں کے درمیان جہاں جہاں وہ مروجہ فیشن اور روایتی تاثرات سے دور ہٹ کر خود اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، آواز زیادہ جاندار اور مانوس ہو جاتی ہے۔ غزلوں کے ایسے شعروں میں الفاظ خود کم بولتے ہیں اور محسوس زیادہ کراتے ہیں۔ نجی تجربے کی عدم موجودگی لفظوں میں غیر ضروری شور پیدا کر دیتی ہے۔ وہی الفاظ جو میر کے یہاں گھاس کی طرح ملائم ہو کر چھوتے ہیں اور غالب کے یہاں خاموش سوچ سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، جوش ملیح آبادی کی نظموں اور غزلوں میں اسکول کے بچوں کی طرح اتنی اچھل کود اور شور غل مچاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مظفر حنفی کی غزلوں میں کہیں کہیں اس پرسکون لہجے کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو ہر عہد میں اچھی شاعری کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حالاں کہ ''پانی کی زبان'' کے آکاش پر ایسی بجلیاں کبھی کبھی ہی چمکتی نظر آتی ہیں۔:

اتنی مبہم، اتنی تنہا، اتنی بھاری بھاری شام جانے کس وک ڈھونڈ رہی ہے جنگل میں بیچاری شام
وہ مرا نام کچھ اس طرح لیا کرتے ہیں کوٹ میں جیسے کوئی پھول سجایا جائے
تھم کر کبھی جو سانس بھی لی ہے سکون سے نشتر سا ایک دل میں اترتا چلا گیا
اپنا آنگن، اپنا بستر، اپنی یادیں، اپنا وقت یوں لگتا ہے جیسے دن سے رات زیادہ روشن ہے
اب جو ہونا تھا ہوا، زخم نہیں بھر سکتے کیوں کسی شخص پہ الزام لگایا جائے

ان شعروں میں الفاظ کچی کونپلوں کی طرح دھیمے دھیمے پھیلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں شرمائے چہروں کے مانند پردہ کے پیچھے سے جھانکنے کی ادا بھی پرکشش ہے۔ لیکن یہ لہجہ جو تجربے کی شدتوں کا راز دار ہے، زیر تبصرہ مجموعہ کا مجموعہ لہجہ نہیں کہا جا سکتا۔ غزلوں کی حد تک تو سپاٹ لہجے کی ندرت، ردیف، قافیہ اور بحر وزن کے متوازن آہنگ کی وجہ سے گوارا بھی ہو جاتی ہے مگر نظموں میں جب خارجی سپاٹ پن کے ساتھ اس سے کام لیا جاتا ہے تو خیال روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ بسور کر بیٹھ جاتا ہے۔

مظفر حنفی کی بیشتر نظمیں علامات و اشارات کو بیانیہ شاعروں کی مانند آرائشی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان

کے منہ اوپر سے بند ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے کو اندر جھانکنے کی اجازت بہت کم ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، وہ شعوری طور سے نظموں کو اپنے مزاج کے خلاف مروجہ روایات کے حوالے کئے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن میں خیال امیج یا علامت بن کر نہیں ابھرتا۔ وہ کسی طے شدہ خیال کے اوپر سے علامات اور استعارات کی کیلوں اور تختوں میں جڑنے لگتے ہیں۔ اس انداز سے نظموں میں بیانیہ سپاٹ پن کسی حد تک کم ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس کی جگہ جو رمزیت ابھرتی ہے، وہ بہت بے جان اور نیرس سی لگتی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں شاعر کو کچھ زیادہ بن بن کر باتیں کرنی پڑتی ہیں:

میں نے مرحوم دادا کی تصویر سے / باسی پھولوں کا گجرا اُتارا / مہکتے ہوئے تازہ پھول ان کے چرنوں پہ رکھتے ہوئے / اچانک مری نگاہوں میں وہ کیل آ ہی گئی / جو اکھڑنے کو تھی   **(آج کی بات)**

اور پھر اسی اکھڑی ہوئی کیل کو دوبارہ ٹھونکنے کا تفصیلی بیان اور آخر میں کسی مدرس کی طرح ایک ایک بات کو پھیلاتے ہوئے، انگوٹھے کی چوٹ کا ذکر، جس کو دیکھ کر منے کے منہ سے اچانک قہقہہ پھوٹ نکلتا ہے۔ اس طرح نظم ''وقت کے حمام'' میں کہانی کو پوری وضاحت اور منطقی ربط کے ساتھ ابھارا گیا ہے:

ٹھیک پندرہ سال بعد / وہ مجھے کل شام / ایک بھٹیار خانے میں ملا تھا / دیر تک ہم ایک دوسرے سے گلے ملتے رہے / اور لنگڑی یاد کو سگریٹ سے سلگاتے رہے /

انہیں نظموں کے ساتھ کچھ نظمیں ایسی بھی ضرور ہیں جو اس قسم کی وضاحت اور مصنوعی منطقیت سے دور نظر آتی ہیں۔ ان میں خیال، جذبہ اور اظہار ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر نہیں آتا بلکہ آپس میں ایک شعوری رو کے ارد گرد بُنا ہوا سا لگتا ہے---مظفر حنفی کی بیشتر نظمیں عنوان کے سہارے کھڑی رہتی ہیں۔ ان کی کیفیت کا دار و مدار اوپر ٹنگے ہوئے عنوانات پر زیادہ ہوتا ہے لیکن اکثر عنوانات پڑھنے والے سے ضرورت سے زیادہ تقاضا بھی کرنے لگتے ہیں۔ مگر ''ٹوٹی ہوئی کڑیاں''، ''فلسفے کا شہر''، ''فائلوں کا جادوگر'' اور ''نئے خدا کا قہر'' اور ایسی ہی دوسری نظمیں اس مجموعہ کی خوبصورت اور کامیاب نظمیں ہیں، یہ صرف عنوانات کی بیساکھیوں کے سہارے نہیں چلتیں۔ ان میں خود چلنے، پھیلنے اور پڑھنے والے سے دیر تک باتیں کرنے کی سکت ہے۔

''پچھلے دنوں دوحہ قطر فروغ اردو کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا۔ مجھے دعوت نامہ ملا تو میں نے مشاعرے کے کنویز سے کہا کہ ہندوستان سے جو شاعر بلائے جاتے ہیں ان میں اکثریت ان شاعروں کی ہوتی ہے جن کا شاعری سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ ان کے اصرار پر میں نے کچھ نام انہیں بتائے۔ ان میں ایک نام مشہور جدید شاعر محمد علوی کا بھی تھا۔ لیکن کنویز صاحب کئی شعری مجموعوں کے صاحبِ اسلوب شاعر محمد علوی کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔''

(**ندا فاضلی** کے کالم **تماشا میرے آگے**۔۔ سے اقتباس

جلی عنوان **''جب بازار میں کھوٹے سکّوں کی بہتات ہو تو کھرے سکے بازار سے باہر بھی ہو جاتے ہیں''**

مطبوعہ ادبی سیکشن **روزنامہ انقلاب ممبئی** انٹرنیٹ ایڈیشن ۲۲ جون ۲۰۰۸ء)

رشید امجد (راولپنڈی)

دو غنڈے

(افسانوں کا مجموعہ)

مظفر حنفی شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ دیکھ کر احساس ہوا کہ ان کے اندر ایک بہت اچھا کہانی گو بھی چھپا بیٹھا ہے۔

مظفر حنفی کے افسانے موضوعاتی طور پر اپنے گرد و نواح سے بحث کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ کی سماجی، معاشرتی اور معاشی نتائج کے مسئلے کے نتیجہ میں اس طبقے میں جو الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں، مظفر حنفی نے انہیں موضوع بنایا ہے چنانچہ ان کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع افسانہ کے دیگر لوازمات پر حاوی رہتا ہے۔

فنی طور پر یہ افسانے کہانی سے زیادہ قریب ہیں۔ اکثر افسانوں میں کہانی کہنے کا انداز، داستان نما ہے۔ اردو افسانے نے اس دوران جو نئے رجحانات آئے ہیں یہ افسانے ان سے متاثر نظر نہیں آتے۔

مظفر حنفی نے ان افسانوں کے توسط سے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس سیدھے سادھے انداز میں زندگی کو دیکھا ہے اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ ان کے کردار زبان و بیان کی الجھنوں میں پڑنے کی بجائے راست عمل پر گامزن نظر آتے ہیں۔ یہ کردار ایک عام انسان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے غیر معمولی بنا کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔

مظفر حنفی کے افسانوں میں ساری باتیں وضاحت سے بیان ہوئی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ قاری چیزوں کو بہ آسانی سمجھ لیتا ہے اور ابہام کا خدشہ نہیں رہتا لیکن بعض اوقات یہ وضاحت افسانے کے تحیر اور تجسّس کو نقصان بھی پہونچاتی ہے۔ اور بعض چیزیں جنہیں اوجھل رہنا چاہیے، کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔

اردو افسانہ اب ایک نئے دور کا آغاز کر چکا ہے۔ مظفر حنفی کے افسانے اس نئے دور کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہ افسانے جیسا کہ انہوں نے خود دیباچہ میں لکھا ہے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان کے ہیں۔ اس دوران اردو افسانہ ایک طویل راستہ طے کر چکا ہے۔ تاہم ان افسانوں کی اپنی حیثیت موجود ہے۔

عنبر شمیم (کولکاتا)

شاد عارفی: ایک مطالعہ

”شاد عارفی - ایک مطالعہ“ ۴۲۴/صفحات پر مشتمل ایک ادبی دستاویز ہے جس کے مرتب پروفیسر مظفر حنفی ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی اردو کے ایک صاحبِ طرز و منفرد شاعر اور بلند پایہ نقاد ہیں اور ان کی اب تک کم و بیش ۵۰/کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو دنیا میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک مقام بنایا ہے۔

اس کتاب کی شکل میں شاد عارفی سے متعلق اردو کے ممتاز شعراء، ادباء اور ناقدینِ ادب کی تحریروں کا ایک حسین اور معنی خیز گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے حصۂ اول میں شاد صاحب کے فن اور شخصیت پر مضامین، نقد پارے اور مشاہیرِ ادب کی تحریروں سے اقتباسات شائع کیے گئے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ باقیاتِ شاد عارفی پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر مظفر حنفی نے ”کلیاتِ شاد عارفی“ ”ایک تھا شاعر“ اور شاد عارفی - فن اور شخصیت“ میں اپنے استاد کی شعری و نثری نگارشات یکجا کر کے شائع کی تھیں۔ تقریباً ۷۰/صفحات پر مشتمل مکتوباتِ شاد کے علاوہ ان کے ۳/مضامین، ۱۴/نظمیں، ۷/گیت، ۶۲/رباعیات اور ۳۱/غزلیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ متفرق اشعار بھی شائع کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔

شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر مظفر حنفی کا مرتب کردہ مضامین کا پہلا مجموعہ ”ایک تھا شاعر“ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں مرتب نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ شاد عارفی مرحوم اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جیسے کہ وہ اصلاً تھے ویسے کے ویسے کتابی شکل میں محفوظ ہو جائیں۔ پیش نظر کتاب ”شاد عارفی.......ایک مطالعہ“ بھی اسی غیر جانبدارانہ اصول کے تحت ترتیب دی گئی ہے جس میں شاد صاحب کی بشری کمزوریوں کو قبول کرنے کے بعد ان کی اصل تصویر کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی نے بجا طور پر اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ: ”اس مجموعے میں شامل پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، بلراج کومل اور چند دوسرے اہل قلم کی نگارشات یا شاد عارفی کی بعض تحریروں کو معروضیت کے اسی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے کہ یہ بہر طور اس اہم فن کار کی اصل اور سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش ہے۔“

شاد عارفی اردو کے ایک صاحبِ طرز اور بے مثل طنز نگار تھے اور ان کا شعری و ادبی سرمایہ اردو زبان و ادب کے لیے ایک متاعِ بے بہا ہے۔ وہ ایک نڈر اور جرات مند شاعر تھے اور اپنے منفرد اندازِ سخن کے باعث اردو

کے دیگر شاعروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے عمیق حنفی کی زبان میں:

''شاد عارفی رام پور کی روایت پسند مٹی سے برقِ غضبناک بن کر اٹھے اور آسمانِ سخن کے دامن بجلیوں سے بھر گئے۔ میں نے جب اردو شاعری کا مطالعہ سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ شروع کیا تو یگانہ اور شاد عارفی نے مجھے اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں جدت، بغاوت، تجربے اور ندرتِ ادا کے امکانات کا قائل کیا اور وہ غزل جو کوٹھوں، خانقاہوں، درباروں اور بازاروں کی رونق تھی پہلی بار گھریلو مگر سوشل، حاضر دماغ، ذی فہم، ذی علم، ذہین اور باشعور خاتون نظر آئی۔''

اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین ان مشاہیر شعراء و ادباء کی نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر مرقوم ہوئے ہیں جن کی ادبی وتنقیدی حیثیتوں کی پوری اردو دنیا معترف ہے۔ حفیظ جالندھری، ضیا احمد بدایونی، میرا جی، فرمان فتح پوری، اختر انصاری، بلراج کومل، آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ کے مضامین شاد صاحب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بعض تحریریں جن کا نکتۂ نظر معروضی ہے ان میں بھی جہاں شاد صاحب کے خیالات سے اختلافات کے گوشے نکالے گئے ہیں وہیں ان کی علمیت اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے: ''شاد عارفی بہر حال ایک عہد ساز شاعر تھے۔ ان کے بعد آنے والے ہر شاعر اور علی الخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ زمانے نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی۔''

فاروقی آگے لکھتے ہیں:-

''اردو شاعر کی یہ بدنصیبی ہے کہ جب تک وہ کسی سیاسی یا تہذیبی ادارہ سے منسلک نہ ہو، اس کی قدر شناسی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ شاد صاحب کو دونوں طرح کی محرومیاں ملیں۔ نہ گھر کے فارغ البال اور خوش وخرم اور نہ ادبی دنیا میں باقاعدہ اور حسبِ مرتبہ قدر ومنزلت لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری میں یہ دم خم، یہ تیور اور یہ اکھڑ پن نہ ہوتا۔''

زیرِ نظر کتاب میں شامل شاد صاحب کے مضامین بھی دعوت فکر دیتے ہیں۔ خصوصاً ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' ایک غور طلب مضمون ہے اور اس سے شاد صاحب کے منفرد نکتۂ نظر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ مکاتیب کا حصہ کافی وقیع ہے۔ بعض ایسے خطوط بے حد معلومات افروز ہیں جن میں ادبی ونظریاتی مسائل سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

شاد عارفی نے نہایت کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزاری اور انھیں حسبِ مرتبہ قدر ومنزلت بھی نہیں ملی، اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک خوش قسمت شاعر تھے جنھیں مظفر حنفی جیسا شاگرد مل گیا۔ غالب کے عہد میں غالب کو بھی حسبِ مرتبہ قدر ومنزلت نہیں ملی تھی جس کے وہ حقدار تھے مگر حالؔی نے ''یادگارِ غالب'' لکھ کر غالب کو امر کر دیا۔ اس طرح پروفیسر مظفر حنفی لائقِ ستائش ہیں کہ انھوں نے حالی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

فاروق ارگلی (دہلی)

اُردو کا جامِ جہاں نما...... پروفیسر مظفؔر حنفی

اس احساسِ تفاخر کی دولت مجھ جیسے علم و ادب کے ادنیٰ طالبِ علم سے واقعی سنبھالے نہیں سنبھلتی کہ آنے والی نسلیں اس پر اس لئے ناز کریں گی کہ ان آنکھوں نے اُردو زبان و ادب کے ان چراغوں کو جگمگ کرتے دیکھا ہے جن کی تنویریں لازوال ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے قلمروِ فکر و ادراک پر متعدد فرماں روایانِ علم و ہنر کی علمداری ہے، ذہن وشعور کے طلسم آباد میں فسوں گرانِ شعر وسخن کے جادوئی پیکر رقصاں ہیں، نگارستانِ آگہی میں زندہ وتابندہ متحرک وفعال خوش قامت مرقعے آویزاں ہیں۔ ہر چہرہ اپنے اپنے خال وخد سے ممتاز ومتفخر۔

علم و ادب کے ان درخشندہ وتابندہ چہروں میں ایک نمایاں چہرہ ہے اس ساحرِ حرف ونوا، جس کی سحر بیانی برس ہا برس سے لاکھوں کے سر چڑھ کر بول رہی ہے اور جسے اُردو دنیا مظفؔر حنفی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

پروفیسر مظفؔر حنفی (ہسوی) معاصر اُردو ادب کی ایک ایسی ہزار رخی شخصیت ہیں جن کے علمی، فکری اور فنی پھیلاؤ کا ذکر اخبار کے اس ایک صفحے میں یوں ممکن نہیں کہ دریا کو کوزے میں سمو دینے کا ادعا ہے نہ استطاعت، یوں بھی جناب مظفؔر حنفی کے ذاکروں کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ موصوف بیک وقت شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، ادبی صحافی ہیں، محقق، ناود اور مبصر ہیں، ماہرِ نصابیات وکتابیات ہیں، غیر زبانوں کے مترجم ہیں، ہندوی دیومالا اور اساطیری ادب میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، بہترین مقرر ہیں اور مذاکروں اور مباحثوں میں اپنی قوتِ استدلال اور طلاقتِ لسانی سے دھاک جما لینے جیسی ان گنت خوبیاں کہ ہر خوبی ایک مکمل کتاب کی متقاضی ہے۔

پروفیسر مظفؔر حنفی کا آبائی وطن کانپور اور الہ آباد کے درمیان واقع اتر پردیش کے ضلع فتح پور کا مردم خیز قصبہ ہسوہ ہے۔ ان کے والد سرکاری ملازمت کے سلسلے میں طویل عرصہ تک مدھیہ پردیش میں رہے جہاں قصبہ کھنڈوہ میں یکم اپریل 1936ء کو محمد ابوالمظفر، مظفؔر حنفی کی ولادت ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم کھنڈوہ میں ہی ہوئی۔ ان کو والد اگرچہ مازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن ہسوہ آگئے لیکن مظفر صاحب کے چچا کا وہاں کاروبار جم گیا تھا اس لئے کھنڈوہ سے ان کا تعلق برقرار رہا۔ فتح پور سے آٹھویں جماعت پاس کر کے مزید تعلیم کے لئے کھنڈوہ آگئے۔ 1952ء میں ناگپور سے ہائر سیکنڈری سرٹیفکیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا جس میں اُردو زبان نصابِ تعلیم کا حصہ نہیں تھی لیکن اُردو کتابوں اور جریدوں کے بے پناہ شوقِ مطالعہ نے انھیں اسی عمر میں صاحبِ قلم بنا دیا اور وہ بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ بعد میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ وہ پھر ہسوہ واپس آئے اور فتح

پور کے گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ یہ تعلیمی سلسلہ بھی مزید آگے تو نہیں بڑھ سکا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ جامعہ اُردو کے امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ اسی وسیلے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کی سند حاصل کی۔ یہ دَور اُن کے لئے سخت آزمائشوں کا تھا۔ 1955ء میں انھیں محکمہ تعلیم مدھیہ پردیش میں ٹیچر کی مازمت مل گئی اور وہ سیہور کے مڈل اسکول میں تعینات ہوئے۔ اب تک ان کا لکھنے کا شوق اور علم وادب سے جنون کی حد تک وابستگی شباب پر آ چکی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے چچا زاد بھائی نے کھنڈوہ بلوالیا کیوں کہ کاروبار سنبھالنے کے لئے انھیں ان سے بہتر اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً بھائی کے بڑے کاروبار سے جڑ کے ان کے لئے دنیوی ترقی کے نئے راستے کھل سکتے تھے لیکن شعروسخن اور علم وادب سے روحانی لگاؤ نے ان کی راہ پہلے ہی متعین کر دی تھی۔ 1959ء میں انھوں نے کھنڈوہ سے ماہنامہ ''نئے چراغ'' جاری کیا۔ چند ماہ میں ہی اس رسالے کا شمار اُردو دنیا کے اہم ادبی جرائد میں ہونے لگا۔ اب تک ہندوستان میں متعدد ادبی رسالے نکلے اور بند ہوئے لیکن کھنڈوہ جیسے غیر اُردو علاقے سے شائع ہونے والے ''نئے چراغ'' اور الہ آباد سے نکلنے والے جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ماہنامہ ''شب خون'' کو بطورِ خاص قابلِ ذکر تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ''نئے چراغ'' کی تعمیری ذہن سازی اور مثبت ادبی اقدار و روایات کے فروغ کی کامیاب مساعی کی پسندیدگی اور مقبولیت کے آٹھ سال بعد ''شب خون'' منظرِ عام پر آیا جو ایک خون آشام غنیم کی طرح ادب کی مروجہ روایات اور اقدار پر شب خون مار کر نئے پن کی تلاش میں حدوں سے تجاوز کر جانے اور بانی جریدہ کی فکری انانیت کے مظاہروں کے لئے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

مظفؔر حنفی (ہسوی) نے حالات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ وہ ایک اچھے کہانی کار اور شاعر کی حیثیت سے مشہور بھی ہونے لگے تھے مگر زورِ بیان و جوشِ اظہار کے لئے کچھ اور وسعت درکار تھی۔ شاعری کی طرف توجہ کی، یہ رجحان اس حد تک بڑھا کہ استاد شاعر حضرت شاؔد عارفی سے مرسلاتی تلمذ اختیار کیا۔ سخن آرائی کا زردار آغاز استاد کے رنگ و آہنگ میں کیا مگر ذہنِ رسا اور جودتِ طبع نے بہت جلد اپنا الگ راستہ بنا لیا اور ایک قادرالکلام سخن ور کے طور پر اپنی جگہ بنا لی۔ انھوں نے جو کہا وہ دلوں میں اتر گیا۔ شاعری اور افسانہ نگاری، صحافت اور مضمون آرائی جیسے وجدانی مشاغل کے ساتھ ساتھ انھوں نے بی اے اور پھر ایم اے کی سند حاصل کی۔ اُردو، ہندی اور انگریزی ادبیات کے عمیق مطالعے نے ان کی تخلیقی قوتوں کو بالیدگی عطا کی۔ علم و آگہی کی دولت سمیٹ لینے کی للک نے تحقیق کی طرف مائل کیا تو اپنے استاد علامہ شاؔد عارفی کے لئے جیسے غالؔب کے حاؔلی بن گئے۔ شاؔد عارفی کی فکری و فنی جہات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے اس یونیورسٹی کے اولین ریسرچ اسکالر بن گئے۔

مظفؔر حنفی کا عملی و تحقیقی سفر ایک جہدِ مسلسل ہے۔ لیکن حالات سے جنگ اور ذوق وشوق کی تکمیل کے ہر معرکے میں فتح وظفر نے ان کے نام ''ابوالمظفر'' کی لاج رکھی ہے۔ علم وادب کی خارزار راہوں اور سنگلاخ چٹانوں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے ان کے قدم آگے اور مزید آگے ہی بڑھتے گئے۔ انھوں نے افسانے لکھے،

بچوں کی کہانیاں اور ناول لکھے، ہندی، انگریزی، اڑیا اور بنگالی شہپاروں کے کامیاب اور مقبول تراجم کیے۔ ہندوؤں کے مذہبی اور دیو مالائی اساطیری ادب کو اُردو کا لباس پہنایا۔ مشہور عالم روسی ادیب الیگزنڈر سولزنسٹن کی شہرۂ آفاق کتاب گلاگ جمع الجزائر کا ترجمہ کر کے اُردو کے خزانے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ مظفؔر حنفی نے اُردو تنقید میں منصفی، وسیع القلبی، دیانت داری اور غیر جانب داری کی روایات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ تحقیق کے میدان میں ان کا عدیم النظیر کارنامہ علامہ شاؔد عارفی کے فن کی سچی شناخت ہے۔ استادِ معظم کی رحلت کے بعد ان کے کلام کی تدوین واشاعت جس عقیدت اور محبت کا ساتھ مظفؔر حنفی صاحب نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن مثنوی ''سحر البیان'' کے خالق میر حسن کی غزل گوئی کو اہمیت اور معنویت عطا کرنے کا سہرا بھی انہی کے تحقیقی جذبے کے سر ہے۔ میر حسن کی غزل اپنے معاصر شعراء سے کسی طرح کم نہیں جب کہ سحر البیان کی لافانی شہرت نے اس پر خاصے دبیز پردے ڈال دیئے تھے۔

1974ء میں انھیں پی ایچ ڈی کی سند حاصل ہوئی تھی جس کے بعد نیشنل کونسل آف ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) میں بطور اسسٹنٹ پروڈکشن آفیسر (اُردو) ان کا تقرر ہو گیا جہاں دو برسوں تک اُردو نصابیات کی تیاری میں قابلِ ذکر خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لیکچرار اور پھر ریڈر کے منصب پر فائز ہوئے۔ یہاں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایسوسی ایٹس شپ کے لئے کلیاتِ میرؔ پر تحقیقی کام کے لئے انھیں منتخب کیا گیا۔ اس دوران انھوں نے روسی دانشور سخاروف کی کتاب ''سخاروف نے کہا'' اُردو زبان میں منتقل کرنے کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ نامور نقاد اور محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہمراہ ''وضاحتی کتابیات'' کے وقیع منصوبے کا آغاز کیا جس کی پہلی جلد 1980ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس تاریخ ساز دستاویزی سلسلے کی دو درجن سے زائد جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ جناب مظفؔر حنفی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تنقیدی ابعاد'' اپنے تعمیری، تنقیدی رویوں اور ناقدین کی صحت مند و مدلل گرفت کے لئے اُردو تنقید کی تاریخ میں مایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ اُردو غزل کے ارتقائی سفر کی عملی تفہیم کے لئے انھوں نے ''روحِ غزل'' کے عنوان سے گزشتہ نصف صدی کے چھ سو سے زائد مقتدر شعراء کا انتخاب مرتب کر کے نہ صرف اُردو ادبیات کے طلباء اور شائقین غزل ہی کے لئے مفید علمی وسیلہ فراہم کیا ہے بلکہ اُردو غزل پر کام کرنے والے محققین کی راہ بھی آسان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندی کے کلاسیکی وطن پرست شاعر بھارتیندو ہریش چندر کی شخصیت اور شاعری کو اُردو لباس پہنا کر بھی اُردو کو مالا مال کیا۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی نے شائع کی ہے۔ پروفیسر مظفؔر حنفی اپنے طلباء کی علمی رہنمائی کے لئے ہمیشہ پرخلوص اور سرگرم رہے ہیں۔ ان کی نگرانی میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر خوشحال زیدی اور ڈاکٹر خالد محمود جیسے متعدد معروف ریسرچ اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔

1989ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے سبکدوش ہونے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کی اقبال چیئر میں بطور سینئر پروفیسر ان کا تقرر ہوا جہاں ان کی خدمات یونیورسٹی کی تاریخ کا اہم حصہ بن گئیں۔ اس قدر مصروف اور سرگرم زندگی کے ساتھ ساتھ مظفؔر صاحب نے اپنا شعری سفر جس تخلیقی تسلسل کے ساتھ جاری رکھا ہے وہ انھیں نہ صرف ہم چشموں اور ہم

عصروں میں ممتاز کرتا ہے بلکہ ایک عہد آفریں شاعر کی حیثیت سے ان کی شخصیت کو اس درجہ نمایاں کرتا ہے کہ ان کا ثانی بہ ہزار کوشش بھی تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

دو ہزار سے زائد غزلوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ سخن میں پورے فنی وفکری اجتہاد، جدت طرازی، غیر معمولی قوتِ مشاہدہ، انفرادی اسلوب اور شعر اقدار و روایات کی پاسداری کے ساتھ طبع آزمائی دنیائے اُردو کے سخن شناسوں کی نظر میں کھری اور یجنل تخلیقی شاعر کا درجہ پہلے ہی حاصل کر چکی ہے۔ اپنے حسنِ بیان، لفظیات، رفعتِ فکر و نگاہ، فنی اجتہاد اور غزل کی نرم و نازک پنکھڑیوں میں ہیرے کے جگر کو کاٹ دینے والی تیز دھار پیدا کرنے والے مظفؔر حنفی کا کلام سنتے اور پڑھتے ہوئے یہ خیال اکثر سر اٹھانے لگتا ہے کہ مظفؔر حنفی کی تعلیمی، تنقیدی اور تخلیقی کامرانیوں اور شہرتوں نے ان کی شاعرانہ عظمتوں کو نقصان ضرور پہنچایا ہے لیکن ان کی شاعری کا کوئی بھی باشعور سامع یا قاری یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مظفؔر حنفی کی شاعری کا دائرۂ اثر مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا اور ایک دن وہ پورے عصری اُردو ادب کو اپنے حصار میں لے لے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی شاعر مظفؔر حنفی کی پرت در پرت جہتوں کی دریافت اور شناخت کا کام ہونا باقی ہے۔

عہدِ حاضر کے مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں، ''مظفؔر حنفی کی غزل نے محض ایک موضوع یا واقعات کے کسی ایک سلسلہ تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ ان کے ہاں بیک وقت سوچ کے کئی سلسلے کارفرما نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیاسی اور معاشرتی جبر کا موضوع لیجئے جو جدید اُردو غزل گو شاعر کے ہاں مقبول ہوا ہے مگر عام طور پر اس نے یا تو نظریاتی سطح اختیار کر کر کسی ایک سیاسی، مذہبی یا معاشرتی نظریے کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کیے یا پھر آمرانہ عصبیت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔''

پروفیسر مظفؔر حنفی اب 73 کے پیٹے میں ہیں لیکن بحمد اللہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر نوجوانوں کی طرح چاق و چوبند ہیں۔ ان کے قلم کی روانی اور فکر کی جولانی میں ابھی تک کوئی واضح کمی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی ریاضتوں اور محنتوں کی جس طرح پذیرائی ہوئی، اُردو دنیا انھیں جس طرح سر آنکھوں پر بٹھایا، بڑے بڑے اداروں نے انھیں لاتعداد اعزازات و انعامات سے نوازا۔ ان کی اکثر کتابیں یونیورسٹی میں پڑھائی جا رہی ہیں۔ ان سب کامیابیوں کو وہ عطائے ایزدی قرار دیتے ہیں۔ اب تمام منصبی ذمہ داریوں سے انھیں فراغت حاصل ہے۔ انھوں نے ہر دم جواں، پیہم رواں زندگی گزاری ہے۔ انھیں ایسی نیک بخت شریکِ حیات ملیں جو قدم قدم پر اُن کا سہارا بنیں۔ پانچ لائق بیٹے، جن میں تین انجینئر، ایک تعمیراتی فرم کے مالک اور ایک برطانیہ میں بڑے عہدے پر فائز، ایک دخترِ نیک اختر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر، ناتی پوتوں سے بھرے پرے کنبے کے سربراہ پروفیسر مظفؔر حنفی کی ذاتِ گرامی بجائے خود اپر دو کا ایک ایسا ''جامِ جہاں نما'' ہے جس میں ہر وہ رنگ و آہنگ دیکھا اور سنا جا سکتا ہے جس سے ہماری تمام تر علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی قدریں عبارت ہیں۔

ان کی 73 ویں سالگرہ پر سہارا خاندان اور اُردو دنیا کے لاکھوں تشنگانِ علم و ادب کی پر خلوص دعائیں!

پروفیسر مظفؔر حنفی (دہلی)

ہمارے مشاعرے

کوئی صاحبِ فہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مشاعروں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اور انھیں مقبولِ عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ ہمارے کردار و شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں، ہماری تہذیب و ثقافت کو مالا مال کرنے میں اور ہماری تحریکِ آزادی کے رگ و ریشے تک پیوست کرنے میں مشاعروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ انیسوی صدی سے پیشتر ہندوستان میں طباعت کا رواج نہیں کے برابر تھا اور پریس عنقا تھے۔ ظاہر ہے کہ قلمی نسخے معدودے چند ہی تیار کیے جا سکتے تھے اور وہ نوابین اور امراء کے کتب خانوں کی زینت بن کر رہ جاتے تھے۔ چنانچہ کلامِ شاعر کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ، صرف اور صرف مشاعرے ہو سکتے تھے۔ کم و بیش ۱۸۵۷ء تک مشاعرے ہی وہ علمی و ادبی مراکز تھے جہاں سے صفائیِ زبان اور اصلاحِ ادب کی چھوٹی بڑی تحریکات کو فروغ ملا۔ ابتدا ہی سے ان مشاعروں میں آزادیِ فکر اور جرأتِ اظہار کی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جن میں کبھی میرؔ اس حکمرانِ وقت سے جس کے وظیفہ یاب تھے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے ہیں تو غالبؔ دربارِ شاہی میں بابانگِ دُہل کہتے ہیں کہ....

ع ''اِک کھیل ہے اورنگِ سلیمان مرے نزدیک''۔ شاعروں کی اپنی ذات بھی اس تنقید و احتساب سے بَری نہیں تھی۔ ہما شما کا ذکر نہیں، میرؔ جیسے عظیم شاعر اور غالبؔ جیسے بلند مرتب فنکار پر بھی تنقید ہوئی اور برسرِ مشاعرہ ہوئی تبھی تو میرؔ نے جھلاّ کر کہا تھا۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور غالب نے جواب دیا تھا:

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور شعراء کے بے شمار تذکروں سے لے کر ''نقوش'' (لاہور) کے ادبی معرکے نمبر اور یعقوب عامر کے تخلیقی مقالے تک مختلف ادوار کے سخن گویوں کے مابین ادبی نبرد آزمائیوں کی داستانیں دیکھ جائیے، یہ سارے ڈرامے مشاعرے کے اسٹیج پر کھیلے گئے۔ سوداؔ اور ضاحکؔ یا انشاؔء اور مصحفیؔ کے درمیان کچھ ناشائستہ باتیں بھی ہوئیں

لیکن بیشتر معرکے جن میں آتش و ناسخ، دبیر و انیس، غالب و ذوق، چکبست و شرر، میر و داغ، یگانہ و ناطق، شاد عارفی و ابر احسنی جیسے ادبی سورما باہم نبرد آزما نظر آتے ہیں، زبان و بیان کی ایسی ایسی لطافتوں اور نزاکتوں سے پردے ہٹائے جاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ برسرِ مشاعرہ کیے جانے والے اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا خوف بڑے بڑے اساتذہ کو بھی سہل پسندی اور آسان روی سے باز رکھتا تھا۔ ابھی چند دہائیوں پہلے کی ہی بات ہے کہ بیخود دہلوی نے اپنے استاد بھائی نواب سائل دہلوی کو کسی رعایت کے بغیر ایک مشاعرے میں ٹوکا تھا کہ ان کے مطلع میں لفظ 'سی' کا استعمال نا مناسب ہے اور یگانہ کی جرأتِ رندانہ کا بھی جواب نہیں جنھوں نے بھری بزمِ سخن میں ایک نامور استاد کو لقمہ دیا تھا کہ ''حضّت! ایطا پر نگاہ کیجیے۔'' استاد بالآخر استاد تھے۔ فوراً دوسرا مطلع کہہ ڈالا اور یگانہ چیخ کر بولے۔ ''ایطا پہلے نہیں تھا۔ اب صادر ہوا۔ اساتذہ کو خود اعتمادی کے ساتھ اپنے کلام کا دفاع کرنا چاہیے''.... جب صورتِ حال یہ ہو تو شاعر اپنے کلام کو بار بار مانجھنے کے بعد ہی مشاعرے میں لب کشائی کی جرأت کرتے تھے اور مبتدی کسی مستند اور معتبر استاد کی اصلاح کے بغیر مشاعرے میں شرکت کا تصوّر تک نہیں کر سکتے تھے۔ آزادیِ ہند سے پیشتر تک عام طور پر طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ غالباً اس سلسلے کا قابلِ ذکر آخری طرحی مشاعرہ علامہ نیاز فتح پوری نے چار مختلف شہروں میں ۱۹۵۶ء کے آس پاس منعقد کیا تھا۔ طرح غالب کا یہ مصرعہ تھا ع

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے

اہلِ نظر بخوبی واقف ہیں کہ طرحی مصرعوں میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اساتذہ اور مختلف درجے کے شاعروں کو اپنے ہم عصروں سے مسابقت اور بازی لے جانے کا خیال رہتا ہے اور یہ فکر بھی لاحق ہوتی ہے کہ معدودے چند قوافی میں درجنوں سخنور شعر کہنے والے ہیں۔ اس لیے سرسری قافیہ پیمائی کی جگہ جانکاہی اور جاں فشانی کے ساتھ کوئی نہایت نازک اور نادر خیال برجستگی اور لطافت کے ساتھ نظم کیا جائے جس میں کوئی عروضی اور فنی سقم نہ ہو تبھی مشاعرے میں کامیابی ممکن ہے۔

ان مشاعروں میں شامل ہونے والے ماہرینِ فن، محض خامیوں پر گرفت ہی نہیں کرتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی گزری ہیں کہ کوئی نو مشق شاعر مطلع پڑھتا ہے اور محفل میں موجود بڑے بڑے استاد اسے داد دیتے ہوئے اپنی غزلیں چاک کر دیتے ہیں!

میر تقی میر کا مشہور شعر ہے ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

مشاعروں پر گفتگو کرتے ہوئے میں اس نکتے پر بہت زور دینا چاہتا ہوں کہ خواہ شاعر عوام کے لیے اور ان کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر شاعری کرتا ہو، اسے پسند کرنے والے خاص لوگ ہوں گے۔ سوچیے کہ پوری آبادی میں کتنے فیصد لوگ اردو جانتے ہیں۔ ان اردو دانوں میں کتنے فیصد لوگوں کو شعر و ادب اور پھر ان باذوق لوگوں میں سے کتنوں میں وہ تنقیدی بصیرت اور نکتہ رسی پائی جاتی ہے جو اچھے اشعار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے

چنانچہ میر کا شعر سرسری نہیں غور کرنے کی چیز ہے ___ یہی سبب ہے کہ از ابتداء تا ۱۸۵۷ء مشاعرے مخصوص ادبی نشستوں کی سی حیثیت رکھتے تھے اور کبھی ایسے عوامی جلسوں نے جن میں ہزارہا افراد نے شرکت کی ہو، مشاعرے کی صورت اختیار نہیں کی۔ کبھی کبھار کسی باذوق بادشاہ نے دربار ہی میں شمعِ سخن روشن کر لی ہو تو اسے عوامی جلسے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ عام طور پر ایسی نشستیں کبھی میر تقی میر، خواجہ میر درد، مفتی آزردہ، نواب شیفتہ یا ایسے ہی اربابِ ادب کی جانب سے منعقد کی جاتی تھیں جن میں چنیدہ شاعروں کے علاوہ تھوڑے سے اعلیٰ ذوق رکھنے والے سامعین کو ہی باریابی کا موقع ملتا تھا۔ ان مشاعروں میں تفریح کا پہلو کم اور زبان و کردار کی ترقی پر توجہ زیادہ ہوتی تھی۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد قوم کی مرعوبیت اور شکست خوردگی کا احساس زائل کرنے کے لیے جہاں مختلف شعبہ ہائے حیات میں سر سید احمد خاں، ان کے رفقاء اور دیگر مصلحین نے مختلف اصلاحی تحریکات چلائیں، وہیں انجمن پنجاب جیسے ادارے بھی قائم کیے گئے اور مشاعرے کے وسیلے سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اصلاحی پیغامات پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ یہیں سے مخصوص نشستوں نے بڑے عوامی مشاعروں کا روپ اختیار کیا اور یہ سلسلہ آزادیِ ہند تک جاری رہا۔ چوں کہ اس وقت تک ادبی قدروں کے آشنا بزرگ موجود تھے اس لیے مشاعروں میں فنی نزاکتوں اور ادبی لطافتوں پر پوری توجہ دی جاتی رہی۔ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس وقت تک ایک معمولی اردو داں بھی آج کے مقابلے میں بہت زیادہ نکھرا ہوا ادبی شعور رکھتا تھا۔ گھروں میں بیگمات بامحاورہ ٹکسالی اردو بولتی تھیں اور یوپی کے دیہاتوں میں مڈل اسکول کے طلباء سے اشعار کی تقطیع کرائی جاتی تھی۔ ایسے میں بالغ نظر شعرا سے باذوق سامعین کی ذہنی ہم آہنگی برقرار رہنا فطری تھا۔

آزادی سے کچھ پیشتر ترقی پسند ادبی تحریک نے اردو کے شعر و ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ ان میں سے شاعری کا بڑا حصہ آزاد نظموں پر مشتمل تھا جو ظاہر ہے مشاعرے میں بہت کم پڑھی جاتی تھیں۔ لے دے کر واضح پیامیہ شاعری اسٹیج سے پیش کی جا سکتی تھی جس میں شاعرانہ خصوصیات سے زیادہ خطابت کے اوصاف پائے جاتے تھے۔ پھر بھی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک ہمارے مشاعروں کا معیار بلند رہا۔ ان میں ترنم سے پڑھنے والے حفیظ، جگر، ساغر، مجروح اور ماہر القادری جیسے شاعر بھی تھے اور تحت میں کلام سنانے والے یگانہ، فراق، جوش، سیماب اور فیض جیسے فن کار بھی۔ ترنم کو تو خیر عوام میں مقبول ہونا ہی تھا لیکن تحت میں پڑھنے والے شعراء کی مقبولیت بھی کسی طرح کم نہ تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ فراق کا ڈرامائی انداز اور جوش کی شخصی وجاہت اور لہجے کا کرارا پن سامعین کے لیے کشش کا سبب ہوں گے لیکن اس دور کے مقبول شعراء میں حسرت بھی شامل تھے جن کی ظاہری شخصیت معمولی اور آواز میں منمناہٹ تھی۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اس دور تک اچھی اور سچی شاعری کسی دوسری بیساکھی کے بغیر عوام میں اس لیے پسند کی جاتی تھی کہ سننے والے فنی نزاکتوں سے واقف تھے اور اکثر فراق، شاد عارفی اور یگانہ جیسے تنک مزاج شاعروں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کر لیتے تھے۔

دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں یہ وقت اردو زبان و ادب کے لیے ابتلا اور انتشار کا ہے۔ رفتہ رفتہ پچھلے اردو جاننے والے کم ہوتے گئے اور نئی نسلیں اردو سے بیگانہ ہوتی گئیں، خصوصاً یوپی اور بہار میں جو اردو کے

مرکزی علاقے تھے اور اس کے نتیجے میں اردو بولنے والوں میں سخن شناسی اور نکتہ سنجی کے اوصاف گھٹتے گئے۔ جب اچھا شعر سمجھنے کی استعداد نہ ہو یا کم ہو تو سپاٹ اور یک رخے شعرا اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس پر ترنم کا اضافہ ہو جائے تو کیا کہنے۔ بعض لوگ ترنم کی جگہ اپنے ڈرامائی انداز سے کام چلانے لگے۔ مزید برآں مشاعرے میں مفاد پرستی عام ہو گئی۔

ذرا غور کیجیے مشاعرے میں اگر کوئی شعر ترنم سے بھی پڑھا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ تیس سکنڈ میں شعر مکمل ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سے وقفے میں کسی گہرے اور تہہ دار شعر کو بے حد ذہین اور سخن فہم لوگ ہی سمجھ کر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ کم ذوق اور بے عیار سامع تو محض آواز کی دلکشی اور پیش کش کے انداز کی داد ہی دے سکتا ہے۔ ضرورت زندگی کے ہر شعبے اور ہر دور میں ایجاد کی ماں رہی ہے۔ بیان کردہ حالات کی روشنی میں ملک کے گوشے گوشے میں ایسے افراد اور انجمنوں نے مشاعروں کے ٹھیکے لے لیے جو چندے یا ٹکٹ کے ذریعے عوام سے خوب پیسہ وصول کرتے ہیں اور ان کی سطحی پسند پر پورے اترنے والے شاعروں کو بڑے بڑے معاوضے دے کر مشاعروں میں مدعو کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہلکے پھلکے انداز میں اکثر خارج از بحر اور اغلاط سے پُر شعروں میں ہم عصر ادبی شعراء کی جگالی کرنے والے پیشہ ور شاعروں اور شاعرات کی پوری کھیپ منظر عام پر آ گئی جو آواز، اداکاری اور معمولی تک بندی کے بل پر مشاعروں میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑنے لگی اور سامعین بھی مشاعروں کو ویسی دلچسپی کے ساتھ سننے اور دیکھنے لگے جیسے کہ قوالی یا مجرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں! ان میں کچھ لوگ دوسروں سے لکھواتے ہیں تو کچھ ہندی میں لکھ کر لاتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے پیشہ ور گلوکاروں اور اداکاروں کی ٹولیوں نے اپنے اپنے ناظم اور نقیب بھی طے کر لیے جو مشاعروں میں اپنے جرگے کے شاعر یا شاعرہ کو بڑھانے کا ہر نسخہ استعمال کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے سخن ور کو کبھی فحش لطیفوں کی باڑھ پر رکھ لیتے ہیں تو کبھی اسی موضوع پر بہت سے شعر سنا کر شاعر کی مقبولیت کو کم کر دیتے ہیں۔ شاعرات اسٹیج پر جتنی سطحیت کا مظاہرہ کرتی ہیں، سنجیدہ طبیعتیں اسے دیکھ کر بدحظ ہوتی ہیں لیکن بازاری مذاق کے ناظرین کے لیے یہ سب کچھ باعثِ لطف ہوتا ہے۔ پھر مزاح کے نام پر جس بد مذاقی اور بھونڈے پن کا مشاعروں میں مظاہرہ کیا جاتا ہے، اہلِ نظر اس سے بخوبی واقف ہیں۔ شاعر اکثر لمبی چوڑی تقریر کے ذریعے معمولی شعر کو اہم ثابت کرتا ہے اور داد کی بھیک مانگتا ہے۔ شعر اوریجنل ہے یا سرقے کا، یہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ماضی بعید و قریب میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ مشاعرے اور ادب کے شاعر الگ الگ رہے ہوں۔ جگرؔ، فراقؔ، مجازؔ، مجروحؔ، ساغرؔ اور جوشؔ کبھی بیک وقت مشاعروں میں بھی مشغول تھے اور ناقدینِ ادب کی نگاہوں میں بھی محترم تھے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مشاعرے کے بیشتر شعرا و شاعرات کے ناموں سے ہمارے نقاد واقفیت تک نہیں، نہ ان کا کلام کسی رسالے یا انتخاب میں جگہ پاتا ہے اور مشاعروں میں بھی یہی صورت حال ہے کہ وہاں کبھی ایک آدھ ادبی شاعر غلطی سے مدعو کر لیا جاتا ہے تو پہلے تو گرگِ باراں دیدہ نقیبِ مشاعرہ ہی اسے عجیب و

غریب انداز میں کسی بے حد مترنم شاعر، کسی خوبرو شاعرہ یا کسی قہقہہ بردوش مزاحیہ شاعر کے بعد دادِ سخن دے کر دانستہ ہوٹ کراتا ہے۔ اور یہ سب نہ بھی ہو تو عوام کی بے ذوقی خود ادبی شاعر سے بے اعتنائی برتتی ہے۔

چند برس پیشتر بھوپال میں اردو اکادمی مدھیہ پردیش نے ایک ادبی نشست رکھی تھی۔ کچھ لوگ بضد تھے کہ شہریار اپنی وہ غزل سنائیں جو ایک فلم میں استعمال ہوئی تھی۔ شہریار کو تکلف تھا لیکن میری سفارش پر انھوں نے وہ غزل سنائی اور جم کر ہوٹ ہوئے۔ ظاہر ہے ان کے پاس نہ گلوکار کی آواز تھی اور نہ سازندے موجود تھے۔ اسی طرح جامعہ کے ایک جلسے میں فیضؔ صاحب نے بتایا کہ پاکستان میں اکثر لوگ ان سے فرمائش کرتے ہیں کہ مہدی حسن کی غزلیں سنائیں۔ فیض صاحب کے ذکر پر ایک واقعہ یاد آیا جسے ابھی کچھ دن پہلے مشاعروں کے مقبول ناظم ملک زادہ منظور احمد نے مجھے بطور لطیفہ سنایا تھا۔ وہ فیض مرحوم کے آخری دن تھے اور موصوف کسی ایسے مشاعرے میں شریک تھے جس کی نظامت ملک زادہ موصوف کر رہے تھے۔ بقول ان کے فیض صاحب کا حوالہ دے کر انھوں نے مشاعرے کے سامعین کو رات کے تین بجے تک روکے رکھا تھا لیکن ابھی فیضؔ نے اپنی نظم شروع ہی کی تھی کہ پنڈال سننے والوں سے خالی ہو گیا۔ لطیفہ سن کر میں نے عرض کیا تھا کہ اس پر تو ہنسنے کی جگہ ماتم کرنا چاہیے۔

اس سب کے باوجود میں نہ مشاعرے کی اہمیت اور افادیت کا یکسر منکر ہوں نہ اس کے مستقبل سے مایوس۔ اس موثر اور بے حد طاقتور ادارے کی ابتری کا سبب منتظمین کی خود غرضی اور پیشہ وروں کی سطحیت ہے۔ اگر اچھا ادبی ذوق رکھنے والی انجمنیں اور عوام کے نبض شناس ادبی شاعر مل کر کوشش کریں تو بہت جلد اصلاح ممکن ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادھر دس پندرہ برسوں سے اردو کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ سامعین کا ادبی مذاق بھی رفتہ رفتہ بلند ہوگا اور مشاعرہ اپنے بنیادی منصب کو پھر حاصل کر لے گا۔ ضرورت ہے کہ مشاعروں میں عوامی مقبولیت رکھنے والے صرف انھی شعرا کو بلایا جائے جو واقعی اچھی شاعری بھی کرتے ہیں۔ غیر موزوں یا مہمل شعر کہنے والے متشاعروں، نقالوں اور سرقہ بازوں، دوسروں سے لکھوا کر پڑھنے والوں اور اردو سے نابلد افراد کو خواہ وہ گلے بازی کے ماہر ہوں یا اداکاری میں کمال رکھتے ہوں، مشاعروں سے دور رکھا جائے۔ ان کے بجائے قد آور ادبی شخصیت رکھنے والے ہم عصر شاعروں کو بھی مدعو کیا جائے نیز نظامت ایسے ذہین افراد کے سپرد کی جائے جو لفّاظی، چرب زبانی یا لطیفہ گوئی کے سہارے ایسا سماں نہ باندھے کہ عوام شاعروں کو سننے کی جگہ اس کی لطیفہ بازی سننا زیادہ پسند کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہر مشاعرے کا ناظم اس علاقے سے ہی منتخب کیا جانا چاہیے جہاں مشاعرہ منعقد ہو۔ حالیؔ کا یہ شعر سامعین اور شعرائے کرام دونوں پر آج بھی صادق آتا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

مظفر حنفی (دہلی)

میں اٹھ گیا تو شورِ فغاں بھی نہیں اُٹھا
لیکن کرائے پر وہ مکاں بھی نہیں اٹھا
مذہب نہیں بتایا نہ امداد کی قبول
کشتی میں اک حبابِ رواں بھی نہیں اُٹھا
بستی جلانے والو تمھیں کیا بتاؤں میں
مدّت سے میرے گھر میں دھواں بھی نہیں اُٹھا
ہم دم بخود تھے اور ادھر لُٹ رہے تھے لوگ
جب ہم کٹے تو شور و ہاں بھی نہیں اُٹھا
بڑھتے ہوئے قدم کو نہیں روکتا کوئی
بیٹھا تو پھر قدم کا نشاں بھی نہیں اُٹھا

درد نے دل کو گدگدایا تو
کچھ شرارہ سا تلملایا تو
آپ دریا کے ساتھ جاتے ہیں
اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو
دیکھنا ، آسماں کی خیر نہیں
خاکساری نے سر اُٹھایا تو
شاخ کانٹوں بھری سہی لیکن
ہاتھ اس نے ادھر بڑھایا تو
کیوں اُٹھاتے ہو ریت کی دیوار
آگیا کوئی زیرِ سایہ تو
دُور تک لہریں کھِلکھِلانے لگیں
اک دِیا نہر میں بہایا تو

خدا وندا، یہ پابندی ہٹا کر خوش خرامی دے
کہ دریا سر کے بل جائے، سمندر کو سلامی دے
نہ ایسے سست ہوں بادل کہ فصلیں زرد ہوجائیں
نہ موجوں کو سنامی جیسی بے حد تیز گامی دے
میں شاعر ہوں، تمنّا ہے مجھے مقبول ہونے کی
مگر مقبولیت سے پہلے مجھ کو نیک نامی دے
مری حق گوئی خامی ہے خرد مندوں کی نظروں میں
یہ بے حد قیمتی خامی ہے مولا اور خامی دے
اگر درکار ہے تاثیر تجھ کو اپنے شعروں میں
انھیں رنگت مقامی دے انھیں لہجہ عوامی دے
مظفّر کیوں بہاروں میں بھی کانٹے سوکھ جاتے ہیں
کوئی موسم انھیں بھی شادمانی شادکامی دے

بہانہ وفا کا نکالا گیا
بہت خون میرا نکالا گیا
شرارے اُچھلتے رہے سنگ سے
چٹانوں سے دریا نکالا گیا
مرا زخم بڑھ جائے گا اور کچھ
اگر اب یہ نیزا نکالا گیا
بغاوت نہیں دب سکے گی حضور
جو کانٹے سے کانٹا نکالا گیا
ٹپکتی تھی دنیا مرے پاؤں میں
بمشکل یہ چھالا نکالا گیا
محبت سے وہ باز آئے نہیں
تو بستی سے کنبہ نکالا گیا

مظفر حنفی

اک ستارہ ہے جو بیدار کیا کرتا ہے
رات بھر تذکرۂ یار کیا کرتا ہے
بیٹھنے پاتے نہیں سایۂ دیوار میں ہم
کوئی گریہ پسِ دیوار کیا کرتا ہے
وہ بھڑکتا ہے مرے سینے میں شعلے جیسا
پھر اسی آگ کو گلزار کیا کرتا ہے
اک ناسور ہے احساس میں حق تلفی کا
جو مری ذات کو مسمار کیا کرتا ہے
بادباں کھول کے دیکھو تو سفینے والو
خشک دریابہت اصرار کیا کرتا ہے
کوئی خوشبو کی طرح نام ترا لے لے کر
پھول کے کان میں گنجار کیا کرتا ہے
اُس کو ارمان تھا اڑنے کا مظفّر، لیکن
اب پرندوں کو گرفتار کیا کرتا ہے

چراغ اپنے ہوا دینے سے پہلے
جلانے تھے بجھا دینے سے پہلے
میاں کیا لازمی تھا خاک اُڑانا
کسی کو راستا دینے سے پہلے
نسیمِ صبح کو آیا پسینہ
خزاں کو بد دعا دینے سے پہلے
ملا سکتے ہو کیا ہم سے نگاہیں
بغاوت کی سزا دینے سے پہلے
مناسب ہے کہ پڑھ لی جائے تختی
کسی در پر صدا دینے سے پہلے
ہمارا ہارنا طے ہو چکا تھا
تمھارے ہاتھ اٹھا دینے سے پہلے
سخی مشہور تھے ہم بھی مظفّر
مگر سب کچھ لٹا دینے سے پہلے

مر جائے کوئی ان کو غم نئیں ہونا
اُن دو قاتل آنکھوں میں نم نئیں ہونا
پٹتا ہے تو لاشوں سے پٹ جانے دو
دیکھو اس کوچے میں ماتم نئیں ہونا
کالا بادل گھور نراشا کا ہوں میں
پیارے تم بھی بجلی سے کم نئیں ہونا
جنگل کا قانون چلے گا سنتے ہیں
بستی میں اب آدم وادم نئیں ہونا
ہم بھی استقبال کو جانے والے تھے
وہ کہتا ہے کالا پرچم نئیں ہونا
قطرہ ہوں تو شبنم جیسے جی لوں گا
لوگو مجھ کو دریا میں ضم نئیں ہونا
وہ مجھ کو بے شک ٹھنڈا کر سکتے ہیں
آگ مظفّر غزلوں میں کم نئیں ہونا

مظفر حنفی

آگ پر چل کے دکھایا تو کبھی پانی پر
گولیاں کھائی ہیں فنکار نے پیشانی پر
کون تاریخ میں احوال ہمارا لکھّے
ہم تو ٹھوکر بھی لگاتے نہیں سلطانی پر
کیا سمجھتا تھا کہ مل جائے گا ثانی اس کا
میں تو حیران ہوں آئینے کی حیرانی پر
گدگداتا ہے شگوفوں کو وہ پوشیدہ ہات
جس نے کانٹوں کو لگایا ہے نگہبانی پر
وہ مجھے دولتِ کونین عطا کرتا ہے
اس طرف ناز مجھے بے سر و سامانی پر
عمر کے آٹھویں عشرے میں کرو سجدۂ شکر
آمدِ طبع مظفّر جو ہے طُغیانی پر

اس روشنیِ طبع نے دھوکا دیا ہمیں
اپنے لہو کی آنچ نے جھلسا دیا ہمیں
کیوں اتنے چھوٹے خود کو نظر آ رہے ہیں ہم
یارب یہ کس مقام پہ پہنچا دیا ہمیں
آئے تھے خالی ہاتھوں کو پھیلائے ہم یہاں
دنیا نے خالی ہاتھ ہی لوٹا دیا ہمیں
ٹھنڈی ہوا نے توڑ دیا تھا درخت سے
پھر گردباد آئے سہارا دیا ہمیں
زخمی ہوئے تھے جنگ میں دشمن کے وار سے
احباب نے تو زندہ ہی دفنا دیا ہمیں
کاغذ کی ناؤ پر تھے ہمیں ڈوبنا ہی تھا
جو موج آئی ایک جھکولا دیا ہمیں
ہم تاکہ کائنات پہ قابو نہ پا سکیں
اس نے طلسمِ ذات میں اُلجھا دیا ہمیں

پاؤں تو مسندِ سلطانی پہ رکھا ہوا ہے
سر مرا بے سر و سامانی پہ رکھا ہوا ہے
عالم الغیب نمائش کو نہیں کرتا قبول
آپ کا سجدہ تو پیشانی پہ رکھا ہوا ہے
اے ہوا خوش نہ ہو فانوس اگر ہیں بے نور
اک دِیا اور ادھر پانی پہ رکھا ہوا ہے
ہے تو ہو سامنے انبار پریشانی کا
حوصلہ بھی تو پریشانی پہ رکھا ہوا ہے
کیا تعجب ہے اگر خاک بسر ہیں ہم لوگ
ہم نے تکیہ بھی تو نادانی پہ رکھا ہوا ہے
ایک بھی پھول کھلایا ہے جہاں قدرت نے
انگِنت کانٹوں کو نگرانی پہ رکھا ہوا ہے
ہم نے سوراخ بھی کشتی میں بہت رکھے ہیں
اس نے دریا کو جو طغیانی پہ رکھا ہوا ہے
شہر میں امن رہے گا کہ بپا ہوگا فساد
سارا قضیہ مری قربانی پہ رکھا ہوا ہے

مظفر حنفی

جہاں زمیں ہے وہاں آسماں بھی پڑتا ہے
یہ پردہ تیرے مرے درمیاں بھی پڑتا ہے
کوئی بتائے سفینے جلانے والوں کو
کہ اک اَنا کا سمندر یہاں بھی پڑتا ہے
مزا تو آتا ہے مرمر کے زیست کرنے میں
کبھی کبھار یہ سودا گراں بھی پڑتا ہے
حسین چہروں پہ ہم سینک لیتے ہیں آنکھیں
بلا سے کم نظری کا دھواں بھی پڑتا ہے
اب اتنا خوش بھی نہ ہو ڈھا کے چار دیواریں
بدن فصیل میں اک شہرِ جاں بھی پڑتا ہے
ترے نثار، کچھ اتنا کیا ہے سر افراز
کہ سرے سے نیچے ترا آستاں بھی پڑتا ہے
میں اپنی ذات کی پیچیدگی سے عاجز ہوں
اسی میں ورطۂ کون و مکاں بھی پڑتا ہے

(عین رشید کی یاد میں)

اب اتنا بُرد بار نہ بن میرے ساتھ آ
بدلیں گے مل کے چرخِ کہن میرے ساتھ آ
پیوندِ خاک ہونا ہے بارے ابھی نہیں
پھیلا ہوا ہے نیل گگن میرے ساتھ آ
پلکیں بچھی ہیں میری ہر اِک موجِ آب میں
اس پالکی پہ چاند کرن میرے ساتھ آ
اے روحِ بے قرار، ابھی جان مجھ میں ہے
زخموں سے چور چور بدن میرے ساتھ آ
ویسے بھی اپنے دستِ ہُنر کھا رہے ہیں زنگ
پھیکا پڑا ہے رنگِ چمن میرے ساتھ آ
سچ بولنے کا تجھ کو بڑا اشتیاق ہے
اچھا تو سر سے باندھ کفن میرے ساتھ آ
یاروں نے انقلاب تو نیلام کر دیئے
اب چھوڑ کر یہ دارورسن میرے ساتھ آ

ہاں بادِ صبا سچ ہے پریشاں رہے ہم
غنچوں کے بہر حال نگہہ بان رہے ہم
شبنم نے کیا پاک تو کانٹوں نے سیے چاک
ہر چند کہ مفلس کا گریبان رہے ہم
سر تا بہ قدم زخم ہے اب کیسے بتائیں
گلدان رہے ہم کہ نمکدان رہے ہم
واللہ کہ بچنے کے لیے سر نہ جھکایا
ناوک فگنی کے لیے آسان رہے ہم
بسمل تھے مگر رقص کیا، رنگ اڑائے
دنیا ترِی تفریح کا سامان رہے ہم
یہ کیا کہ جدھر دیکھیے خود ہی سے لڑے آنکھ
اس آئینہ خانے میں تو حیران رہے ہم
تھے خاک بسر کِرمکِ شب تاب مظفّر
ظلمت میں تری ذات کی پہچان رہے ہم

مظفر حنفی

تمھیں وہ تابِ تگ و تاز ہی نہیں دیتا
ہمیں اجازتِ پرواز ہی نہیں دیتا
خدا کے فضل سے تہذیب آ گئی ہے اُسے
کسی کو دعوتِ شیراز ہی نہیں دیتا
ترے سِوا جو کوئی میرے دل کو چھیڑتا ہے
عجیب ساز ہے آواز ہی نہیں دیتا
مِرا وجود ہے اظہار کے لیے بیتاب
زمانہ موقعۂ آغاز ہی نہیں دیتا
ستم ظریفی تو دیکھو کہ تخت و تاج کے ساتھ
وہ بعض لوگوں کو دمساز ہی نہیں دیتا
مظفّر اہلِ نظر بے خبر نہیں کہ خدا
سزا بھی دیتا ہے اعزاز ہی نہیں دیتا

وہ گلدستوں میں اشعار لگاتا ہے
اور یہاں لہجے پر دھار لگاتا ہے
غرقابوں نے دیکھا دریا کا انصاف
زندہ مردہ سب کو پار لگاتا ہے
کون زمانے کو سمجھائے چلنے دو
چلنے والے ہی کو آر لگاتا ہے
کہلاتے ہیں دنیا بھر میں ظلِ اللہ
جن پر چھاتا خدمت گار لگاتا ہے
خوشبو قید نہیں رہ سکتی گلشن میں
دیکھیں وہ کتنی دیوار لگاتا ہے
ماضی سے تا حال مظفّر ظالم ہی
تاج پہنتا ہے، دربار لگاتا ہے

سر میں سما گئی تھی ہوا کج نہاد کے
ذرّوں نے بل نکال دیئے گردباد کے
بے احتجاج ظلم کو سہنا روا نہیں
چپ رہ کے حوصلے نہ بڑھاؤ فساد کے
اُن کے سوا کسی پہ بھروسہ نہ کیجیو
وہ پَر تراش دیں گے ترے اعتماد کے
ہم نے تعلقات کی قلمیں لگائی تھیں
انکھوے یہ کیسے پھوٹ رہے ہیں عناد کے
جتنے گھروندے تم نے بنائے تھے ریت پر
نیچے گڑے ہیں ان پہ کسی دیوزاد کے

ہمارے گھر پہ کبھی سائبان پڑتا نہیں
یہ وہ زمیں ہے جہاں آسمان پڑتا نہیں
پڑاؤ کرتے چلے راہ میں تو چلنا کیا
سفر ہی کیا ہے اگر ہفت خوان پڑتا نہیں
بجھانی ہوگی ہمیں خود ہی اپنے گھر کی آگ
کہیں سے آئے گی امداد جان پڑتا نہیں
مزے میں ہو جو تمھیں بے زمین رکھا ہے
کہ فصل اگاتے نہیں ہو، لگان پڑتا نہیں
عطا خلوص نے کی ہے یقین کی دولت
گمان اس کے مرے درمیان پڑتا نہیں
ہم احتجاج کسی رنگ میں نہیں کرتے
ہمارے خون سے کوئی نشان پڑتا نہیں

مظفر حنفی

مولا خشک آنکھیں تر کر دے
جھولی جھولی موتی بھر دے
شہپر دے بازو کٹنے پر
اونچا رہنے والا سر دے
انکھوے پھر سے پھوٹ رہے ہیں
زخمی ڈالی کو خنجر دے
آگ زنوں کے دل کو پانی
ہم بے گھر لوگوں کو گھر دے
خوشبو لٹ جاتی ہے ساری
رنگ نہیں ہم کو پتھر دے
مرجائیں گے بے تیشہ بھی
تیشہ دے تو دستِ ہنر دے
تتلی مانگ رہی ہے خوشبو
پھول دعا کرتے ہیں پردے

کر گئے ہجرت پرندے پھر چلی ٹھنڈی ہوا
ہے شگوفوں کا دمِ آخر چلی ٹھنڈی ہوا
آستیں شبنم نے تر کی سبزۂ بیگانہ کی
غنچۂ نورستہ کی خاطر چلی ٹھنڈی ہوا
زرد رومال اپنا جھٹکا تھا خزاں نے اُس طرف
گلستاں سے کہہ کے 'جی حاضر' چلی ٹھنڈی ہوا
دیکھ لینا بیچ ہی میں دھجیاں اڑ جائیں گی
اس طرف مسجد اُدھر مندر ، چلی ٹھنڈی ہوا
جب خفا تھیں اس کی یادیں حبس تھا دل میں بہت
پھر گھٹا گھر آئیں بالآخر، چلی ٹھنڈی ہوا

ہر طرف ریت نہ تھی راہ میں دریا تھے کئی
اس خرابے میں کبھی اپنے شناسائے تھے کئی
اس کو دیکھا تو طبیعت نہ بھری دیکھنے سے
جگمگاتا تھا وہی یوں تو 'ستارا' تھے کئی
آئینہ کہتا تھا دھندلی ہے بصیرت میری
دل میں جھانکا تو وہاں عکس ہویدا تھے کئی
گرد اڑانے کا مزہ آبلہ پا سے پوچھو
ورنہ بسنے کے لئے شہرِ تمنّا تھے کئی
لائقِ دید تھا منظر مری غرقابی کا
کوئی تنکا نہ بنا، محوِ تماشا تھے کئی
وہ جو کھلتے ہی نہ تھے دُزدِ حنا کی مانند
شعر سنتے ہی مرے آگ بگولا تھے کئی

دریا اچھلے پانی میں کیا کرتے ہیں
تنکے اس طغیانی میں کیا کرتے ہیں
پتھر ہیں تو شیش محل پر جائیں نا!
گھاؤ مِری پیشانی میں کیا کرتے ہیں
تنگی میں وہ سجدے کرتے رہتے تھے
دیکھیں تن آسانی میں کیا کرتے ہیں
رہنے دیں ویرانے کو ویرانہ ہی
دیوانے نادانی میں کیا کرتے ہیں
سب اچھے لگتے ہیں اپنی کرسی پر
چاند ستارے پانی میں کیا کرتے ہیں
کھلتے ہیں وہ ، حیرانی میں دنیا ہے
پھول یہاں ویرانی میں کیا کرتے ہیں

مظفر حنفی

کسی سرحد، کسی بندش کو ہوا مانے کیا
آج وحشت کا ارادہ ہے خدا جانے کیا
ناؤ منجدھار میں کیوں ساتھ چلی آتی ہے
کہہ دیا کان میں کچھ اس کے بھی دریا نے کیا
ایک ہی نام لکھا میں نے کئی زاویوں سے
میری غزلیں، مری نظمیں، مرے افسانے کیا
مصلحت ہے کہ عداوت ہے کہ سچائی ہے
سونقابوں میں چہرہ، کوئی پہچانے کیا
گھوم پھر کر وہی اک بات کہ برحق ہو تم
سب سمجھتا ہوں، مجھے آئے ہو سمجھانے کیا
دل جہاں آپ ہی جھکتا ہو مظفر جھک جاؤ
آنکھ والوں کو حرم کیا ہے، صنم خانے کیا

ہر اک سانس پابند کر دی گئی
پھر اک دن ہوا بند کر دی گئی
محبت کے حق میں دعا کیجیے
سُنا ہے دَوا بند کر دی گئی
سخاوت کا اب کوئی موقع نہیں
وہ مٹھی حنا بند کر دی گئی
فنا کے مسافر لگے چیخنے
جو کھڑکی ذرا بند کردی گئی
کسے منہ دکھائیں کہاں جائیں ہم
ہماری سزا بند کر دی گئی
خدا پر نہ قابو چلا آپ کا
تو خلقِ خدا بند کر دی گئی
مظفر سے حق گوئیوں کے سبب
سلام و دعا بند کر دی گئی

ہم کہ مُجرم دو ملاقاتوں کے ہیں
گھاؤ دل پر سیکڑوں باتوں کے ہیں
پھول، پتّے، پھل، سبھی مٹّی ہوئے
پیڑ پر احسان برساتوں کے ہیں
کہکشاں پر ثبت ہیں میرے قدم
چاند پر دھبّے مِرے ہاتھوں کے ہیں
وہ مسافر آندھیوں سے خوف کھائیں
جن پہ سائے مہرباں چھاتوں کے ہیں
سال بھر کی گرد آئینے پہ ہے
سامنے انبار سوغاتوں کے ہیں
چودھویں کے چاند کی مانند ہم
اور مہماں ایک دو راتوں کے ہیں
دل دُکھاتے ہیں مظفر شعر سے
مستحق ہم لوگ صلواتوں کے ہیں

مظفر حنفی

سند باد کی واپسی

قوم رہبر کے ایوانوں سے سر ٹکرا کر،
لوہے کے تپتے بازاروں سے گھبرا کر،
اپنی ذات کی بھول بھلیوں سے اکتا کر،
عہدِ نو کے فلسفیوں سے آنکھ بچا کر،
فن کاروں کی اُلجھی باتوں سے چکرا کر،
سہلانے والے ہاتھوں سے چوٹیں کھا کر،
اندر سے باہر کی جانب،
سند باد جب واپس لوٹا،
اس نے چاروں جانب پھیلی دنیا کو،
جب غور سے دیکھا۔
پیدل چلنے والے پہلے سے زاید تھے!
ننگے پھرنے والے پہلے سے زاید تھے!!
بھوکوں مرنے والے پہلے سے زاید تھے!!!

مظفر حنفی

ڈوبنے جاؤں تو دریا

کرارے نوٹ
چھن چھن بولتے سکّے،
شیئر، ہُنڈی،
چمکتی میز، الماری،
نگر کے سیٹھ، افسر اور پھران کے حواری،
کلرکوں کی زبان پر موٹے موٹے ہندسے جاری،
قلم بھاری۔
فضا میں بینک کی ہر سمت اک سنجیدگی طاری۔
نہ جانے کیسے چوکیدار کی آنکھیں بچا کر،
نیم خبطی اک بھکاری،
کب بڑے صاحب کے کمرے میں در آیا،
لگا تھا پیٹھ سے جو پیٹ، دکھلایا۔
کہا:
سرکار مل جائے اگر اک نوٹ دس کا،
میں چنے لے کر چبالوں،
پیٹ کا دوزخ بجھالوں۔
جواباً گونج اٹھی قہقہوں سے بینک کی بلڈنگ وہ ساری،
کھل گئی جیسے کمانی.....
جی!
سمندر میں نہ تھا پینے کا پانی!!!

مظفر حنفی

ہابیل کی منطق

کوٹھے سے،
حوّا کی بیٹی جھانک رہی تھی۔
اس نے اپنا بٹوہ دیکھا۔
ٹھنڈے دل سے غور کیا۔
پہلے جانے میں پیسے زائد لگتے ہیں،
اور سِئے بھی کم ملتا ہے۔
لہجے میں ایثار سمو کر،
وہ اپنے ساتھی سے بولا:
پہلا حق تو تیرا ہے،
بھائی قابیل!

فیڈنگ پرابلم
شہر میں کرفیو لگا ہے۔
میری ہمسایہ کے گھر طوفاں بپا ہے۔
دودھ اس کی چھاتیوں سے بہہ رہا ہے
بھوک سے بے حال اس کا بچہ کپڑے نوچتا ہے
دودھ کا ٹن اس طرف خالی پڑا ہے۔
شہر میں کرفیو لگا ہے

مظفر حنفی

رستا ہوا بوسہ

میں نے اس کے تھرتھراتے ہونٹ پر،
کچھ اس طرح آہستگی سے،
رکھ دیے تھے ہونٹ اپنے،
جیسے چوڑی پر کوئی چوڑی بٹھائے۔
ذہن میں ہلکی سی شیرینی کا خوش کن ذائقہ ہے۔
سانس میں خوشبو گھلی ہے،
شہد میں ڈوبی ہوئی چمپا کی پنکھڑیوں کا عالم،
پھر مرے احساس میں کیوں........
کانچ کا ٹکڑا سا چبھ کر رہ گیا ہے،
میرے ہونٹوں پر،
یہ سُرخی کس لیے ہے؟!

مظفر حنفی

جھولنا حاتم کے سر کا..

اور حاتم طائی نے جب،
اسم اعظم پڑھ کے،
ان پر دم کیا۔
پیڑ پر لٹکے ہوئے سر،
گر پڑے تالاب میں،
اپنے جسموں سے گلے مل کر،
نہایت خوش ہوا پریوں کا غول۔
مہ لقاؤں میں جو سب سے خوب تھی،
شکریے کے طور پر حاتم سے ہم بستر ہوئی۔
یہ بدن ہی سے بدن کا تھا ملاپ،
جسم اور سر کا نہیں۔
اس واسطے،
اسم اعظم کا اثر جاتا رہا،
تب سے،
حاتم طائی کا سر،
جُھولتا ہے پیڑ پر۔
اور،
دھڑ تالاب میں ڈوبا ہوا ہے!

اسے دیکھ کر
ساری تہذیب جیسے ہوا ہو گئی۔
میں اسے دیکھ کر،
دیکھتا رہ گیا۔
جی میں آیا کہ سینے میں رکھ لوں اسے،
واقعی نامکمل ہے میرا وجود۔
مجھ سے چھینی گئی تھی جو روزِ ازل،
وہ یہی ہے۔
مری بائیں پسلی،
یہی ہے!!

مظفر حنفی

مشرقی چیخیں

عرفی،
مرا چہیتا چالیس دن کا بیٹا،
آغوش میں ہے میری۔
آنکھیں گھما گھما کر، لاتیں چلا چلا کر
جذبے ابھارتا ہے۔
ہنس کر، ہمک ہمک کر کلکار مارتا ہے۔
لیکن ذرا سنو تو!
کلکار کے عقب سے یہ کون چیختا ہے۔
عصّو،
مری نہایت خدمت گار بیوی،
میں جس کی ہر ادا پر،
دل سے فریفتہ ہوں،
عرصے کے بعد،
گھر کے جنجال سے بچا کر تھوڑا سا وقت،
میرے بستر پہ آ گئی ہے، سرگوشیوں میں،
پچھلے بارہ برس میں پل کر چھتنار ہونے والے،
بے لوث پیار کا اک قصہ سنا رہی ہے۔
لیکن ذرا سنو تو،
سرگوشیوں کے پیچھے یہ کون چیختا ہے،
یہ کون چیختا ہے۔
یہ کون...

مظفر حنفی

دوسری جلاوطنی

جب گیہوں کا دانا جنس کا سمبل تھا،
اس کو چکھنے کی خاطر،
میں جنت کو ٹھکرا آیا تھا۔

اب گیہوں کا دانہ،
بھوک کا سمبل ہے۔
جس کو پانے کی خاطر،
میں اپنی جنت سے باہر ہوں!

صور اسرافیل
اب تو بستر کو جلدی سے تہہ کر چکو
لقمہ ہاتھوں میں ہے تو اسے پھینک دو
اپنے بچوں کی جانب سے منھ پھیر لو
اس گھڑی بیویوں کی نہ پروا کرو
راہ میں دوستوں کی نظر سے بچو
اس سے پہلے کہ تعمیل میں دیر ہو
سائرن بج رہا ہے۔ چلو دوستو!

کوائف احمد حسین مجاہد

نام: احمد حسین مجاہد

تاریخ پیدائش: ۲/مارچ ۱۹۶۱ء **جائے پیدائش**: بالاکوٹ۔ہزارہ (پاکستان)

تعلیم: بی ایس سی (آنرز)۔زراعت **ملازمت**: AVP زرعی ترقیاتی بنک لمیٹڈ

تصانیف

(۱) **دُھند میں لپٹا جنگل** (شعری مجموعہ۔۱۹۹۷) (۲) **سیف الملوک** (داستان۔۱۹۹۹)

(۳) **صفحۂ خاک** (آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ کے زلزلے کے حوالے سے۔۲۰۰۷)

(۴) **اوک میں آگ** (زیرِ ترتیب شعری مجموعہ)

پوسٹل ایڈریس

ماڈرن ایج پبلک اسکول اینڈ کالج۔مانسہرہ روڈ۔سپلائی۔ایبٹ آباد۔پاکستان

ای میل: mashiats@yahoo.com

ٹیلی فون: **Tel(Res)** 0092-992-502654 **Mobile:** 0092-345-9461234

☆ سرزمینِ ہزارہ نے دورِ حاضر میں اردو شعروادب کو مالا مال کر دیا ہے۔قتیل شفائی، محمد ارشاد، آصف ثاقب اور سلطان سکون کی اس نگری میں متعدد نوجوان شعرأ و ادبا خوبصورت تخلیقات مسلسل پیش کر رہے ہیں۔احمد حسین مجاہد انہی تخلیق کاروں میں سے ایک نمایاں اور سربرآوردہ نام ہے۔''دھند میں لپٹا جنگل'' ان کی غزلوں اور نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن شعری تخلیقات کے عقب میں ایک جیتا جاگتا باشعور ذہن، ایک نہایت درجہ حساس دل اور امکانات سے چھلکتا ہُوا ایک وجدان کارفرما ہے۔مجاہد کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ہے مگر یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُن کا بھرپُور مستقبل پوری آن بان سے جھلکتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔وُہ شاعری کی دونوں اصناف۔۔۔غزل اور نظم پر استادانہ حد تک حاوی ہیں اور اُن کے ساتھ آنے والے دور کی بہت سی توقعات وابستہ کرتے ہُوئے اہلِ ذوق کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہَوسکتی۔ **احمد ندیم قاسمی**

پروفیسر ضیاء المصطفیٰ ترک (ہری پور)

احمد حسین مجاہد

جو اپنے کناروں سے باہر بھی موجود ہے

کس کو معلوم تھا

کس نے سوچا تھا

اتنے سرابوں سے ہو کر گزرتے ہُوئے

ایک دریا بھی رستے میں

آجائے گا

ایک دریا۔۔۔!

جو اپنے کناروں سے باہر بھی موجود ہے

یہ ایک نظم "دریا" کی سطریں ہیں جو اپنے معنوی و فنّی تناظر میں فکری و تخلیقی توانائی کی واضح نشاندہی کر رہی ہیں۔کارِ شعرگوئی بظاہر نہایت سادہ عمل معلوم ہوتا ہے کہ جو چاہا لِکھ ڈالا اور جو جی میں آیا تحریر کر دیا لیکن درحقیقت، یہ اپنے بطون میں نہایت پیچیدگی اور پُراسراریت کا حامل ہے۔ایک سادہ سا مصرعہ بھی بڑی دیدہ سوزی اور جانکنی کے مراحل کے بعد معرضِ اظہار میں آتا ہے، اور بالخصوص تازہ گو شعراء میں جو نیا پن اور جدّت نظر آتی ہے وہ تخلیقی ریاضت کے بغیر کسی صورت ممکن نہیں۔ اپنی لفظیات سے لیکر فکری جہات تک ایک خیال نہ جانے کس کس پیرائے اور اُسلوب میں منتقل ہوتا ہوا، اپنی مطلوبہ ہئیت اور شکل میں نمودار ہوتا ہے۔تخلیق کار، اپنے انہماک میں ناموجود کو موجود میں بدلنے کی سعی میں نہ جانے کتنے ہفت خواں سر کرتا ہے، تب کہیں جا کر کوئی بھرپور اور توانا فن پارہ وجود میں آتا ہے، اور یہی دراصل معجزہ ءفن کی نمود کا عمل ہے

اُس کی تصویر سے مخاطب ہوں کیا خبر کوئی معجزہ ہو جائے!!

"احمد حسین مجاہد" کا مندرجہ بالا شعر اور نظم، میرے خیال میں اُس تصورِ شعر کی مکمل عکاسی کرتے ہیں جو اُس کے تخلیقی سفر کا محرّک ہے۔اُس کے کلام میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کے ایک دوسرے سے آمیز

ہونے سے تازہ اورتوانا شاعری وجود میں آتی ہے۔وہ اپنی فکری نہج اور اسلوب کی نوعیت کے اعتبار سے اُن صاحبِ طرزشعراء کے قبیلے سے مماثلت ومشابہت کا حامل ہے، جوساٹھ ستّر کی دہائی میں اورازاں بعد منظرِ عام پرآئے اورشاعری میں تازہ کاری کوبارِدیگررواج دینے کا موجب ہوئے۔اُس کی شعری زبان(Diction) اورمخصوص تمثال کاری(Imagery) جہاں اُس کے بعض ہمعصر شعرا کے ساتھ اُس کی فکری وتخلیقی قُربت کی نشاندِہی کرتی ہے وہیں اُس کے شعری فضاء بجائے خوداُس کی ذاتی انفرادیت کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اپنے معروف مضمون "روایت اورانفرادی صلاحیت(Tradition & Individual Talent)" میں ایک جگہ نقدِ شعر کے منصب کوواضح کرتے ہوئے بڑی خوبصورت بات کی، کہتا ہے:Honest criticism

and sensitive appreciation is directed, not upon the poet but upon the poetry.

سومیرے خیال میں"احمد حسین مجاہد" کی شاعری فکری وحوالے سے ایسے آشوب کا بیانیہ ہے جوانفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ بتدریج اجتماعی حیثیت میں نمو پذیر ہوتا نظرآتا ہے۔اُس کے شعری دائرے میں دَرآنیوالی مخاطبت اور گاہے گاہے کی بلند آہنگی کہیں اُس تعزیّتی سکوت کا اظہار یہ معلوم ہوتی ہے، جواُس کے درون میں نہ جانے کب سے برپا ہے۔

مجھ کومیرے سب شہیدوں کے تقدّس کی قسم ایک طعنہ ہے مجھے شانوں پہ سَر رکھاہُوا !!!

ہَم اورآپ تَو ہیں دشتِ نینوامیں ابھی کہ خیمہ زن ہے عدوارضِ انبیامیں ابھی

شعر میں تمثال کاری اورمنظرنگاری کا عمل، جہاں شاعر کی فنی مہارت کی دلیل ہے وہیں اِس سے وہ فکری رُجحانات بھی اظہار پاتے ہیں جوتخلیقی سطح پراُس کے تحرّک کے لیے اُس کے نہاں خانوں میں کہیں اُمید اور یاسیّت کے احساسات کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔احمد حسین مجاہد کے امیجز میں زندگی ایک یقین کے ساتھ موجود ہے اورشاید یہی سبب ہے کہ اُس کے اشعار درونِ ذات ایک شادمانی اورفرحت ومسرت کے اجراء کا موجِب بنتے ہیں۔اِس ضمن میں چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چانداترا ہے مجھے یہ وقت دعا کا دکھائی دیتا ہے

جھٹک کرڈالتی ہے جب وُہ بھیگے بال شانے پر تو نیچے دُور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے

میں کسی گم شدہ دریا پہ کھڑا ہوں احمد موج ورنہ مرے سرتک کوئی آئی ہوتی

مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اُس نے میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایاہُوا تھا

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ احمد حسیں مجاہد کے ہاں بعض اوقات یہ تصویر کشی، بتدریج تجریدکاری کے ارتفاع پر منتج ہونے لگتی ہے،جس کی مثالیں اگرچہ فی الوقت بہت زیادہ نہیں لیکن یہ امرمیرے لیے تو بہرحال نہایت خوش کُن اورلائقِ مسرّت ہے، کیونکہ میری دانست میں یہ وہ تخلیقی سطح ہے جومنتہائے سخن اورکمالِ شعر کہلائی

جاسکتی ہے، بشرطیکہ اِس میں لایعنیت (Absurdity) شامل نہ ہو پائے۔ذرااِن دواشعار پرنظرڈالیئے:۔

کھڑکی پہ جھکی ہُوئی تھیں بیلیں کمرے میں کوئی معاملہ تھا

مثلِ سراب کرتی ہے موہوم سے ظہور جلتے ہُوئے درخت کا سایہ ہے زندگی

بقول شخصے : "فن پارہ، کوئی الہامی شئے نہیں ہوا کرتا جوکسی خاص لمحے اورمخصوص ہئیت میں ازخود وجود میں آجائے، بلکہ فن پارے کوتو بہت سوچ سمجھ کر، بڑے سلیقے اورمحنت سے تشکیل دیا جاتا ہتا کہ وہ متیّعنہ مخصوص تاثر پیدا ہوجائے جوتخلیق کارنے پہلے سے طے کیا ہوا ہے اور یہ کام تلازمات(Correlatives) کی توضیع اورموزوں لفظیات (Diction) کے انتخاب سے ممکن ہو پاتا ہے"۔اگر مذکورہ بالا نظریہء فکر کی روشنی میں "احمد حسین مجاہد " کی شاعری کو پڑھا جائے تو یہ تسلیم کیے بناء چارہ نہیں کہ وہ لفظ وخیال کی بُنت اورتلازمہ کاری سے ، شعر میں مطلوبہ تاثیر پیدا کرنے میں بجاطور پر کامیاب رہا ہے۔اُس کی نظمیں اپنی کیفیت اورمزاج کے اعتبار سے، اُس کی غزلوں سے قدرے مختلف نظر آتی ہیں اورشاید اِس کی وجہ کسی حدتک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نظم کہتے ہوئے، شاید وہ نادانستہ طور پر داستان گوئی کی سمت منقلب ہوجاتا ہے لیکن یادرہے کہ اِس امتیاز کے باوجود، میرے خیال میں اُس کی نظمیں اپنے آہنگ کے لحاظ سے اُس کے فطری لحن میں صورت پزیر ہوتی ہیں اور یہ امر بجائے خود لائقِ تحسین ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا

بہت بھلی تھی وُہ شاخوں سے پھوٹتی ہوئی لَو شجر کی اوٹ میں شاید کوئی ستارا تھا

تجھ حسن سے معاملہ کس آن میں ہُوا میں تَو جواں ہی میر کے دیوان میں ہُوا

جیسے میراخواب ہے یہ زندگی جیسے اب بیدار ہوجاؤں گا میں

احمد حسین مجاہد جس سرزمین پرمحوِسفر ہے، وہاں اِن دنوں جیتے جاگتے دریاؤں کے غیاب اورگم شدگی پرکوئی اچنبھانہیں ہوتا۔اُسے ٹوٹتے ستاروں نے آنے والے شدید موسموں کی پیش آگاہی بخشی ہے اورہجرت وہجر کے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔اپنی خاک ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وُہ موجہ ٔخوشبو کے تعاقب میں سرگرداں ہے اور اپنی سانسوں کے ساتھ گردشِ افلاک میں شراکت کا دعویدار بھی۔چارسُو بکھری آیات کی تلاوت کرتاہُوا، اپنی تنہائی کے ہمراہ اَن دیکھی، انجانی سمتوں میں گامزن ہے۔اُن سمتوں کی طرف جہاں ہرشجر کی اوٹ میں کوئی ستارا اپنی لَو کے جلو میں اُس کا منتظر ہے اور ہر کنجِ تاریک میں کوئی نقشِ کفِ پا، مثلِ چراغ روشن ہے۔منہدم مکانوں پرنمازِ عصرادا کرنے کے بعد، اب اُس اب اُس کوطلب فقط آبِ حیات ہی کی نہیں بلکہ وُہ بعدازاں اوک میں بھری آگ کا گھونٹ بھرنے کوبھی تیار ہے۔غبار آلودراستوں، ملبے تلے دبے پھولوں اوردلوں کو چیرتے بے نُور سناٹے سے گزرکرآنے والے کی سچائی لفظ لفظ آپ تک رسا ہونے کو ہے، خبرداررہیے گا!!

محمد اظہار الحق (اسلام آباد)

صفحۂ خاک

''ہم لڑکیوں کے ہائرسیکنڈری سکول کے قریب سے گزرتے ہیں۔سکول میں ہر طرف بچیوں کے کھلے ہُوئے بستے اور جوتے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ہَوا کو جانے کس ادھوری تحریر کی تلاش ہے کہ وُہ کتابوں اور کاپیوں کے صفحے الٹ رہی ہے۔میں اِس منظر کی تاب نہیں لاسکتا''

یہ دلگداز اقتباس خوبصورت شاعری کرنے والے احمد حسین مجاہد کی تصنیف ''صفحۂ خاک'' سے ہے۔آٹھ اکتوبر۲۰۰۵ کی صبح برپا ہونے والے زلزلے نے کتی ہی بستیاں اجاڑ کرر کھ دیں، کتنے ہی قصبے زمین کے سینے سے اٹھا کر زمین کے پیٹ میں ڈال دیے اور کتنے ہی قریے ملبے کے ڈھیر میں بدل کرر کھ دیے لیکن جورات بالاکوٹ پر گزری وُہ سب سے زیادہ تاریک تھی۔اِس تیرہ بختی میں بالاکوٹ کو ایک خوش نصیبی میسر آ گئی (مجھے نہیں معلوم کہ خوش نصیبی کا لفظ یہاں برمحل ہے یا نامناسب ہے)اور وُہ یہ کہ احمد حسین مجاہد بالاکوٹ کا بیٹا تھا، اُس نے اپنے تباہ شدہ شہر پر نوحہ خوانی کرنے کے لیے درختوں کی سوختہ شاخوں سے قلم بنائے ، راکھ کے ڈھیروں کو صفحوں میں تبدیل کیا اور اپنی خونی خونی انگلیوں سے ایسی کتاب لکھی جس کا ہر صفحہ اور ہر صفحے کی ہر سطر، اور ہر سطر کا ہر لفظ اور ہر لفظ کا ہر حرف اپنی جگہ مکمل نوحہ ہے، مکمل شہرآشوب ہے اور مکمل عزاداری ہے۔لگتا ہے ''انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا'' والا مصرع کہا ہی احمد حسین مجاہد کے لیے گیا تھا۔

''صفحۂ خاک'' میں احمد حسین مجاہد نے ماتم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔مجھے یہ کتاب پڑھتے ہُوئے بار ہا یوں لگا جیسے مجاہد نے اپنے بال نوچ کر بکھیرے ہُوئے ہیں، جیسے اُس نے پٹکا سر سے اتار کر کمر سے باندھا ہُوا ہے، جیسے وُہ سینے پر دوہتھڑ مار رہا ہے، جیسے وُہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بلک بلک کر رو رہا ہے، سسکیاں بھر رہا ہے، جیسے وُہ دونوں ہاتھوں کی انگشت ہائے شہادت اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔اُس کی کتاب کے ہر صفحے پر ملبہ ہے اور لاشیں ہیں، زخمی ہیں اور اُن کا واویلا ہے، بچے ہیں اور اُن کے ٹوٹے ہُوئے کھلونے ہیں، پرندے ہیں اور اُن کے جلے ہُوئے پر ہیں، مائیں ہیں اور اُن کے جگر گوشوں کی میتیں ہیں، باپ ہیں اور اُن کے نوجوان بیٹوں کے کفن ہیں، بھائی ہیں اور اُن کی بہنوں کے جہیز سے اٹھتا ہُوا دُھواں ہے اور بہنیں ہیں اور اُن کے بھائیوں کی اجتماعی قبریں ہیں۔

کون سنتا گم شدہ آواز میری — جا چکے سب، میں ہی پیچھے رہ گیا ہُوں
کر گئیں بستی سے ہجرت چیونٹیاں بھی — میں کہیں ملبے کے نیچے رہ گیا ہُوں

ذرا نوحہ خوانی کی شدت ملاحظہ کریں۔

''آٹھ اکتوبر کو وُہ اپنے کمرے میں سویا ہُوا تھا۔زلزلہ آیا تو پہاڑی کے کنارے پر بنا ہُوا اُس کا گھر مکمل طور پر تباہ ہَو گیا اور وُہ درختوں کے جھنڈ میں آن گرا۔آٹھ اور نو اکتوبر کی درمیانی رات۔۔۔۔وُہ قیامت کی رات اُس نے زندگی اور موت کی کشمکش میں گزاری۔بتانے والے بتاتے ہیں کہ ساری رات اُس کی آواز اُجڑی ہُوئی بستی میں گونجتی رہی۔وُہ پکارتا رہا کہ میں سفیر ہُوں، مجھے یہاں سے نکالو۔وُہ اندھیری اور اُجڑی ہُوئی رات، ژالہ باری، زلزلے کے پے در پے جھٹکے اور زخموں سے چُور سفیر۔۔۔!جانے اُس نے کس کس کو پکارا ہو گا، جانے اُس پہ کیا بیتی ہو گی، جانے کس وقت اُس نے آخری سانس لیا ہَو گا۔مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اُن اذیت ناک لمحوں میں اُسے میرا بھی خیال آیا ہَو گا۔۔۔شاید اُس نے مجھے بھی آواز دی ہَو، مجھے بھی پکارا ہَو۔''

آٹھ اکتوبر۲۰۰۵ کے زلزلے سے بچوں کی ایک پوری نسل ختم ہَو گئی۔اس کی ذمہ داری تقدیر پر ہے یا اُن درندوں پر جو شکم کے تنور میں حرام کا لقمہ ڈالنے کے لیے سرکاری عمارتیں غیر معیاری بناتے ہیں اور بنواتے ہیں۔احمد حسین مجاہد نے ان نوشگفتہ کونپلوں کی مرثیہ خوانی کرتے وقت قلم توڑ کرر کھ دیا ہے۔پڑھیے اور روئیے۔

''میں ملبے پر بکھری کتابوں اور کھلے ہُوئے بستوں سے جھانکتی کہانیوں کے درمیان کھڑا ہُوں۔میرے اندر کے صحرا میں کہیں ریت اُڑنے لگتی ہے۔۔۔''

احمد حسین مجاہد کی تصنیف ''صفحۂ خاک'' اُس تباہی کی داستان ہے جو زلزلہ بالاکوٹ پر لے کے آیا لیکن یہ صرف داستان ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک شاعر جب نثر لکھتا ہے تو نثر کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی رفعتوں پر لے جاتا ہے، اِس لیے کہ شاعری الہام ہے۔آپ نثر لکھنا تو سیکھ سکتے ہیں، شاعری کرنا نہیں سیکھ سکتے۔تاریخ میں آج تک کوئی مدرسہ، کوئی کالج، کوئی مکتب، کوئی ادارہ ایسا نہیں گزرا جہاں ناشاعر کو شاعر بنایا جاتا ہَو۔جس کو بحر کا، اور تقطیع کا اور وزن کا شعور نہ ہَو، اُسے اِس شعور سے بہرہ ور نہیں کیا جا سکتا۔استاد ''جوابِ مضمون'' تو سکھا سکتا ہے ''جوابِ شاعری'' کی کبھی کوئی کلاس نہیں ہُوئی۔چنانچہ شاعر جب نثر لکھتا ہے تو الہام کو شعر سے نثر تک منتقل کرتا ہے اور اسے مابعد الطبیعاتی (METAPHYSICAL) بنا دیتا ہے۔آپ ادب کی تاریخ میں نثر کے وُہ آثار دیکھ لیں جو شاعروں نے چھوڑے ہیں۔سعدی کی گلستان، جامی کی بہارستان، غالب کے خطوط، اقبال کی RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT، شمس الرحمٰن فاروقی کا ''سوار''، بورس پاسترناک کا ڈاکٹر ژواگو اور بے شمار دوسری کتابیں، ہر تصنیف جریدۂ عالم پر دوام ثبت کر رہی ہے۔احمد حسین مجاہد نے ''صفحۂ خاک'' میں نثر تو اعلیٰ پائے کی لکھی ہی ہے، جا بجا اُس نے شعر ہیروں کی

طرح ٹانکے ہیں۔تباہی کے منظرنامے پر شعر آنسوؤں کی طرح چمک رہے ہیں۔ایک جگہ لکھتا ہے

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طور ہراک پیروجواں دفن کیا تھا

ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

بالاکوٹ کے رہنے والے اِس شاعر نے کئی سال پہلے پیشگوئی کر دی تھی کہ

زباں سمجھتا ہُوں میں ٹوٹتے ستاروں کی
یہ شہر مجھ کو اُجڑتا دکھائی دیتا ہے

مرگ،انبوہ کا ایک اور منظر دیکھیے

بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں رہی
ہر لاش نے مکان کا ملبہ پہن لیا

مجاہد کا ننھا بیٹا اپنے مکان کے ملبے پر کھڑا ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے

بہت ہے فرشِ زمیں، بام و در نہیں نہ سہی
یہ کائنات مرا گھر ہے، گھر نہیں نہ سہی

لیکن اس اندھیری رات میں روشنی بھی طلوع ہُوئی اور وُہ تھی اہلِ وطن کا اور دنیا بھر کے لوگوں کا فوری ردِ عمل۔کراچی سے پشاور تک جس طرح پوری قوم اٹھی اور زلزلہ زدگان کی طرف چل پڑی، اُس کی حالیہ تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔مجاہد لکھتا ہے۔

”میں نے ایک غریب عورت کو دیکھا جس نے شاید ساری زندگی کی جمع پونجی خرچ کر کے زخمی بچوں کے لیے چند جوس کے ڈبے خریدے تھے۔وُہ اپنا یہ اثاثہ لیے کیمپوں میں گھوم رہی تھی۔اُس کے چہرے سے پھوٹتی کرنوں کی لَو میں مجھے زندگی اتنی خوبصورت دکھائی دی کہ میں ایک لمحے کے لیے اپنے سارے دُکھ بھول گیا۔“

مجاہد نے سب ملکی اور غیر ملکی تنظیموں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے کہ کس نے کیا کیا اور کتنا کیا۔بالاکوٹ کو ایک اور جگہ بسانے کے منصوبے کا بھی مجاہد نے تفصیل سے تجزیہ کیا ہے لیکن شہر تاریخ، روایتوں اور وابستگیوں سے بنتے ہیں، نئی آبادیاں کالونی تو کہلا سکتی ہیں، شہر نہیں کہلا سکتیں۔باقی صدیقی نے اسی لیے تو کہا تھا

زندگی حسنِ بام و در تو نہیں
چند اینٹوں کا نام گھر تو نہیں

بالاکوٹ کے بام و در کا حسن وقت کے خرابے میں اتر کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور ”صفحۂ خاک“ اس گمشدہ حسن کا نوحہ ہے۔

☆ ”دھند میں لپٹا جنگل“ پاکر مجھے اُس باپ جیسی خوشی نصیب ہُوئی ہے جسے برسوں ترسنے کے بعد اولاد نصیب ہُوئی ہو۔

قتیل شفائی

☆ تمہاری تازگی اور زبان پر کنٹرول نے متاثر کیا۔تم میں ایک اچھے شاعر نے بسیرا کیا ہے، اِس کا خیال رکھنا۔

ساقی فاروقی

جان عالم (مانسہرہ)

احمد حسین مجاہد کی شاعری اور ہمارے خواب

کرسٹوفر کاڈویل کہتا ہے کہ بندر کے لئے یا نیم وحشی انسان کے لئے گلاب کے ایک پھول کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک چمکتی سی چیز ہے، جسے کھایا جا سکتا ہے۔لیکن شاعر کے لئے یہ کیٹس، اینیکر ون anacroon، حافظ، اوڈ، جیولز لیفور جیو jules Laforgue کا گلاب ہے۔یہ کیفیت اس لئے ہے کہ آرٹ کی دنیا اجتماعی جذبے کی دنیا ہے، اُن الفاظ اور اُن علامتوں کی دنیا ہے جو تمام افراد کے تجربوں سے فراہم ہوتے ہیں اور اُس کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی سماجی زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کی مظہر ہے۔

وہ جذبات جن میں تمام افراد شریک ہوتے ہیں، معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔انسان فطرت کے آئینے میں اپنی آرزوئیں دیکھتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور انہیں اپنی انفرادی مجرد صلاحیتوں سے تجسیم دیتا ہے اور پھر معاشرے کے حساس لوگوں میں وہ خواب، وہ آرزوئیں بانٹ دیتا ہے۔یوں ایک تخلیق کار اپنی ذات اور اپنی زندگی کے تجربات کو ایک معاشرے، ایک سماج کی اجتماعیت کے سپرد کر دیتا ہے۔وہ خیالی دنیا جو حقیقت بدل سکتی ہے....جو کسی طرح سے وجود میں نہیں آ سکتی، وہ شاعرانہ تقریب خیالی کی سطح پر بہت کچھ کر لیتی ہے...گوداموں کو غلے سے بھرتی ہے اور لہلہاتے کھیتوں کے سرور انگیز منظر دکھاتی ہے۔اس کے بغیر وہ محنت امکان پذیر نہیں ہوتی جو اس کامیاب دنیا کو وجود بخشے۔

تو ہماری آرزوئیں، ہمارے خواب ہی ہماری زندگی کے رواں دواں رہنے کا اصل محرک ہیں۔اب اگر کوئی معاشرہ خواب دیکھنا ہی چھوڑ دے تو اس کے مستقبل کا کیا بنے گا۔اس اندیشے کو کوئی خواب دیکھنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔احمد حسین مجاہد کی دُوررس نظر اس اندیشے کو دیکھ رہی ہے؛

نظر میں رہتے ہیں اسباب، میرا کیا ہوگا
میں دیکھتا ہی نہیں خواب، میرا کیا ہوگا

انسان کی زندگی میں اُس کے پاس اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں کہ وہ خواب دیکھتا ہے۔آرزوئیں، امیدیں جنم لیتی ہیں اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔آج کے انسان نے جسے محرومی، مجبوری اور بے اختیاری کا نام دے اُسے خالق کا شاکی بنا دیا ہے، حقیقت میں خالق کا اپنی مخلوق پر سب سے بڑا احسان ہی یہی ہے۔ہماری

زندگی کا سارا حسن ہمارے خواب ہیں۔ اور احمد حسین مجاہد تو زندگی اور موت کے پیمانے ہی الٹ دیتا ہے جب وہ زندگی کو خواب اور موت کو اس خواب سے بیدار ہونے کا نام دیتا ہے۔

جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی — جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں

اگر جدت کا کوئی وجود ہے تو اس کی تعریف میں یوں کروں گا کہ آپ اُن علامتوں کو بدل دیں جو ماضی میں کسی خیال کے ساتھ چپک گئی ہیں۔ سمندر سیرابی کی علامت ہے تو اسے پیاس کے معنی دیں، صحرا پیاس کا اظہار ہے تو اسے سمندر کے معنی دیں۔ اگر علامتوں کے نئے نظام نہیں بنائے جا سکتے تو شاعری اپنے کلاسیکی دور میں زیادہ خوشنما مقام پر کھڑی ہے۔ پھر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت کا جواز نہیں رہتا۔ احمد حسین مجاہد نے مذکورہ بالا شعر میں جدت کے اس پیمانے پر پورا اُترتے ہوئے نئی بات کی ہے۔ یہاں زندگی، خواب اور بیداری نئے معانی کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ اور خواب اپنی حقیقت اور اہمیت میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کی زندگی سے خواب کو الگ کرنا ہی اس کی موت بن جاتا ہے۔

خواب دیکھنے والا انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ عام انسان نہیں ہوتا۔ وہ حالات کی مشکلات سے ایسے گزر جاتا ہے کہ اُس کے راستے میں حائل شے اُس کے سامنے حائل نہیں ہو پاتی۔

لپٹ گیا صفِ اعدا میں گھس کے یار سے میں — وہ زعم تھا مجھے لشکر نظر نہیں آیا

یہی توانائی ہے جو ناممکنات سے ممکنات کے در کھولتی ہے، آسمانوں کو مسخر کرتی ہے اور زمین کے بطون سے اپنی تعبیریں نکال لاتی ہے۔ مجاہد کے ہاں اس توانائی کی ایک توانا شکل ملتی ہے؛

پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا احمدؔ — پہاڑ پر نظر آیا تھا راستہ مجھ کو

خواب اگر اپنی تعبیر پر قناعت کر لے تو جستجو کا دم گھٹ جاتا ہے اور زندگی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح دریا سے جوہڑ میں آ جاتی ہے۔ مگر احمد حسین مجاہد کہیں رکتا نظر نہیں آتا، اُس کے خواب کا سفر دریا بہ دریا جو بجو رواں دواں ہے؛

میں جس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک زمانے سے — کہیں وہ مل ہی نہ جائے یہ احتمال عذاب

شاعر کا یہی توانا اور پُر امید لہجہ جب اجتماعی زندگی سے جڑتا ہے تو معاشرے میں تبدیلی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ فصلیں لہلہاتی ہے اور خوشحالی کے وہ خواب جنم لیتے ہیں جنہیں دیکھنا انسان کی ضرورت بھی ہے۔

☆☆☆

شبہ طراز (لاہور)

احمد حسین مجاہد

لفظ کی دریافت سے بازیافت تک

انسان دنیا میں آتا ہے تو محض ایک جان دار کے روپ میں، جسے صرف بروقت خوراک اور موسموں کے تغیراتی مدوجزر سے پناہ چاہیے ہوتی ہے، اور اپنی ان دو جبلتوں کا اظہار وہ ان ضروریاتِ زندگی کے انتہائی مطلوب لمحوں میں رو کر کرتا ہے۔۔۔ چیختا ہے، چلاّتا ہے، اس لئے کہ وہ اس وقت ''لفظ'' سے نا آشنا ہوتا ہے، اپنے جذبات اور احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کا ہنر نہیں جانتا اسی لئے ضرورت پوری ہوتے ہی خوابوں کے اُن مرمریں، حسین جزیروں میں کھو جاتا ہے جن کی خوب صورتی شعور کی حدوں میں داخل ہونے کے بعد بھی کہیں لا شعور کی نہاں ترین تہوں میں خوابیدہ رہ جاتی ہے۔ اور پھر جنہیں '' لفظ'' سے محبت ودیعیت ہوتی ہے اُن کے تخیل میں لفظوں کے تاج محل بننے لگتے ہیں۔ شعور کی پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر وہ لفظ کی محبت میں مبہوت ہو جاتے ہیں کہ وہ جان جاتے ہیں کہ لفظ ہی وہ ذریعہ ہیں جو گہرے میٹھے جذبات کا اظہار کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ فکر کے کسی ایسے ہی موڑ پر پہنچ کر احمد حسین مجاہد نے اقرار کیا

کن اچھوتے راستوں پر فکر ہے گرمِ سفر — لفظ ہیں سب محوِ حیرت، رنگ ہیں بکھرے ہوئے

اور یوں ایک شاعر کا۔۔۔ ایک احمد حسین مجاہد کا شعری سفر آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ''لفظ'' رنگِ غزل بننے اور احساس تصویرِ غزل ہونے کے مراحل میں دریافت کے پہلے پہلے قدم اٹھانے کو تیار ہوئے۔ احساسات کی نوکیلی، کٹیلی کرنیں آئینۂ دل پر پڑنے لگیں۔ یہاں سے مجاہد نے لفظ کو کھوجنا شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہر سچے لفظ میں اپنا عکس پایا تو کہا

جذبوں کے ابلاغ میں سچا لفظ ہوں میں — بھید بھری آنکھوں سے گہرا لفظ ہوں میں

بھید بھری آنکھوں کی گہرائی ناپنے کے لئے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔ کائنات کی سچائیوں، حقیقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، زمینی فاصلوں کو آسمانی راستوں میں بدلنا پڑتا ہے، موسموں کی صعوبتیں سہنی پڑتی ہیں، عشق سمندر میں ڈوبنا ابھرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر جذبوں کو لفظوں کی مزّین و مرّصع پوشاک مہیا ہوتی ہے۔ یہ

تبھی ہوتا ہے جب کسی کے چاروں طرف عشق کی آب و ہوا میسر ہو اور اس کا وجود بھی اسی سرشاری کی کیفیت کا ادراک کرے۔ بے شک احمد حسین مجاہد نے اپنے مشاہدات کو اتنا گراں مایہ محسوس نہیں کیا اور کہہ اٹھے

نا معتبر حوالہ ہیں میرے مشاہدات   دیکھی ہے میں نے روزنِ زنداں سے کائنات

پھر بھی وہ اپنے اردگرد ایک حقیقی عشق کی فضا بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہے اور کہتے رہے

ہر لفظ کو نوید بقائے دوام کی   میرے سخن کی آب و ہوا عشق سے ہوئی

یہاں وہ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ، کہ انسانی حسیات محدود ہیں اور جو ہے، اسے دیکھنے کے لئے آنکھ ناکافی سہارا ہے، اپنے مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں اور تمام تر مزاحمتوں کے باوجود احمد حسین مجاہد لفظوں کی حرمت کا بھرم قائم رکھنے میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ کیسے کیسے دھوکے ، کیسے کیسے رویے ، کیسے کیسے نشیب و فراز زندگی میں پائے لیکن وہ کہتے رہے

میں کیسے کسی لفظ کی توہین کروں   رکھنا ہے ہر اک شعر کا پندار مجھے

یہاں جو بات قاری کے ذہن میں احمد کا قد کاٹھ بلند کرتی ہے وہ ''لفظ'' سے ان کی محبت، ''لفظ'' پر ان کا اعتماد، ''لفظ'' کا ان پر احسان اور پھر ان سب کے ساتھ ''لفظوں'' پر ان کی دسترس ہے۔ لکھنا، لکھے جانا، گفتگو کرنا ، پڑھنا، کسی کا ان کو پڑھنا، جیسی تمام وارداتیں لاشعوری طور پر احمد کی نظموں اور غزلوں میں در آئی ہیں، مثلاً

''میرے ہاتھ کی پشت پر/ نرم ہونٹوں سے کوئی/ محبت سے اک فیصلہ لکھ رہا ہے''   **(پابہ گل)**

یا۔۔۔۔''مجھے قدرت نے لفظوں کو/ برتنے کا ہنر بھی/ بخش رکھا ہے''   **(ابلاغ)**

اسی طرح بلند پایہ نسائی شاعری کی پہچان، **پروین شاکر کے لئے ایک نظم** میں کہتے ہیں

''فضا تازہ غزل میں/ اک اچھوتے لفظ ہی کو/ قافیہ کرنے کے درپے تھی''

ایک اور نظم کا ٹکڑا دیکھیے

''اب تمہیں احساس ہوگا/ کرب کیا ہے/ کرب کا احساس کیا ہے/ میں تو ان لفظوں سے پہلے ہی بہت مایوس تھا''

(A Touch of Poetry)

ایسے ہی ذات کو کسی گفتگو کا حصہ بنانے اور خود کو کسی کی گفتگو کا حصہ بنے دیکھنے کی خواہش ان شعروں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے

اک عذاب ہوتی ہے ، رمزِ آشنائی بھی   مجھ سے میری تنہائی گفتگو بھی کرتی ہے

اور۔۔ ؎

اک وہم سے میں نکلوں اک راہ وہ چل دیکھے

میں اس کو پڑھوں احمدؔ وہ میری غزل دیکھے

لفظوں میں اپنے حساس لمحے ڈھالنے والا شاعر، شعروں اور نظموں کے آئینہ خانوں میں اپنے لہجوں کو

عکس کرتے ، انگلیاں فگار کر لینے والا تخلیق کار، لفظ کی پہچان رکھنے والا لکھاری، لفظ کی حرمت کو خود مٹ کر برقرار رکھنے والا انسان، لفظ کے حسّاس ترازو میں رویوں کو تولنے والا منصف، اور لفظ کو ایمانداری سے برتنے والا فن کار ہی دراصل ''لفظ'' کا غم خوار اور قدر دان ہوتا ہے ۔ لفظ انسان کی ذات کی پہچان کرواتا ہے ، یہی لفظ انسان کے شعور اور ادراک کی پہچان کرواتا ہے۔ لفظ ہی کسی انسان کا خارج کی دنیا سے رشتہ جوڑتا ہے۔ لفظ زبان سے ادا ہوتا ہے اور شخصیت دوسروں پر القا ہو جاتی ہے ، کہ تمام بڑے بڑے مفکرین کا قول ہے کہ انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہے۔ کسی بھی انسان کی لاشعوری نفسیات اس کے فن میں جھلکتی ہے۔ دیکھنے سننے اور پڑھنے والے ، فن کار کی تخلیق سے ہی اس کی دلی کیفیات اور سوچ کے دھاروں کا اندازہ لگا لیتے ہیں، اور بڑا انسان وہی ہوتا ہے جو کائنات کی خوابیدہ قوتوں، مخفی حقیقتوں اور ظاہری حسن و جمال پر غور و فکر کرتا ہو، جس کی سوچ، جس کا تخیل، جس کا لاشعور انسان کی ارفع ترین صورتِ حال کی غمّازی کرتا ہو۔ اور ارفع و اعلیٰ کی تعریف میں یہ بات ہی بڑی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں ہمیں کائنات کے متعلق ایک ارفع سوچ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، حسن و عشق کی وارداتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ہجر و وصال کے ذائقے بھی محسوس ہوتے ہیں اور لاحاصلی اور تنہائی کا دکھ بھی زخمی کرتا ہے لیکن کہیں بھی لفظوں کے شتر ، بے کجاوہ اور بے مہار نہیں ہوتے ۔ روایتی غزل گوئی اور جدید تمثالئے بین بین چلتے ہوئے ایک نئی تہذیب کو جنم دیتے ہیں ۔۔۔ وہ تہذیب ، جس کی جاگیر خوب صورت تشبیہیں، نادر ردیف قافیے ، غیر معمولی بحریں، نئی نکور ترکیبیں اور شان دار الفاظ ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر احمد حسین مجاہد کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ لفظ آغازِ شعور میں تو اظہارِ ذات کے لئے سامانِ لذّت فراہم کرتے رہے ہیں۔ انسان کو کہہ دینے یا لکھ دینے سے جو ذہنی آسودگی اور اطمینانِ قلب میسر آتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں، لیکن جب انسان حوادث کی بھٹی میں تپتا ہے، جب اسے زمانے کے سرد و گرم کی ہوا لگتی ہے، جب اسے جھوٹے ''لفظ'' دھوکہ دیتے ہیں اور جب وہ لفظوں کی بازی گری کا شکار ہوتا ہے اور لفظ کی ستم ظریفی سے گھائل ہوتا ہے تب اچانک اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ لفظوں کا سرمایا تو دراصل اسے دکھوں کو محسوس کرنے کی اعلیٰ ترین سطح پر لے آیا ہے جہاں سے واپسی کے راستے مفقود ہیں۔ ایسے ہی کسی مقام پر احمد حسین مجاہد کہہ اٹھتے ہیں،

مجھ کو زعم تھا لفظ مرا سرمایا ہیں   لیکن لفظ تو جاں لیوا بیماری نکلے

اور لفظوں کے اس رنگا رنگ ، سجے سجائے میلے میں غزلیں کہتے ، نظمیں لکھتے احمد حسین مجاہد کو اپنی ذات کے ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور نہ ہونے کے کرب کا ادراک بھی ہوتا ہے، دوسری طرف ان کی غزلوں میں رومان پرور فضا کی رو میں پُر اثر شعر بھی قاری کے ذہن و دل پر پیار کی کُن مُن بوندیں برساتے ہیں۔ سوچ اور تخیل کی اس انتہا پر جب کوئی فن کار اپنی شعوری فکر کی رو میں بہتا، یہ گیان حاصل کر لیتا ہے کہ وہ اس

کائنات کے بہاؤ میں بس ایک قطرہ ہے جو کسی بھی لمحے دریا میں مل کر بے وجود ہونے والا ہے تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اس کو ایک نیا وجود ملتا ہے۔ جب وہ اپنی اور ''لفظ'' کی بازیافت کرتا ہے۔ جب وہ قطرے سے پھیل کر دریا میں ملتا ہے، دریا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سوچ کا دائرہ کائنات کو محیط کر لیتا ہے۔۔۔۔تب۔۔۔زندگی اسے ''دھند میں لپٹا جنگل'' دکھائی دیتی ہے جس کی دریافت میں وہ لفظ لفظ اپنی نظموں اور غزلوں میں ڈوبتا ابھرتا ہے۔۔۔!

اور کائنات کے اس بحرِ بے کراں میں ڈوبتے ابھرتے احمد حسین مجاہد اس بے ثباتی اور فنا کے کرب کو جھیلتے نظر آتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ وقت کی تختی پر نام لکھے جاتے ہیں پھر کوئی موجِ عمرِ رواں ان ناموں کو اچھال کر عدم آباد کرتی ہے اور زندگی کے منظر نامے پر نئے نام جگہ پاتے ہیں۔۔۔وہ اس قانونِ فطرت کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔۔۔ان کے نزدیک زندگی ''لفظ'' کے کسی احساس سے آغاز ہوتی ہے اور ''لفظ'' ہی پر کوئی خوب صورت اختتام ہوتا ہے ۔اس کا اظہار اس شعر میں دیکھیے

عبارتوں میں نئے لفظ روح پھونکیں گے میں حاشیے سے بھی ہو جاؤں گا حذف سائیں

اس عجز و انکساری کی منزل پر بے شک احمد حسین مجاہد دنیا کے بہت جلد بھول جانے والے رویے پر بحث کر رہے ہیں لیکن انہیں یقین ہونا چاہیے کہ لفظ کو خلوصِ دل و خلوصِ نیت کے ساتھ برتنے والے اتنی آسانی سے منظر نامے سے غائب نہیں ہوتے ، اور ابھی تو ان کا شعری سفر راستوں میں ہے، ابھی تو وہ قرطاس و قلم کے عروج کی دنیا میں ہیں اور وہ اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہے تو عنوان ، مضمون اور حاشیہ سب پر چھا جائیں گے۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

احمد حسین مجاہد غزل کا ایک خوش فکر شاعر ہے۔ ندرت کا متلاشی اور خلوص کا خواہاں ہے۔ اُس کے ہاں تازہ خیال کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہنے کا رویہ ملتا ہے، جس نے اُس کی غزل میں ایک خوش گواریت کو قائم رکھا ہے۔ غزل میں اُس نے 'عشق' پر اپنی اساس رکھی ہے۔ وُہ سمجھتا ہے کہ وہم و گماں کے چنگل سے عشق ہی رہائی دلا سکتا ہے۔ عشق جو 'اذانِ بلال' میں جھلکتا ہے اور عشق جو خلقِ خدا کو مطیع کر لیتا ہے۔ مجاہد نے اپنے سخن کی آب و ہوا میں بیشتر عشق ہی کے رنگ و بُو سے استفادہ کیا ہے۔ بالائی علاقوں کی نمائندگی کرنے والے اِس نوجوان شاعر کے پاس چٹانوں کو کاٹتے ہُوئے جھرنے کی سی شدت ہے جس کی تہذیب سے وُہ پتھروں کو تراش لینے کے فن سے آشنا ہو سکتا ہے۔

خاور اعجاز (ملتان)

چند تاثرات

☆ آپ نے آج کے مسائلِ حیات کو جس طرح تغزل کے شیرے میں گوندھ لیا ہے وُہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆ احمد حسین مجاہد کی شاعری بادِ شمال کی چبھتی ہُوئی تربیتوں سے جوان ہونے والے کے دکھوں کا ثمرہ ہے۔ جھولتی شاخ کے پتوں کی گنگناہٹوں سے مزین غزل، درِ نظارہ کی سرخیوں سے خوش بدنی لے کر آ موجود ہونے والی نظم، اس کی شدتِ احساس کی ہمنوا ہوتی دیکھی جاتی ہے۔ مجاہد تغزل کے آثار جمع کرنے میں کامیاب ہے۔ اُس کی شاعری ہاڑ کی سخت گرمی میں اُمڈی ہُوئی بدلی ہے جو برس پڑے گی تو حدتِ وجود کو تھپیڑے بھی لگائے گی اور بوسے بھی دے گی۔

آصف ثاقب

☆ آپ کے ہاں فطرت سے وابستگی اور محبت وافر ہے۔ یہ دونوں ہمہ گیر جذبے اچھی شاعری کے بنیادی جوہر ہیں۔

نصیر احمد ناصر

☆ احمد حسین مجاہد منفرد لہجے کا شاعر ہے، اُس کی شاعری ریاض کے مرحلوں سے گزری ہے اسی لیے نکھری ہُوئی ہے۔

ڈاکٹر صابر کلوروی

☆ احمد حسین مجاہد توازن و اعتدال کا شاعر ہے اور صاحبانِ بصیرت پر اُس کے چراغِ سخن کی جھلمل جھلمل کرتی کرنیں واضح ہیں۔

ڈاکٹر رؤف امیر

☆ احمد حسین مجاہد بیسویں صدی کے آخری عشرے کے اُن صاحبِ توفیق غزل نگاروں میں سے ایک ہے جن کے فن کی تازگی اور روشنی میں اکیسویں صدی کی اردو غزل اپنی سہانی مسافت کے اگلے پڑاؤ کے لیے رختِ سفر باندھے گی۔

ڈاکٹر افتخار مغل

☆ احمد حسین مجاہد کی شاعری پُر اَسرار رومان پرور فضاؤں کی ایسی نادر تمثالوں پر مشتمل ہے جہاں حقیقت، تخیل ،بصیرت اور وجدان لمحہ بہ لمحہ باطنی کیفیات کی مصوری کرتے نظر آتے ہیں۔

عامر سہیل

☆ بے ساختگی اور خلوصِ جاں احمد حسین مجاہد کی تحریر اور شعر کے بنیادی عناصر ہیں۔ مجاہد ایک شاندار ادبی ماضی رکھتا ہے اور اس حوالے سے اُس کا مستقبل بھی تابناک ہے۔

خالد خواجہ

احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)

ہُوں کہ جب تک ہے کسی نے معتبر رکھا ہوا
ورنہ وُہ ہے باندھ کر رختِ سفر رکھا ہوا
مجھ کو میرے سب شہیدوں کے تقدس کی قسم
ایک طعنہ ہے مجھے شانوں پہ سر رکھا ہوا
میرے بوجھل پاؤں گھنگھرو باندھ کر ہلکے ہُوئے
سوچنے سے کیا نکلتا دل میں ڈر رکھا ہوا
اک نئی منزل کی دُھن میں دفعتاً سرکا لیا
اُس نے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھا ہوا
تُو ہی دنیا کو سمجھ پروردۂ دنیا ہے تُو
میں یونہی اچھا ہُوں سب سے بے خبر رکھا ہوا

☆

گزر رہی ہے جو مجھ پر بتا کے لے آئے
کوئی نہیں ہے جو اُس کو منا کے لے آئے
گزارنی تھی کڑی شب سو اُس گلی سے ہم
چراغِ نقشِ کفِ پا اٹھا کے لے آئے
مگر یہ ہم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ
وہاں سے راکھ تو اب کوئی جا کے لے آئے
وُہ اپنی کار گزاری کی داد چاہتے ہیں
جو عاجزی میں قرینے ریا کے لے آئے
بس اک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمد
اُسے بھی سامنے ہم خود ہَوا کے لے آئے

☆

احمد حسین مجاہد

پہاڑ پر مجھے رستہ دکھائی دیتا ہے
کئی دنوں سے وُہ تنہا دکھائی دیتا ہے
اتارتا ہوں میں تصویر اُس کی لفظوں میں
مجھے خیال کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
فرازِ کوہ سے جب دیکھتا ہُوں بستی کو
تو اُس کا گھر بھی قفس سا دکھائی دیتا ہے
زباں سمجھتا ہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی
یہ شہر مجھ کو اجڑتا دکھائی دیتا ہے
برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چاند اترا ہے
مجھے یہ وقت دعا کا دکھائی دیتا ہے
یہ کس دیار کی مٹی مرے خمیر میں ہے
کہ جسم روح سے ہلکا دکھائی دیتا ہے

☆

سرِ آئینۂ ہر ذرۂ صحرا چمکتا ہے
تری پلکوں کا سایہ سا سراب آسا چمکتا ہے
جھٹک کر ڈالتی ہے جب وُہ بھیگے بال شانے پر
تو نیچے دُور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے
کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹی کو
بدن کے ریشے ریشے میں اک آئینہ چمکتا ہے
یہاں سے کوئی گزرا ہے یقیناً مجھ سے پہلے بھی
درِ امکاں پہ اب بھی شبنمی بوسہ چمکتا ہے
جب آنکھیں خاک ہو جاتی ہیں احمد تب کہیں جا کر
بس اک پل موجۂ خوشبو کا نقشِ پا چمکتا ہے

احمد حسین مجاہد

اپنی تخلیق سے کچھ داد تو پائی ہوتی
صفحۂ خاک پہ تصویر بنائی ہوتی
میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات
اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہوتی
چار سُو بکھری یہ آیات تلاوت کرتا
دشت و کہسار کے مکتب میں پڑھائی ہوتی
لے گیا کوئی رسالت، کوئی اعجازِ ہنر
میں نے اے کاش اگر آگ ہی لائی ہوتی
جز ترے اور کو میں دل میں جو آنے دیتا
اُس نے اِس دشت میں دیوار اٹھائی ہوتی
میں کسی گم شدہ دریا پہ کھڑا ہوں احمد
موج ورنہ مرے سر تک کوئی آئی ہوتی

☆

کوئی خواب میرے وجود میں کہیں ریزہ ریزہ بکھر گیا
مرے ہاتھ کچھ نہ لگا مگر، مرے سر سے بوجھ اتر گیا
وہی پاؤں چومے تھے جو کبھی، میں نے اضطرابِ وصال میں
وہی پاؤں جاتے ہوئے کوئی، مرے دل پہ رکھ کے گزر گیا
مجھے لینا دینا تو کچھ نہ تھا، مری بے کلی یونہی رات کو
مجھے اُس گلی میں جو لے گئی، میں گلی سے ہو کے گزر گیا

☆

بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے
یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا

☆

احمد حسین مجاہد

دشت تھا ، دھوپ تھی،وُہ یاد بھی آیا ہُوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ میں انت مچایا ہُوا تھا
خواب، مٹی کا دیا، نام ،مقام اور کلام
اُس کے قدموں میں رکھا جو بھی کمایا ہُوا تھا
میری ناکام محبت تھی وُہ لیکن اُس نے
مجھ کو مرنے سے بہر حال بچایا ہُوا تھا
چُپ لگی ایسی کہ پوچھا بھی تو بولا نہ گیا
ابتدا میں تو بہت شور مچایا ہُوا تھا
کچھ تو اظہارِ محبت بھی مرا سرسری تھا
کچھ وُہ بے درد بھی انکار پہ آیا ہُوا تھا
اُس نے کچھ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا
میرا سایہ بھی پسینے میں نہایا ہُوا تھا
مجھ سے لپٹا تو مری پشت سے احمد اُس نے
میرے دشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہُوا تھا

☆

خود رو تھا دلوں میں کھل گیا تھا
میرا بھی عجیب سلسلہ تھا
کھڑکی پہ جھکی ہُوئی تھیں بیلیں
کمرے میں کوئی معاملہ تھا
پتھر میں دراڑ آ رہی تھی
یا مجھ سے کسی نے کچھ کہا تھا
تُو اور کہیں سے آ رہی تھی
میں اور کہیں گیا ہُوا تھا

☆

احمد حسین مجاہد

آسمانوں سے فرشتہ تو نہیں اترے گا
شعر اتریں گے،صحیفہ تو نہیں اترے گا
پار جانا ہے تو دریا میں اترنا ہو گا
سوچتے رہنے سے دریا تو نہیں اترے گا
بات بے بات نہ یاد آئے خدوخال سمیت
وُہ مرے دل سے کچھ ایسا تو نہیں اترے گا
مکتبِ عشق سے تحصیلِ جنوں کرتا ہُوں
میرے شانے سے یہ بستہ تو نہیں اترے گا
ہو گئے صبح کے آثار ہویدا بھی تو کیا
اس قفس میں کوئی زینہ تو نہیں اترے گا
غم کے اظہار میں کیا چیز ہے مانع احمد
سر ہی اترے گا، یہ نشہ تو نہیں اترے گا

☆

میں گھر سے دُور تھا ، تنہا تھا، بے سہارا تھا
مجھے کسی نے بہت دُور سے پکارا تھا
بہت بھلی تھی وُہ شاخوں سے پھوٹتی ہوئی لَو
شجر کی اوٹ میں شاید کوئی ستارا تھا
زمیں پہ اترا جب انسان تو مرے رب نے
کتاب بعد میں پہلے دیا اتارا تھا
یہ خشک چشمہ ،یہ ٹوٹے مکاں،یہ اجڑا دیار
اسی جگہ پہ کبھی گھونسلہ ہمارا تھا
نمازِ عصر پڑھی تھی مکاں کے ملبے پر
تلاوتِ غمِ انساں میں دن گزارا تھا

احمد حسین مجاہد

تجھ حسن سے معاملہ کس آن میں ہُوا
میں تَو جواں ہی میر کے دیوان میں ہُوا
میری متاعِ اول و آخر ہے میرا عشق
وُہ عشق جو کہ عشق کے امکان میں ہُوا
سر پر بنا لیا ہے پرندے نے گھونسلہ
غافل میں خود سے ایسا ترے دھیان میں ہُوا
اُس کو طرح ملی مرے فکر و شعور سے
جو فیصلہ بھی وقت کے ایوان میں ہُوا
میں دکھ تھا کائنات کا جب حد سے بڑھ گیا
میرا ظہورِ صورتِ انسان میں ہُوا

☆

وقت کی رفتار ہو جاؤں گا میں
اتنا پر اَسرار ہو جاؤں گا میں
جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی
جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں
بے نیازانہ گزر جائے گا تو
گاؤں کا بازار ہو جاؤں گا میں
دیر سے چشمِ شفق آسا میں تھا
اب سرِ رخسار ہو جاؤں گا میں
دیکھنا ڈھونڈے گی جب منزل مجھے
راہ کی دیوار ہَو جاؤں گا میں

☆

احمد حسین مجاہد

CHILD LABOUR

مرے بابا نہیں ہیں ناں۔۔!
میں تپتی دوپہر میں
شہر کی سڑکوں پہ اپنے جسم کا
ایندھن جلاتا ہُوں
تو گھر میں چولہا جلتا ہے
مرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں
پاؤں سے چپکی ہُوئی یہ تارکول ریت
میرے ساتھ روزانہ مرے بستر میں جاتی ہے
مجھے اپنے بدن سے
شہر کی روندی ہُوئی سڑکوں کی
میلی باس آتی ہے
مرے بابا نہیں ہیں ناں۔۔۔!

خدا نہیں آ رہا

پھر اک دن
اِس غبار آلود رستے سے/کوئی درویش آئے گا
وُہ بستی کے کناروں پر کھڑی
خلق خدا کو گودڑی میں بھر کے
بستی کے چوراہے میں انڈیلے گا
دلوں کو چیرتا بے نُو رسناٹا
پھٹی آنکھوں سے اُس کی سمت دیکھے گا
فضا میں جا چکے اُن قافلوں کی گرد ہَو گی
جن کا کارِ منصبی ایسے گئے گزرے علاقوں میں
کہیں خیمے، کہیں گندم، کہیں کمبل
کہیں بے حوصلوں میں حوصلہ تقسیم کرنا ہے
مگر کب تک؟ کہ اب خلق خدا اک بار پھر
اپنے خدا کی منتظر ہے

دوسرے دیسوں سے آئے قافلے
کب تک بروئے کار آئیں گے؟
چٹختی پسلیوں کے روزنوں سے
بھوک باہر جھانکتی ہَو گی/کئی اک ڈولتے پنجر
سرک کر گودڑی کے سائے میں
درویش کے پیروں سے لگ کر پوچھتے ہَوں گے
خدا کب آئے گا؟
صدیوں سے ہم اپنے خدا کی راہ تکتے ہیں
تو پھر درویش لاٹھی کے سہارے/اُٹھ کھڑا ہَو گا
کہے گا
''میں تمہارے نام اک پیغام لایا ہُوں خدا کا
خالق کون ومکاں یہ کہہ رہا ہے
چھوڑ دَو یہ سہل انگاری
اٹھاؤ ہل، کدالیں، بیلچے اپنے
سنو۔۔۔! افلاک سے کوئی نہ اترے گا''

احمد حسین مجاہد

GUILTY LOVE

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
رگوں میں دوڑتی وحشت بھی کانپ اٹھتی ہے
یہ مرحلہ جو محبت میں ہے مجھے درپیش
اک ابتلا ہے اور اس کا بیان سہل نہیں
بس اک خدا ہی مرا چارہ ساز ہے لیکن
خدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے

وُہ حسن جس کے تقدس سے شرمسار تھا عشق
اب اُس کی آنچ مرے دل کو گدگداتی ہے
بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ ناکردہ
اک آگ سی مرے سینے میں لہلہاتی ہے
مجھے خود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے
خود اپنے ڈر سے مری سانس پھول جاتی ہے
بس ایک بار دھڑکتا ہے بے طرح مرا دل
اور اس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے

گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہُوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے
دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
خدا سے کیسے کہوں، بات ہی کچھ ایسی ہے

ٹوٹی چوڑیاں

بہت کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا
مگر پھر بھی
کوئی ٹوٹی ہُوئی چوڑی
کہیں سے مل ہی جاتی ہے
کبھی تکیے کے نیچے سے
کبھی بک شیلف سے
جیبوں سے
البم سے

تو پھر وُہ پوچھتی ہے
تم سے ملنے کون آیا تھا
یہ کس کی چوڑیوں سے تم
مرے جیون کو گھائل کر رہے ہو
کون ہے وُہ؟
میں اسے کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہَوگا
مگر ٹوٹی ہُوئی یہ چوڑیاں۔۔۔۔

احمد حسین مجاہد

ناجنس کا لمس

وُہ چلتی
تو اس کے دوپٹے پہ
کاڑھے ہوئے پھول
اک ایک کر کے
فضا میں بکھرتے
نئی کونپلیں پھوٹتیں
پھول کھلتے
فضا میں بکھرتے
کوئی پھول جب اپنے ناجنس کا لمس پاتا
تو شعلہ بھڑکتا
کہیں آئینوں سے
کہیں پانیوں سے
مچلتی ہُوئی راکھ اڑتی
تماشائی سب دیکھتے
دیکھتے اور رستہ بدلتے
مگر میں۔۔۔!
مجھے ان پر اسرار پھولوں کی
مانوس خوشبو نے
کچھ ایسا پاگل کیا
میں فضاؤں میں اڑتے ہوئے پھول چننے لگا
پھول چنتا رہا
مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہانی مری
یہ مرے ہاتھ دیکھو۔۔۔!
مرے ہاتھ ایسے نہیں تھے۔۔۔!!

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

عتیق احمد عتیق (مالے گاؤں)

اپنی حد سے جب گزر جائے گا لہرا پیاس کا
ایک قطرے میں سمٹ آئے گا دریا پیاس کا

پانی پانی ہو گیا،لَو دیتا صحرا پیاس کا
کس کے ہونٹوں سے لپک اُٹھا یہ شعلہ پیاس کا

تُو بہ تُو سمتوں کو بھی،گلہائے خوں سے بھر دیا
طے کیا کچھ اس جتن سے ہم نے رستہ پیاس کا

اپنے ہی دم خم کو چاٹے ہے،کڑکتی دھوپ میں
جلتے لمحوں کا شجر،پھیلا کے سایہ پیاس کا

سچ تو یہ ہے وہ مِری ہی جستجو کا کرب تھا
لے اُڑا مجھ کو سرابوں تک جو لہرا پیاس کا

برف کی یہ سِل نہ ٹوٹی،تیشۂ مَے سے تو ہم
دھوپ ہی پی کر ،کریں گے حل معمّہ پیاس کا

دکھ کی پتھریلی چٹانیں ،بہہ نکلتے توڑ کر
دل کے جھرنوں میں کہاں تھا اتنا بوتا پیاس کا

قطرے قطرے،دانے دانے کو سراپے ہے عتیقؔ
بھوک کی ٹہنی پہ بیٹھا،اک پرندہ پیاس کا

عتیق احمد عتیق

جب بھی ہوتا ہے کناروں کا سفر پانی میں
پڑنے لگتے ہیں کئی اور بھنور پانی میں

پھر تو کچھ اور بھی ہو جاتی ہے پانی پانی
مجھ سے ملتی ہے جو پانی کی نظر پانی میں

بود و نابود کے سنگم کا پتہ دیتا ہے
تہہ نشیں ہو کے،جزیروں کا نگر پانی میں

دیدہ ور انفس و آفاق کی ایک ایک جھلک
دیکھ لیتے ہیں،بہ امکانِ نظر پانی میں

ماند پڑ جاتا ہے مٹّی سے روابط کے بغیر
آگ برساتی ہواؤں کا اثر پانی میں

لہلہاتے ہیں تو بن جاتے ہیں آنکھوں کا سمان
پھلتے اور پھولتے خوابوں کے شجر پانی میں

ریت پر لوگ بنا لیتے کئی تاج محل
ناؤ کاغذ کی چلا لیتے اگر پانی میں

اُن سے موجوں کو پناہیں تو میسّر ہیں عتیقؔ
ہم نے پانی کے بنائے ہیں جو گھر پانی میں

قیصر شمیم (ہوڑہ)

اب اپنی ذات سے آگے سفر کیا جائے
ہر ایک مرحلۂ درد ، سر کیا جائے

شکارِ کم نظری کیوں ہو کوئی میری طرح
کشادہ زاویۂ ہر نظر کیا جائے

رہی ہے اپنی روش مختلف تو پھر ہر گام
خلافِ رسم ہی شام و سحر کیا جائے

فضائے شہرِ ستم کچھ نہ کچھ تو بدلے گی
جو بے اثر ہیں،انہیں با اثر کیا جائے

نگاہِ مفتی و منصف سے ڈرتے رہنا کیا
تمام کارِ جنوں بے خطر کیا جائے

اگر سیاہِ شبِ تیرہ روک دے ہم کو
تو نصب خیمہ سرِ رہ گذر کیا جائے

کوئی جو پوچھے کہ گزری ہے کیا مِرے دل پر
تو ذکر زخموں کا بے چشمِ تر کیا جائے

غزل کی شرط ہے قیصرؔ کہ گفتگو اپنی
طویل ہو تو اسے مختصر کیا جائے

قیصر شمیم

مجھے رہا تو اسی بات کا ملال رہا
کہ اس کے آئینۂ دل میں ایک بال رہا

اسے خیال رہا بھی تو کیا خیال رہا
کہ میرا زخم بہر حال اک سوال رہا

عروج ہم کو ملا بھی تو چار دن کے لیے
جو لازوال ازل سے تھا، لازوال رہا

اسی سے کتنے چراغوں نے روشنی پائی
''وہ اک چراغ جو جلنے میں بے مثال رہا''

تمہیں بتاؤ،تمہاری نظر کے ہوتے ہوئے
ہمارے زخم کو کب شوقِ اندمال رہا

خدا کرے کہ تمہاری حیات میں قیصرؔ
رہے نہ کرب وہی، جو گزشتہ سال رہا

حامدی کاشمیری (سری نگر)

رات بھر آنکھ خوں فشاں رکھنا
اپنے ہونے کا کچھ نشاں رکھنا

دشتِ آفات سے گزر ہو گا
اپنے ہمراہ آسماں رکھنا

اپنی پہچان مٹ نہ جائے کہیں
کوئی دیوار درمیاں رکھنا

وادیٔ مرگ سے گزرنا ہے
سورۃ النّاس وردِ جاں رکھنا

تیز گامی سے کون روکے گا
کچھ خیالِ فتادگاں رکھنا

دشت سے ہو گزر تو ابرِ رواں
سر پہ کچھ دیر سائباں رکھنا

حامدی کاشمیری

دشت ہے، خلدِ بریں ہے، کیا ہے
واہمہ حسنِ یقیں ہے، کیا ہے

آسمانوں سے بھی آگے تھا میں
پاؤں کے نیچے زمیں ہے کیا ہے

وہ بہت دور گئی ہے مجھ سے
میرے پہلو کے قریں ہے، کیا ہے

اک ذرا شعر میں ڈوبا تھا میں
خون آشفتہ جبیں ہے کیا ہے

رونے ،ہنسنے کی صدا آتی ہے
اس خرابے میں مکیں ہے،کیا ہے

آنکھ میں تیرگی بھر دیتا ہے
یہ کوئی مہرِ مبیں ہے، کیا ہے

نصرت ظہیر (دہلی)

شاخوں پہ درختوں کو قربان نہیں کرتے
انسان جو کرتے ہیں حیوان نہیں کرتے

اس شوخ کی صورت میں کچھ رنگ عجب سے ہیں
آئینے کو ہم یوں ہی حیران نہیں کرتے

جو جسم سے مرتے ہیں وہ شور مچاتے ہیں
جو جان سے جاتے ہیں اعلان نہیں کرتے

کتنا دلِ سادہ کو سمجھایا تھا مت الجھو
انجان سے لوگوں سے پہچان نہیں کرتے

الجھے بھی تو الجھیں گے خود اپنے ہی دامن سے
اوروں کا جنوں والے نقصان نہیں کرتے

اتنا نہ اسے چاہو، کچھ سمجھو میاں نصرت
اس عمر میں وحشت کے سامان نہیں کرتے

نصرت ظہیر

زندگی مجھ پر نہیں سب پر ہے بھاری کیا کروں
ظلم،غصہ،بے بسی، بے اختیاری ...کیا کروں
یہ جو اک کم بخت سینے میں ہے، دشمن ہے مرا
بڑھتی ہی جاتی ہے اس کی بے قراری کیا کروں
رات پھر لے آئی ہے بے صبر بستر پر مجھے
پھر ہوا آنکھوں سے وہ اک درد جاری کیا کروں
کن گلستانوں میں لے آئی ہو مجھ کو میری جاں
اک کلی بھی تو نہیں ان میں ہماری کیا کروں
آرزو کا ایک دامن دور تک پھیلا ہوا
اور اس پر گھر ،گرہستی، ذمہ داری کیا کروں
چھوڑ کر آیا ہوں پیچھے دوستوں کی نخوتیں
سامنے ہے دشمنوں کی انکساری کیا کروں
خوں ٹپکتا ہے نہ کوئی درد ہوتا ہے کہیں
یہ ترا دستِ ہنر یہ زخمکاری کیا کروں
صرف آغوشِ جنوں ہے عشق کی جائے اماں
ہر طرف ہے حسن کی سرمایہ داری کیا کروں
دوستوں کی بھی نصیحت اب بری لگتی نہیں
چارہ سازی ہے نہ کوئی غم گساری کیا کروں

عنبر شمیم (کولکاتا)

عجب لمحہ تھا وہ جب یہ تہیہ کرلیا میں نے
بھرے گھر میں ہوں لیکن خود کو تنہا کرلیا میں نے

اگر جھونکا ہے راحت کا تو آندھی کی علامت بھی
ہوا کی بات پر کیسے بھروسہ کرلیا میں نے

خدا ہی جانتا ہے حشر کیا ہوگا مرے دل کا
کہ اک پتھر سے آئینے کا سودا کرلیا ہے

کسی سے کچھ نہ کہنا اندر اندر ٹوٹتے رہنا
یہیں سے راستہ جینے کا پیدا کرلیا میں نے

نہ تنہائی ستاتی ہے نہ خوف آتا ہے اشکوں سے
انھیں کو زندگی کا استعارہ کرلیا میں نے

تری یادوں نے جب بھی ساتھ میرا چھوڑنا چاہا
کھرچ کر دل کا اک اک زخم تازہ کرلیا میں نے

عنبر شمیم

کسی بھی طرح کٹے ، ہم سبیل کرتے ہیں
ابھی تو رات ہے قصہ طویل کرتے ہیں

عجیب چیز ہے احباب کا رویہ بھی
مری نظر میں مجھی کو ذلیل کرتے ہیں

معاملات ہم آپس میں کرلیں طے تو خوب
نہیں تو آیئے دونوں وکیل کرتے ہیں

ابھی ستارے بہت ہیں ہماری آنکھوں میں
انھیں سے شب بسری کی سبیل کرتے ہیں

بیان میں جو نہ ہو حسن لفظ و معنی کا
تو جان بوجھ کے مصرعے ثقیل کرتے ہیں

منافقوں میں یہ دولت نہیں لٹانی ہے
لو اپنے دل کے خزانے کو سیل کرتے ہیں

عبدالاحد ساز (ممبئی)

خود کو کیوں جسم کا زندانی کریں
فکر کو تختِ سلیمانی کریں

دیر تک بیٹھ کے سوچیں خود کو
آج پھر گھر میں بیابانی کریں

اپنے کمرے میں سجائیں آفاق
جلسۂ بے سروسامانی کریں

عمر بھر شعر کہیں ،خوں تھوکیں
منتخب راستہ، نقصانی کریں

خود کے سر مول لیں اظہار کا قرض
دوسروں کے لیے آسانی کریں

شعر کے لب پہ خموشی لکھیں
حرفِ ناگفتہ کو لافانی کریں

کیمیا کاری ہے فن اپنا سازؔ
آگ کو بیٹھے ہوئے پانی کریں

عبدالاحد ساز

پنپ رہی ہیں عجب آہٹیں زمانے میں
کہ جیسے اب کوئی دن ہوں قیامت آنے میں

در آرہی تھی کسی اجنبی نظر کی کرن
شگاف تھے تری پلکوں کے شامیانے میں

غلام گردشیں اک سمت،اک طرف زینہ
رکھا گیا ہے مجھے قید درمیانے میں

شکستِ وعدہ کی محفل عجیب تھی تیری
بُرا نہ ہونا تھا برپا ترے نہ آنے میں

جواب ڈھونڈنے میں لطف اہلِ دانش کو
مجھے سوال کو نغمہ بنا کے گانے میں

دیارِ یار میں صدیوں سے گونج ہے جس کی
''مِری بھی لے ہے اُسی راہ کے ترانے میں''

مِری شناخت مِرا واقعہ ہے سازؔ مگر
کہانی اور کسی کی مِرے فسانے میں

صادق باجوہ (امریکہ)

کیا رکھا ہے کس کو سنائیں، کون سنے ان باتوں کو
من مندر کی پوجا کرنے کون اُٹھے گا راتوں کو

اشکوں کے سوتوں کو بہتے ایک زمانہ بیت گیا
دور کہیں لے جاؤ اپنی یادوں کی سوغاتوں کو

بے کل نظریں رستہ تکتی، پتھرائی، بے نور ہوئیں
کس کے بس میں ہو پھر دیکھے خوشیوں کی باراتوں کو

اکھیاں مُوندے جاگتے رہنا سوچوں کے صحراؤں میں
چین گنوا کر، نیند چُرا کر، کیا ملتا ہے راتوں کو

لوٹ چلی پھر کالی بدلی برہا بَرکھا سے مل بیٹھی
آس کے مارے دیکھ رہے ہیں ساون کی برساتوں کو

جانے کب سے دیکھ رہا ہے آتے جاتے راہی کو
رستہ بھی پہچانے شاید انسانوں کی ذاتوں کو

انجانا سا خوف لئے کیوں دل میں صادقؔ پھرتے ہو
یار و غم تو کھا جاتے ہیں خوشیوں کے لمحاتوں کو

صادق باجوہ

کیوں بھلا دیوار و در ہلنے لگے
کیا کنول یادوں کے پھر کھلنے لگے

دور تک دیکھا افق تو یوں لگا
پھر زمین و آسماں ملنے لگے

کچھ ملالِ نارسائی تو نہ تھا
کیوں ریاکاری سے پھر ملنے لگے

منتظر کو اذنِ گویائی کے بعد
ڈس گئی چپ ہونٹ بھی سلنے لگے

وقت نے پھاہا رکھا تھا وقت کا
پھول زخموں کے مگر کھلنے لگے

لب کشائی کا یہ خُمیازہ ہے کیا
جرمِ ناکردہ کے پھل ملنے لگے

دیکھ لینا! آہ کی تاثیر بھی
ظلم کی پاداش جب ملنے لگے

اشہر ہاشمی (دہلی)

سماعت اور گویائی بہت کچھ سہتی جاتی ہے
مگر جو بات کہتی سنتی تھی، وہ رہتی جاتی ہے

ہوا کا کام ہے بہنا، مسلسل بہتی جاتی ہے
مگر سرگوشیوں میں جانے کیا کچھ کہتی جاتی ہے

کسی کی بے ارادہ بے سبب بے سمت صدقدمی
طبیعت میں تلون کی کہانی کہتی جاتی ہے

مری یہ ضد کہ اپنے آپ کو دہرانے سے روکوں
بہت کچھ مسترد کرنے کا دکھ بھی سہتی جاتی ہے

غزل گوئی کو اشہر ہاشمی کار زیاں کہہ لیں
یہی دستار وجہ سرفرازی رہتی جاتی ہے

کسی انکار کو وجہ خرابی کیا کہوں اس سے
زیادہ سے زیادہ خوبی یکجہتی جاتی ہے

کمال بے نیازی ہے کہ ہے آوارہ پن اس کا
رواں لہروں پہ کشتی بے ارادہ رہتی جاتی ہے

اشہر ہاشمی

کہیں پرواز کو یہ آسماں کچھ کم پڑا ہوگا
پرندے کا لہو شائد تبھی مدھم پڑا ہوگا

کسی کو یہ غلط فہمی تمنا اک قدم بھر ہے
کسی سے زیر ہونے کے لئے عالم پڑا ہوگا

زمینیں دوسروں پر تنگ کرنے والے دیکھیں تو
کہیں نزدیک ہی اک خطہ با ہم پڑا ہوگا

مسیحا کے گزر کی اطلاع عام آتے ہی
تن مردہ میں بیماروں کے کچھ تو دم پڑا ہوگا

جنہیں آفاق میں ہر سمت تاریکی نظر آئے
نہ جانے کیسے ان کے ہاتھ جام جم پڑا ہوگا

کوئی موضوع ہو تم سے بھی تھوڑی بات کرتا ہوں
ذرا نٹ کھول کر دیکھو مرا کالم پڑا ہوگا

غزل گوئی میں اشہر ہاشمی کا لوٹ کر آنا
جبین بے نوائی پر یقیناً خم پڑا ہوگا

احمد منظور (ممبئی)

ہیں سلامت سوچ کے شہپر مرے پیشِ نظر
دور تک مہرومہ واختر مرے پیشِ نظر

اک سعی ناکام سایوں کی ہماری پشت پر
اور ڈھلتی شام کا منظر مرے پیشِ نظر

نیم کا اک پیڑ کڑوا سا پیاؤ کے قریب
پیاس ہے اور دھوپ کا لشکر مرے پیشِ نظر

وحشتوں کی گرہیں کھولیں عقل کے ناخون نے
طشت میں لایا گیا جب سر مرے پیشِ نظر

لاشعوری تہہ میں جاگ اٹھتی ہے جب انگار سوچ
جھلملا اٹھتا ہے اپنا گھر مرے پیشِ نظر

ابروؤں کے سب اشارے، چشم کی فنکاریاں
لاکھ ہوں پردے کے پیچھے پر مرے پیشِ نظر

نور سے خالی نگاہیں، لمس سے عاری بدن
رقص میں پریاں قطار اندر مرے پیشِ نظر

ڈور سے ٹوٹی ہوئی کٹھ پتلیوں کے مثل ہیں
سب تماشائی نشستوں پر مرے پیشِ نظر

بن لیا ہے میں نے اپنے گرد شہرت جال سا
ہیں بصد آداب دانشور مرے پیشِ نظر

احمد منظور

محفلیں چلتی رہیں گی گھر بھی چلنا چاہیے
رات کافی ہو چکی ہے اب نکلنا چاہیے

ہے تھکن تو بے دھیانی تان کر سو جایئے
ہاں مگر آنکھوں میں رنگیں خواب پلنا چاہیے

ہر قدم پر ہے زمانے کی ہوا کا سامنا
سوچ لیجے کیا ہمیں بھی رخ بدلنا چاہیے

سوچ نے پھر سینگ بدلے زلزلہ آنے لگا
پھر مجھے آتش فشاں صورت ابلنا چاہیے

ذائقہ اپنی زباں پر جاگتی راتوں کا ہے
کر چکے آوارگی یعنی سنبھلنا چاہیے

سب بڑے بوڑھے ہمارے درمیاں سے اٹھ گئے
اب تو اپنے آپ کے آگے مچلنا چاہیے

فراغ روہوی (کولکتا)

ظلمت میں اجالوں کی ضمانت بھی وہی دے
ہر ساعتِ غم میں مجھے راحت بھی وہی دے

ہجرت تو رقم کی ہے مقدر میں اسی نے
قدموں کو مِرے عزمِ مسافت بھی وہی دے

جس نے دی اجازت مجھے آغازِ سفر کی
مجھ کو مِری منزل کی بشارت بھی وہی دے

امید کے ساحل پہ کھڑے ہیں کہ کسی پَل
اس پار نکل جانے کی صورت بھی وہی دے

ہے اس کے اشارے سے رواں میری رگوں میں
اب خون کے دھارے کو حرارت بھی وہی دے

آنکھوں کو مری جس نے عطا کی ہے بصارت
اے کاش! مرے دل کو بصیرت بھی وہی دے

ہے طاقتِ گفتار مری اس کی عنایت
لفظوں کو مرے حسنِ بلاغت بھی وہی دے

رکھا ہے مجھے صبر کے زنداں میں جب اُس نے
اک روز فراغؔ اذنِ بغاوت بھی وہی دے

فراغ روہوی

کچھ بھی انجام ہو، آغاز کیے دیتے ہیں
آ تجھے اپنا ہم آواز کیے دیتے ہیں

موسموں کو نظر انداز کیے دیتے ہیں
آ بلند اور بھی پرواز کیے دیتے ہیں

کچھ تو پہلے سے تھا رگ رگ میں شجاعت کا سرور
کچھ ہمیں آپ بھی جانباز کیے دیتے ہیں

حد سے آگے جو پرندے نہیں اُڑنے والے
حادثے ان کو بھی شہباز کیے دیتے ہیں

شبِ ظلمت نہ ہو غمگیں کہ جلا کر خود کو
نور سے تجھ کو سرافراز کیے دیتے ہیں

دشت و صحرا، یہ سمندر، یہ جزیرے یہ پہاڑ
منکشف ہم پہ کئی راز کیے دیتے ہیں

شہرِ جاں پر کئی برسوں سے مسلط ہے جمود
چھیڑ کر دل کو چلو ساز کیے دیتے ہیں

ہم کہ زندہ ہیں ابھی، زلفِ غزل آ تجھ کو
پھر عطا نکہتِ شیراز کیے دیتے ہیں

کون آتا ہے عیادت کے لیے دیکھیں فراغؔ
اپنے جی کو ذرا ناساز کیے دیتے ہیں

فیصل عظیم (امریکہ)

کیا ڈریں خوابوں سے یا خوابوں کی تعبیروں سے ہم
کھیلتے پھرتے ہیں خود اپنی ہی تقدیروں سے ہم

مدتوں سے پاؤں میں ہیں بیڑیاں سی بے شمار
کیا رکیں گے آپ کی دو چار زنجیروں سے ہم

فلسفوں کی ابتدا اور انتہا جب ایک ہے
کیوں نہ رنگِ آگہی چھلکائیں تحریروں سے ہم

ڈھال کب کی پھینک دی ہے زندگی کی جنگ میں
عمر کتنی ہے، یہ گن لیں گے کبھی تیروں سے ہم

کیوں ہمیں اس بت کدے میں لا کے حیراں کر دیا
پھیر لیں کیسے نظر رنگین تصویروں سے ہم

وصل کی باتوں پہ اک رانجھے کا آتا ہے خیال
عذر آخر کیا کریں اس شہر کی ہیروں سے ہم

حسن تیرا دلفریبی کی حدوں پر ہے، مگر
تو زمیں کی قید میں ہے اور پنہ گیروں سے ہم

فیصل عظیم

مجھ پہ ڈالو نہ ایسے جھکا کر نظر
میرے بس میں نہیں میرا دل اس قدر
سب نے یوں مل کے گھیرا خدا کی پنہ
رنگ، عارض، لب و زلف، نظریں، کمر
اور کس زاویے سے لگاؤ گے چوٹ
اب ہٹا بھی چکو اپنی ترچھی نظر
تیری آواز جادو سے کم تو نہیں
کیوں لٹاتا ہے حرفوں کا مجھ پہ ہنر
یہ ہواؤں میں کس نے اُچھالا مجھے
یک بیک کیسے اُگنے لگے بال و پر
اب مرے واسطے کچھ نئے جال بُن
میں چلا تیرا دامِ اثر توڑ کر
مسکراہٹ ہی کافی ہے میرے لئے
کیوں سجاتے ہو ماتھے پہ شمس و قمر
جسم و جاں میں یہ مستی تو پہلے نہ تھی
ہو نہ ہو، تیری باتوں کا ہے یہ اثر
اس قدر بھی سجاوٹ ضروری نہیں
جانتا ہوں میں سب تیرے عیب و ہنر
کیا سماعت بھی ہے اک ادا حسن کی
مجھ کو تیری خموشی سے لگتا ہے ڈر

ارشد کمال (دہلی)

اگر چراغ کی لو بے لگام ہو جائے
ضیاء کے نام پہ ظلمت کا کام ہو جائے

وفورِ شوق سے رشتہ جو کچھ توانا ہو
سراب و آب کا قصہ تمام ہو جائے

جسے بھی دیکھو، زمانے سے ہی مخاطب ہے
کبھی تو خود سے کوئی ہم کلام ہو جائے

عجیب حبس ہے یارو، چلو کچھ ایسا کریں
کہ شہرِ وقت سے باہر قیام ہو جائے

شبِ سیہ کو ہے منظور سب، بجز اس کے
کہ میرے گھر میں ضیاء خوش خرام ہو جائے

ضمیر زندہ ہے جب، تو زباں بھی زندہ رہے
کرو کچھ ایسا کہ یہ فکر عام ہو جائے

ہمیں ہماری خبر بھی ملا کرے ارشدؔ!
کچھ اپنی زیست کا ایسا نظام ہو جائے

ارشد کمال

کبھی جو اُس کی تمنا ذرا بکھر جائے
نشہ پھر اُس کی انا کا اُتر جائے

چراغِ شب میں تو جلنے کا حوصلہ ہی نہیں
وہ چاہتا ہے کہ تہمت ہوا کے سر جائے

زمیں پہ غلبۂ شیطاں، فلک برائے ملَک
بشر غریب پریشاں کہ وہ کدھر جائے

مری حیات کا سورج ہے سوئے غرب، مگر
محال ہے کہ مرا ذوق و شوق مرجائے

جسے نہ آئے جلانا ہوا کے رُخ پہ چراغ
وہ اپنا کام ہمارے سپرد کر جائے

چراغِ ذہن جو روشن نہیں تو کچھ بھی نہیں
وہ تارے توڑ کے لائے کہ چاند پر جائے

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)

فقط گمان نہیں تھا، ضرور ہو جاتا
اگر میں بڑھتا تو دریا عبور ہوجاتا

ہمارے حرف مشابہ تھے چاند سورج سے
قلم اُٹھاتے اگر ہم تو نور ہوجاتا

ہمارے شعر حقیقت کے پاس تھے کتنے
ورق اُلٹتے اگر تم ظہور ہو جاتا

مِرے خیال میں بہتر تھا آگہی سے جنوں
جو اپنے آپ سے ملتا غرور ہوجاتا

تمام عمر ہی شیشہ گری میں گزری ہے
میں سنگ زاد نہیں تھا کہ چُور ہو جاتا

وہ وصل و ہجر کے معنی سے آشنا تھا رئیسؔ
میں اُس کے پاس جو جاتا تو دور ہو جاتا

رئیس الدین رئیس

جھکا کے دیکھ لیں اپنی بھی ہم جبیں اک روز
جو اپنی سطح سے اُٹھ جائے یہ زمیں اک روز

جو اپنے آپ کو شہرِ گماں میں ڈھونڈتے ہیں
وہ اپنے آپ کو مل جائیں گے کہیں اک روز

سوالِ وصل پہ مجبور خواہشیں سُن لیں
انہیں جواب ملے گا، ابھی نہیں اک روز

میں سنگ و خشت ہوا ہوں جسے بنانے میں
وہی مکان گرائیں گے یہ مکیں اک روز

ابھی تو وہم کے سائے میں ہے پناہ گزیں
کبھی تو دھوپ میں آئے گا یہ یقیں اک روز

ہر اک نظر پہ ہے طاری فسونِ بے خبری
اب اپنے آپ کو ڈھونڈیں گے خود ہمیں اک روز

ابھی رئیسؔ توجہ نہیں ہے میری طرف
مجھے تلاش کریں گے یہ ناقدیں اک روز

حمیدہ معین رضوی (لندن)

خواب میں منظر سہانا اور تھا
زیست کا خونی فسانہ ، اور تھا

خون کے رشتوں نے میرا خوں کیا
دشمنوں کا تو نشانہ اور تھا

مدعی الفت کے تو لاکھوں ملے
نقدِ جاں، جودے دوانہ اور تھا

آندھیوں میں بھی جو روشن ہی رہا
وہ چراغِ معجزانہ اور تھا

دل کی بستی میں جو آیا تھا کبھی
اس سے ربطِ دلبرانہ اور تھا

راہِ حق پہ ہو گیا قربان جو
مومنوں کا وہ گھرانہ اور تھا

رفیق شاہین (علی گڑھ)

نئے خوابوں میں بھی منظر پرانے ڈھونڈتا ہوں
جو مجھ سے چھن گئے ہیں وہ زمانے ڈھونڈتا ہوں

میں شہرِ سنگ کے نا آشنا بے حس بتوں میں
دوانہ ہوں،محبت کے فسانے ڈھونڈتا ہوں

کبھی آہوں،کراہوں میں،کبھی اشکوں کے گھر میں
میں لُٹ پٹ کر بھی چاہت کے خزانے ڈھونڈتا ہوں

کہوں جب قصۂ غم میں تو ہوں وہ بھی فسردہ
یونہی تو کب سے اپنے سے دوانے ڈھونڈتا ہوں

ذرا میں بھی تو دیکھوں کون ہوں،کیسی ہے صورت
یونہی تو کب سے میں آئینہ خانے ڈھونڈتا ہوں

جہاں نفرت کے شعلوں میں گھرا ہے اور میں پاگل
جہنم میں بھی جنت کے ٹھکانے ڈھونڈتا ہوں

ہوئی شاہینؔ جس در پہ مری تذلیل پھر بھی
اُسی در پہ میں جانے کے بہانے ڈھونڈتا ہوں

ارشاد قمر (ایمسٹرڈیم)

ناوکِ دشنام تھی یہ زندگی
درد تھی آلام تھی یہ زندگی

اک دیا تھا ناتواں سا بجھ گیا
خواب تھی ابہام تھی یہ زندگی

دار پہ اک قرض تھا لوٹا چلے
ہم پہ اک الزام تھی یہ زندگی

خود فراموشی میں جو کاٹی گئی
موت کا پیغام تھی یہ زندگی

ہر نفس کو آخرش چکھنا ہے جو
اک کسیلا جام تھی یہ زندگی

ارشاد قمر

جو سر نہ غیر کے آگے جھکے گا
وہی سرمایۂ مقتل بنے گا

ابھی کچھ دیر کی ہے سر گرانی
مگر اس درد کا سورج ڈھلے گا

زمانہ کیا سزا دینے سے پہلے
کوئی الزام اپنے سر بھی لے گا

ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر بھی
ستاروں میں کہیں شامل رہے گا

لہو سے آبیاری جس کی ہو گی
وہی گل کھل کے اک شعلہ بنے گا

سلیمان جاذب (دبئی)

فلک پر میں ستارے دیکھتا ہوں
عجب روشن نظارے دیکھتا ہوں

کبھی دیکھوں تلاطم خیز مو جیں
کبھی حیراں کنارے دیکھتا ہوں

چہاروں سمت سے آسیب ہم پر
مقدر کے اشارے دیکھتا ہوں

چلے جاتے ہیں اب ہم سے بچھڑ کر
دل و جاں سے تھے پیارے دیکھتا ہوں

کہیں آنسو کہیں پر سسکیاں ہیں
غموں کے استعارے دیکھتا ہوں

ہے شدت کی سلگتی آگ دل میں
کئی اٹھتے شرارے دیکھتا ہوں

سلیمان جاذب

تن بدن سے لپٹ گئی سردی
پھر بھی لگتی ہے اجنبی سردی

دیکھ کر چاند مسکراتا ہے
کرتی جاتی ہے گدی ، گدی سردی

میرے ہمراز میرے ساتھی ہیں
چودھویں شب کی چاندنی سردی

آج باہر غضب کی بارش ہے
آج اپنوں میں اجنبی سردی

سرد مہری تھی جاذبی اتنی
اور بھی کچھ ٹھٹھر گئی سردی

حنیف نجمی (دھمتری، چھتیس گڑھ)

خوشبوؤں کا اک ذخیرہ گو مِرے قبضے میں ہے
کیا کروں پاگل ہوا اک شخص کے کہنے میں ہے

تجھ میں پوشیدہ ہیں جاناں کتنی دنیاؤں کے راز
حسن کتنی کہکشاؤں کا ترے چہرے میں ہے

اس سے پہلے تو کیا بندوں کی عظمت پر سوال
اب تکلف کچھ خدا کو بھی خدا کہنے میں ہے

مجھ سے وہ لاکھوں ہی نوری سال کی دوری پہ ہے
اور وہی پیوست بھی میرے رگ و ریشے میں ہے

آدمی تو رنگ ابلیسی کا مظہر ہے تمام
روح تیری اے خدا کس خاک کے پتلے میں ہے

سارے عالم میں ہے چرچا بے حجابی کا تری
پھر بھی کچھ لوگوں کو غم ہے تو ابھی پردے میں ہے

گفتگو اس کی ہے نجمی اک سکوتِ بیکراں
اک بلا کا شور لیکن اس کے چپ رہنے میں ہے

فرحت حسین خوشدل

(ہزاری باغ)

دنیا کا تماشہ بھی بڑا ہوش رُبا ہے
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

مانگی ہوئی دستار کبھی سر پہ نہ رکھنا
جس شخص کا جو قد ہے، اُسی قد میں بڑا ہے

سورج سی بلندی پہ تکبّر نہیں اچھا
سورج بھی بلندی سے سمندر میں گرا ہے

جلتی ہوئی اس دھوپ میں اب بھی ہوں سلامت
بس میری حفاظت کے لیے ماں کی دعا ہے

کیوں آج کسی شاخ پہ غنچہ نہیں کھلتا
گو آج بھی مالی میں وہی جوش بھرا ہے

بے جان سہارے کہاں کام آتے ہیں خوشدلؔ
مضبوط سہارا مِرا بس ایک خدا ہے

ناصر ملک (لیہ)

بستی والوں نے اِک دولت والا ایسا دیکھا تھا
سورج بن کے جلتا رہتا ، کرنیں بانٹا کرتا تھا

گھر سے اُٹھتے شعلے دیکھ کے رونا کیسا لگتا ہے
شام ڈھلی تو اُس نے مجھ سے کتنے لاڈ سے پوچھا تھا

مفلس زادوں کو لقمے بھی خون کے بدلے ملتے ہیں
ایسا حاکم کیوں دھرتی نے اپنے رَب سے مانگا تھا

تیری زُلفیں ڈھونڈ رہی تھیں چلتی سانس کی گرمی کو
لیکن میری سانس رُکی تھی ، میرا دِل برفایا تھا

اُس شب جلتے بجھتے جگنو اُس کو دیکھنے آئے تھے
وہ بھی سورج اَوڑھ کے اپنے گھر سے تنہا نکلا تھا

بانجھ کتابوں کی قبریں تو شہر میں ہر سُو پھیلی تھیں
لیکن حرف کو ہم نے گونگے کھیت میں اُگتے دیکھا تھا

کاغذ چننے والے ننھے ہاتھ میں چھالا دیکھا تو
میرے پہلو میں دل ناصر کتنی زور سے دھڑکا تھا

حیدر قریشی (جرمنی)

چلے تھے جستجوئے بے حدی کی حد کے لیے
ازل سے محوِ سفر ہیں ترے ابد کے لیے

ترے خیال کی تجرید کے یہ متلاشی
رُکے نہیں ہیں کسی ظاہری کے رد کے لیے

ابھی سکوت سا طاری ہے دل پہ بوجھل سا
کہ تیرہ دن ہیں ابھی پورے جزر و مد کے لیے

قبولیت کی اچانک گھڑی میں وقت نہ تھا
کسی مزید تقاضے یا ردو کد کے لیے

کفن مِرے لیے دامانِ یار ٹھہرے گا
چلیں گے کوچۂ دلدار میں لحد کے لیے

ہم اپنے صفر زمانے میں مست تھے حیدرؔ
وہ ناز کرتے رہے اپنے ہر عدد کے لیے

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

اگر ہمت جواں رکھیں گذارہ ہو بھی سکتا ہے
چمک ہو دل میں تو ذرہ ستارا ہو بھی سکتا ہے

جو طوفاں میں سہارا دے ہمالہ ہے وہ تنکا بھی
وہ تنکا ہی سہی لیکن سہارا ہو بھی سکتا ہے

بس اک میٹھی نظر درکار ہے اپنا بنانے میں
نہیں ہے جو ہمارا وہ ہمارا ہو بھی سکتا ہے

ہوس انگارہ ہے جو عمر بھر دل میں سلگتا ہے
ہوا دیں گے تو انگارا شرارا ہو بھی سکتا ہے

اگرچہ زہر سے ہر غم گوارا کرنا مشکل ہے
مگر کچھ صبر کر لیں تو گوارا ہو بھی سکتا ہے

بہت مشکل سہی حالات لیکن سر چھپانے کو
ارادہ ہو اگر، کچھ اینٹ گارا ہو بھی سکتا ہے

وہ خود ہی بکنے کو آیا ہے بازارِ محبت میں
اگر تم چاہو تو اکبؔر تمہارا ہو بھی سکتا ہے

اکبر حمیدی

ملنے کو میں اس کے نئی تدبیر کروں گا
خط اور طرح کا اسے تحریر کروں گا

ہے شیخ کی دستارِ فضیلت مرا موضوع
میں شہر کے ہر چوک میں تقریر کروں گا

ہاتھوں میں مرے لوح و قلم آئیں گے جس روز
تقدیر کو تدبیر سے زنجیر کروں گا

آئیں گے اسے دیکھنے بلقیس و سلیماں
اک شہر نئی طرز کا تعمیر کروں گا

تاخیر بھی اندھیرے کی اک شکل نہیں کیا
اندھیر کروں گا نہ میں تاخیر کروں گا

میرے ہی قبیلے کے جوانان جری تھے
وہ میر ہوں غالب ہوں میں توقیر کروں گا

اک خواب جو آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں اکبؔر
اس خواب کی میں آپ ہی تعبیر کروں گا

اکبر حمیدی

آپ کا حسن معجزائی ہے
ورنہ ہر چیز ارتقائی ہے

کیا حقیقت ہے دین و دنیا کی
سب ترے ہاتھ کی صفائی ہے

مجھ سے تو کچھ پڑھا نہیں جاتا
کیسی کج مج تری لکھائی ہے

میرا سرمایہ ہے غزل میری
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

اک بڑا گھر ہے کائنات اکبؔر
دنیا اس گھر کی انگنائی ہے

اکبر حمیدی

گھر اپنا افق پار کسی چاند نگر ہو
خوابوں کی زمیں ہو کہ خیالوں کا سفر ہو

شب ہو تو چمک اٹھیں تری مانگ کے تارے
دن ہو تو لبوں سے ترے آغازِ سحر ہو

رنگوں سے مہکتا رہے ملبوس کا ہر تار
خوشبو سے چمک اٹھے جدھر تیرا گذر ہو

انسانوں کی دنیا ہو سب انسان ہوں اس میں
لوگوں کی جہاں حرمتِ انساں پہ نظر ہو

قدموں میں بچھے ہوں جہاں پھولوں بھرے رستے
اور زندگی اکبؔر جہاں خوشیوں میں بسر ہو

اکبر حمیدی

اگرچہ گرم بازاری بہت ہے
محبت میں مگر خواری بہت ہے

دلوں کی پاسداری چاہتا ہوں
جہاں رسمِ دل آزاری بہت ہے

محبت بھی کسی کو ہو گی لیکن
محبت کی اداکاری بہت ہے

حسیں محبوس ہو کر رہ گئے ہیں
کہ شورِ چار دیواری بہت ہے

کہاں سے نعرۂ مستانہ اٹھے
کہ لوگوں میں سمجھ داری بہت ہے

میں ریزہ ریزہ ہو کر کٹ رہا ہوں
وفا کی دھار تلواری بہت ہے

بڑے منصب پہ جانا چاہتا ہوں
پر اس کا راگ درباری بہت ہے

ابھی اکبرؔ بہت ہمت ہے مجھ میں
اگرچہ زخم بھی کاری بہت ہے

اکبر حمیدی

زمین پاؤں میں ہے آسمان سر پر ہے
یقین دل میں ہے لیکن گمان سر پر ہے

اب ایک رات میں سارا نصاب دیکھوں گا
پڑھا بھی کچھ نہیں اور امتحان سر پر ہے

نہ کچھ اِدھر کا پتہ ہے نہ کچھ اُدھر کی خبر
جو پہلے بھی تھا وہی درمیان سر پر ہے

عجیب سلسلہء روز و شب ملا ہم کو
کہ تیر سینے میں ہے اور کمان سر پر ہے

جو تو نہیں ہے تو گھر کر رہا ہے سائیں سائیں
کہ ایک فرد کیا پورا مکان سر پر ہے

زمینِ شوق میں بوئی ہے فصلِ گل اس نے
میں وہ زمین ہوں جس کا کسان سر پر ہے

میں کچھ بھی کر نہیں پایا ہوں ایسے میں اکبرؔ
کروں بھی کیا کہ مری بھاگوان سر پر ہے

شہناز نبی (کولکتہ)

جس نے درِ وحشت کیا وا دشتِ جنوں میں
اس نے مجھے زنجیر کیا دشتِ جنوں میں

سب ارض و سما بھرنے لگے چاپ سے اپنی
کیا لگتی تھی قدموں کی صدا دشتِ جنوں میں

کھل جاتا کبھی سر تو چلی آتی تری یاد
رکھ جاتی مرے سر پہ ردا دشتِ جنوں میں

اک نقشِ عبادت نے کیا ایسا چراغاں
ہر گام پہ جلتا تھا دیا دشتِ جنوں میں

اس نے تو بچھائے تھے بہت خار سرِ راہ
کیا تم سے کہیں رنگِ حنا دشتِ جنوں میں

ہو کرنے میں شہروں کو تھے مشہور بہت تم
بدنام ہوا وہ جو مٹا دشتِ جنوں میں

کس کس سے کہیں گھر کی طلب ہم کو نہیں تھی
یہ کیا ہے جو آباد کیا دشتِ جنوں میں

شہناز نبی

خدا سے کہہ دو کوئی درمیاں نہ آئے گا
وہ آج جھوٹ پہ بازی نئی سجائے گا

سبھی گراں ہیں بہت اس کے طبعِ نازک پر
مگر وہ مجھ کو ہی محفل سے اب اٹھائے گا

کوئی نہیں ہے مرے دل کی سبزخیزی میں
یہ خود ہی روز بغیچے نئے سجائے گا

نہ جانے کس نے سمیٹی ہے اتنی تنہائی
وہ کون ہے جو یہاں گھر کی نیو ڈالے گا

میں چھوڑ جاؤں تو یادوں کا یہ خرابہ مگر
مری طرح سے اسے کون پھر بسائے گا

سمیٹ کر ذرا چل دو تڑی گھڑی میں کہیں
کہ کوئی دم میں قیامت نئی اٹھائے گا

وہ جس نے سلب کی آواز اہلِ زنداں کی
کبھی تو داغِ گلستاں جگر پہ کھائے گا

شہناز نبی

اب اپنا ہر سلیقہ کیوں خطا کاری میں آتا ہے
کہ سچا عشق بھی طرزِ گنہ گاری میں آتا ہے

کوئی کیا جانے کب بے فیض ہو جائے گی یہ صحبت
گرہ میں رکھ لو جو نکتہ سمجھ داری میں آتا ہے

اسے کہہ دو کہ ہرگز رخ کرے نہ دشتِ وحشت کا
کہ یہ اب قطعہ بھی اپنی عملداری میں آتا ہے

ابھی تک ہم اکیلے رو رہے ہیں شب گزیدوں پر
اے شہرِ بے بصر تو کب عزاداری میں آتا ہے

وہی ہیں فرصتیں لیکن نہیں ذکرِ وفا کوئی
کہ اب یہ فعل بھی دل کی گرانباری میں آتا ہے

بہت چاہا کہ طرزِ زندگی اپنی بدل ڈالیں
مگر اوروں کو خوش کرنا ریاکاری میں آتا ہے

اٹھا کر منہ چلے جائیں گے بزمِ یار میں لیکن
یہ طورِ بندگی مشقِ سبک ساری میں آتا ہے

شہناز نبی

کلبۂ جاں کی اداسی میں سنبھل کر آئے
اس کو آنا ہے تو انداز بدل کر آئے

دل کسی طور اٹھا تا نہیں احسان کوئی
کہہ دو خوشیوں کو ذرا غم کو بھی حل کر آئے

کوئی گنتا ہے اگر راتوں میں تارے ہمیں کیا
ہم بھی صحرائے لق و دق سے نکل کر آئے

وہ جو چاہے تو کسے ہم کو کسوٹی پہ مگر
بے خطر ہم بھی تو شعلوں میں ہیں جل کر آئے

ان کو ہر چہرہ بہت صاف نظر آتا ہے
نیند کے ماتے سبھی آنکھوں کو مل کر آئے

اب نئے باغ سجانے کی تب و تاب نہیں
ہم تو ہر برگِ تمنا کو مسل کر آئے

کون رکھتا ہے سرِ نوکِ مژہ خواب نئے
اس سے کہہ دہ کہ وہ تعبیر بدل کر آئے

بابِ احساس کے کھلنے پہ ندامت کیسی
موج سرکش ہے تو ساحل پہ اچھل کر آئے

پھر سے تنہائی میں پھن کاڑھ لیا کرتی ہیں
اپنی دانست میں یادوں کو کچل کر آئے

شہناز نبی

ہر سمت سے پتھر ہی پذیرائی کو آئے
جیسے کہ ترے شہر میں رسوائی کو آئے

بس ایک وہی واقفِ اسرار ہے اپنا
اس دشت میں ملنے ترے سودائی کو آئے

کب ہم کو کسی رشتۂ جاں کی ہے تمنا
کوئی تو تکلف میں شناسائی کو آئے

ہے دل میں شکایات کا دفتر کوئی پنہاں
ہم بر سرِ دربار ہیں شنوائی کو آئے

کب ہم سا کوئی ناصیہ سا تجھ کو ملے گا
ہر پل تری چوکھٹ کی دلآسائی کو آئے

لو ہم نے سبھی چاکِ جگر سی لئے اپنے
لوٹا دو اسے جو بھی مسیحائی کو آئے

کیا سوچ کے فریاد رسی تم نے اٹھا دی
ہم ضبط کے مارے تو شکیبائی کو آئے

شہناز نبی

اسے کہو کہ یہ دل پھر سفر ارادہ کرے
ہمارے قدموں پہ صحرا کو وہ کشادہ کرے

حصارِ زیست سے آگے بھی مرحلے ہیں کئی
ابھی نہ مجھ کو اسیرِ صدائے جادہ کرے

یہ مانا مجرمِ حق گوئی ہے زبان مگر
سبب ہے کچھ کہ اسی جرم کا اعادہ کرے

پتہ کرو کہ کہاں پہ رکھا ہے زخم نیا
کیوں التفات مرے حق میں حد سے زیادہ کرے

یہ کم نہیں کہ زمانے میں اس کی شہرت ہے
اب اور کیا مری وحشت سے استفادہ کرے

قسم ہے مڑ کے تری اور ہم نہ دیکھیں گے
اے شاخِ سبز تو چھاؤں کا جو بھی وعدہ کرے

وفا کا رنگ جھلکنے لگا ہے آنکھوں سے
وہ چاہے جتنا غمِ عشق کو لبادہ کرے

یہ کیسا جھوٹ ہے جس کی سیاہی چھپتی نہیں
تکلفات میں لہجے کو جتنا سادہ کرے

زمیں کے بخرے جو کرنے چلا ہے کہہ دو اسے
جو ہو سکے تو خلا کو بھی آدھا آدھا کرے

شہناز نبی

اک اژدھامِ صوت و صدا ہے تو کیا ہوا
وہ تو اکیلے چلنے پہ ہے پھر بھی تلا ہوا

ٹوٹے ملے ہیں آئینے، آنکھیں لہو میں تر
بس ایک تیرا عکس تھا سالم بچا ہوا

آتا ہے اس پہ رشک بہت آندھیوں کو بھی
وہ اک چراغ جانے ہے کب سے جلا ہوا

اس کی زبانی اپنی تباہی کی داستاں
ہر بار تازہ لگتا ہے قصہ سنا ہوا

حیراں ہوں محفلوں میں تری جاؤں کیسے میں
اک دل ہے اپنے پاس مگر کچھ بجھا ہوا

شاید کہ اب بھی راس نہ آئی اسے فضا
رہتا ہے یوں تو شہر میں لیکن ڈرا ہوا

آخر وہی ہوا کہ برے خواب سچ ہوئے
اس نیند سے تو اچھا مرا رت جگا ہوا

بنیادیں لڑکھڑانے لگی ہیں ، سنبھالنا
زخمی سپاہیوں سے قلعہ ہے پٹا ہوا

خاور اعجاز (ملتان)

گزشتہ دن میں جو ضم ہو گیا ہے اِک دن اور
مِری حیات سے کم ہو گیا ہے اِک دن اور

ہمیں تو جینے کی اُمید مارے جاتی ہے
قضا سے ہم کو بہم ہو گیا ہے اِک دن اور

مِرا وجود میں آنا ابھی موخر ہے
کہ صرفِ سیرِ عدم ہو گیا ہے اِک دن اور

لو ہم پہ آ گئی اِک اور شب گدائی کی
کہ نذرِ اہلِ کرم ہو گیا ہے اِک دن اور

اِک اور دِن پہ رکھا اُس نے مہربانی کو
اور اِس طرح سے اَہم ہو گیا ہے اِک دن اور

خاور اعجاز

شبِ وصال کے پیان میں چمکتا ہُوں
پھر ایک ہجر کے عرفان میں چمکتا ہُوں

مِرے لیے کوئی ساعت بھی اِنتہائی نہیں
اِک آن بجھتا ہُوں اِک آن میں چمکتا ہُوں

مَیں کوئی شے نہیں ، اِک قیمتی اثاثہ ہُوں
اور اُسکے بختِ خُوش اِمکان میں چمکتا ہُوں

اُبھر رہا ہے کہیں سے ستارہ ء اُمید
کہ مَیں ہی شب کے بیابان میں چمکتا ہُوں

گزر رہا ہُوں کسی تیرہ تر زمانے سے
مگر یہ دیکھ ترے دھیان میں چمکتا ہُوں

خاور اعجاز

کِسی بھی سمت میں عزمِ سفر ہونے نہیں دیتا
اور اپنے آپ میں بھی تو بسر ہونے نہیں دیتا

بدلتا ہے جہانِ شوق لیکن میری مرضی سے
اِدھر کا ایک ذرّہ بھی اُدھر ہونے نہیں دیتا

عجب اِک دُھند میں رکھا ہُوا ہے منظرِ ہستی
ہمیں اندازہ ء شام و سحر ہونے نہیں دیتا

کہیں تو دُور کرتا جا رہا ہے راہ کے پتھر
کہیں دِیوار میں کوئی بھی دَر ہونے نہیں دیتا

ہمارے ہونے سے ہی کام چلتے ہیں سبھی اُس کے
ہمیں ہی وُہ مگر اِس کی خبر ہونے نہیں دیتا

خاور اعجاز

یہ دِل کی بات ہے ، دُنیا نہ دِیں پہ ٹھہرے گی
نِکل گئی تو بھلا پھر کہیں پہ ٹھہرے گی !

اُڑی پھرے کِسی باغِ بہشت میں لیکن
جہاں کی خاک ہے آخر وہیں پہ ٹھہرے گی

کِسی دریچے ، کِسی بام و در سے ہو آئے
مگر نِگاہ اُسی مہ جبیں پہ ٹھہرے گی

پڑاوَ کرتی ہُوئی جا رہی ہے ساعتِ وَصل
سو آسمان سے پہلے زمیں پہ ٹھہرے گی

دھڑک رہی ہے جو اِک قریہ ء اجل کے قریں
تو زِندگانی بالآخر یہیں پہ ٹھہرے گی

وہ خواب رُت کہ جو منڈلا رہی ہے آنکھوں پر
گمان ہے کہ نِگاہِ یقیں پہ ٹھہرے گی

خاور اعجاز

کبھی سفر میں ہمارے قدم اکٹھے تھے
خوشا جوانی ! کہ تُو اور ہم اکٹھے تھے

صریرِ قلب نہ قرطاسِ جاں سلامت اَب
وہ دِن گئے کہ یہ لوح و قلم اکٹھے تھے

رہا نہ شوق کا رہوار اپنے قابو میں
شبِ وصال میں کچھ زیر و بم اکٹھے تھے

مِرے وجود نے تجھ سے جدا کیا مجھ کو
وہ دِن بھی تھے کہ وجود و عدم اکٹھے تھے

ہمیں شمار کیا ایک دن الگ اُس نے
سو بٹ گئے وہ جو رنج و الم اکٹھے تھے

ظفر اللہ محمود (جرمنی)

الجھنوں میں اس طرح اپنی انا سلجھا کے رکھ
قربتوں کو فاصلوں کی آنچ میں سُلگا کے رکھ

چھوڑ جاؤں گا، نہیں اطوار گر بدلے ترے
اپنی ضد کو چھوڑ،اپنے دل کو بھی سمجھا کے رکھ

پھر بنا تصویر ایسی جس میں ہو خنجر گڑا
خون کےقطرے گرے ہوں،اُس پہ دل تڑپا کے رکھ

دیکھ وہ بچھڑا تو بچھڑے گا نہیں پھر عارضی
مان اُس کی بات، اُس کے دل کو نہ الجھا کے رکھ

فیصلے کا وقت ہے اور فیصلہ ہونے کو ہے
یا سدا کا غیر کر لے،یا اسے اپنا کے رکھ

حیرتوں میں گم نہیں ہوں ،جانتا ہوں میں ظفؔر
ٹوٹ کر اُس پر برس اور پھر کبھی ترسا کے رکھ

ظفر اللہ محمود

اُس کے دل کو اپنے دل سے یارو ہم نے چیر کیا
پھر جو منظر سامنے اُبھرا اُس کو بھی تصویر کیا

شام ڈھلی اور رات گری، پھر چاند نے بھی دلگیر کیا
جاتے جاتے سورج نے بھی کیا منظر تحریر کیا

ایک نئی بستی تھی جس کو ہم نے تھا تعمیر کیا
پھر اُس بستی کے حاکم نے ہم کو ہی رہگیر کیا

ایک تجھے پانے کی خاطر ہم نے کیا کیا جتن کیے
ہار کے اپنا سب کچھ ہم نے تجھ کو ہے تسخیر کیا

ہم تو جانیں دکھ ہوتے ہیں اور تو جانے خوشیوں کو
عمر کی ایک کتاب یارا کیا کیا ہے تحریر کیا

روشن چہرہ،کالی آنکھیں اور گھنیرے بال ظفؔر
اور خدا ہی جانے اُس نے کیا کیا ہے جاگیر کیا

ظفراللہ محمود

تمہارے عشق سے پچھتا رہے ہیں
لے اب تو جان سے ہی جا رہے ہیں

بھرے ساگر سروں پر لا رہے ہیں
گھنے بادل کہاں سے آ رہے ہیں

کرے ہے جو سواگت بے رُخی سے
بڑے اُس کو بڑا سمجھا رہے ہیں

جھڑے جو بول تھے اُس کے لبوں سے
وہ اب نغموں میں ڈھلتے جا رہے ہیں

بدل دے بے یقینی کو یقیں میں
کہ اب تو لوگ بھی گھبرا رہے ہیں

کسی طوفان کا ہیں پیش خیمہ
چمن سے پنچھی اُڑتے جا رہے ہیں

گھنیری شام کو لوٹیں گے تھک کر
پرندے جو گھروں سے جا رہے ہیں

تمنا ہم سے ملنے کی رہے گی
ظفؔر محفل سے ہم اب جا رہے ہیں

ظفراللہ محمود

کھڑے ہیں بیچ بازارِ محبت
لگا بولی کہ ہم بکنے لگے ہیں

ترے آنے کا امکاں ہو گیا ہے
ترے آثار سے دِکھنے لگے ہیں

کہانی جو رُلائے گی سبھی کو
اُسی کا وقت ہے، لکھنے لگے ہیں

پرندے سوچ کی ٹہنی پہ لوٹے
شجر کے زخم سب سلنے لگے ہیں

تمہارے خواب میں آنے سے بستر
خود اپنے آپ ہی بچھنے لگے ہیں

بچا خود کو کسی بھی انتہا سے
اُٹھانے سر، کئی فتنے لگے ہیں

ظفراللہ محمود

کر کے میرے دل میں برپا درد کا اک ہنگام
شہر میں اتری اب کے ایک انوکھے دُکھ کی شام

تیرے نام کی مالا جپتے گزری عمر تمام
لیکن ٹیڑھی قسمت میں ہی نہیں تھا سیدھا کام

تیری یاد میں کھلنے والے سارے تازہ پھول
شہر کے چوک میں رکھ آئے ہیں تیرے یہ بدنام

سوچ کا بھاری پتھر پھینکا دل دریا کے بیچ
جس نے موجوں میں برپا کر ڈالا اک کہرام

دل کے در کو کھول ہی دے گا آخر اک دن تُو
آن بسیں گے ہم ہی اس میں ، ہم ہیں جو ناکام

ظفراللہ محمود

تیرے سر کی ہر جنبش پر جھٹکا بھی تو سہتا ہوں
میں جو تیری لٹ میں ہر دم الجھا الجھا رہتا ہوں

بیٹا! عشق ''سمندروں ڈونگا'' اس سے جان بچا
دیکھ خیال کیا کر اس کا میں جو تم سے کہتا ہوں

رہتا ہوں میں اس کے دل میں اک دھڑکن سی بن کر
اور میں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بھی بہتا ہوں

ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے اندرو اندری
اپنے بدن کے اندر جانے کتنی بار میں ڈھہتا ہوں

ظفراللہ محمود

ندی ہو کر سمندر پی رہے ہو
بڑی ہی سادگی سے جی رہے ہو

سنا کر مسئلے اپنے ہمی کو
ہمارے ہونٹ بھی تم سی رہے ہو

ارادہ کر رہے ہوتوڑنے کا
وہی دل جس میں اب تک جی رہے ہو

توجہ گو ہماری چار سو تھی
خیالوں میں تمہی باقی رہے ہو

اب اپنی موج میں رہنے لگا ہے
وہ دل جس میں کبھی تم بھی رہے ہو

بدلتے وقت میں کیوں چھوڑتے ہو
اُنہیں جن کے کبھی ساتھی رہے ہو

محبت میں بڑی شدت کی نفرت
اسی اظہار کے حامی رہے ہو

ظفؔر کیوں لڑکھڑانے لگ گئے ہو
بڑے کم ظرف ہو،ساقی رہے ہو؟

طاہر عدیم (جرمنی)

فقط اک گھونٹ ہے دل کو لبالب جام دریا کا
سمندر دسترس میں ہو تو پھر کیا کام دریا کا؟

کنارِ چشم سے جب بھی طوافِ عشق کو نکلا
بنی ہے چاندنی ہر مرتبہ احرام دریا کا

فنا ہو کر دلیلِ رونقِ بحرِ رواں رہنا
یہی دستورِ قُدرت ہے یہی انجام دریا کا

بھٹکتا ہے غلافِ چشمِ بینا کے تصرف کو
اٹکتا خوشۂ ہر اشک میں پیغام دریا کا

محبت زینتِ پاپوش ہم نے اس طرح کر دی
کہ جیسے بہرِ خاص و عام، فیضِ عام دریا کا

فقط ہم ہی نہیں ہیں کشتگانِ لہجۂ صرصر
ہے دیکھا پُر شکن چہرہ بھی وقتِ شام دریا کا

یہ کیا طاہؔر کہ سسّی کو تو کارِ عشق نے نِگلا
بہ لوحِ وقت لیکن نام ہے بدنام دریا کا

طاہر عدیم

وہ درد، وہ وفا، وہ محبت تمام شُد
لے۔۔۔دل میں تیرے قُرب کی حسرت تمام شُد

یہ بعد میں کھلے گا کہ کس کس کا خوں ہُوا
ہر اک بیان ختم، عدالت تمام شُد

تُو اب تو دُشمنی کے بھی قابل نہیں رہا
اُٹھتی تھی جو کبھی وہ عداوت تمام شُد

اب ربط اک نیا مجھے آوارگی سے ہے
پابندیِ خیال کی عادت تمام شُد

جائز تھی یا نہیں تھی ترے حق میں تھی مگر
کرتا تھا جو کبھی وہ وکالت تمام شُد

وہ روز روز مرنے کا قصہ ہُوا تمام
وہ روز دل کو چیرتی وحشت تمام شُد

وہ میرے قُرب میں ہے بہت بے سکون سا
اُس کے سکون کو ہے قرابت تمام شُد

اب آ کہ اپنا اپنا اثاثہ سمیٹ لیں
اب ہم پہ وقت کی ہے سخاوت تمام شُد

طاہؔر میں کُنجِ زیست میں چپ چاپ ہوں پڑا
مجنوں سی وہ خجالت و حالت تمام شُد

طاہر عدیم

مایوسی میں دل بے چارا صدیوں سے
ڈھونڈ رہا ہے ایک سہارا صدیوں سے
ایک ہی بات عبث دہرائے جاتا ہے
تن میں چلتا سانس کا آرا صدیوں سے
ہیؔر اگرچہ میں نے اپنی پا لی ہے
ڈھونڈ رہا ہوں تخت ہزارا صدیوں سے
تم سے کیسے سمٹے گا یہ لمحوں میں
دل اپنا ہے پارا پارا صدیوں سے
کس اعلان کو گونج رہا ہے نس نس میں
دھڑکن دھڑکن اک نقّارا صدیوں سے
کوئی منزل ، عشق میں کوئی کام ملے
دل آوارہ ، ہے ناکارا صدیوں سے
دل پر کیا ہم نے تو جاناں! جان پہ بھی
لکھ رکھا ہے نام تمہارا صدیوں سے
اُس نے دل کے درد سے پوچھا۔کب سے ہو؟
دل سے اُٹھ کے درد پکارا صدیوں سے
خُشک پڑا ہے آنکھ کے پردے پر طاہؔر
بحرِ درد کا ایک کنارا صدیوں سے

طاہر عدیم

مرحبا! جب قتل پر میرے پکارا دوسرا
مات میری تھی مگر یہ کیا کہ ہارا دوسرا

میں اشاروں کی زباں میں سر پٹختا رہ گیا
اُس نے مارا ہر اشارے پر اشارا دوسرا

خود بخود پھر اُس کے اندر برچھیاں چلنے لگیں
اُس نے میری پیٹھ میں جب تیر مارا دوسرا

رنگ اُس کا ہر دفعہ اک اور ہی آیا نظر
رنگ جب بھی اُس کے چہرے کا اُتارا دوسرا

پوچھتے ہو ۔۔ کیا رہا حالِ خلاصائے حیات
ایک لمحہ ہُوں جیا اور ہے گذارا دوسرا

کون جانب چھپ گئے ہیں روشنی کے وہ سفیر
ایک مثلِ چاند تھا تو تھا ستارا دوسرا

گو بہت اچھا تھا لیکن پہلے جیسا وہ نہ تھا
نقش ہم نے جو بھی کاغذ پر اتارا دوسرا

ایک ہی تو ہے سہارا کامرانی کی دلیل
مات ہو گی جب بھی ڈھونڈو گے سہارا دوسرا

اُس کو لوٹاتے نہ یارو!! ہم کبھی بھی خالی ہاتھ
لازماً دیتے جو ہوتا دل ہمارا دوسرا

عُمر بھر ملنا نہیں پر ساتھ چلنا ہے ہمیں
اک کنارا میں ہوں طاہر وہ کنارا دوسرا

طاہر عدیم

یہ جواہر سنبھالتا ہوں میں
اشک آنکھوں میں پالتا ہوں میں

سُرخ رنگِ فلک نہیں یوں ہی
خُون دل کا اُبالتا ہوں میں

روز قسمت سے ہار جاتا ہوں
روز سکہ اُچھالتا ہوں میں

روز کرتا ہوں ایک ان ہونی
روز ہونی کو ٹالتا ہوں میں

گھولتا ہوں مٹھاس باتوں میں
اور سمندر میں ڈالتا ہوں میں

اپنا قِصہ تمام سے کہہ کر
اپنی پگڑی اچھالتا ہوں میں

زندگی کے ہر ایک چکر کو
ایک چکر میں ڈالتا ہوں میں

روز ملتا ہے اک نیا موتی
روز دل کو کھنگالتا ہوں میں

اُس کو طاہر مری ضرورت ہے
اس لئے جاں سنبھالتا ہوں میں

طاہر عدیم

(اپنے بیٹے سجاول سلطان کے لئے)

روشنی کر دے سَر بہ سَر مولا
اس کی آنکھوں میں نُور بھر مولا

صرف تیرا اسے سہارا ہو
صرف تیرا ہی اس کو ڈر مولا

اس کی خوش قسمتی رہے دائم
اس سے قائم ہے میرا گھر مولا

اس کی پرواز ہو ثُریا تک
کر دے مضبوط اس کے پر مولا

نیکیاں ہوں قریب ، اور قریب
دُور اس سے ہوں سارے شر مولا

شبِ تیرہ میں میرے کم سِن کے
حوصلوں کو بلند کر مولا

یہ مُجھے اس قدر ضروری ہے
جیسے گھر کیلیئے ہو دَر مولا

ہر ضرورت ، تسلیوں کیلیئے
دوڑ کر آئیں بحر و بر مولا

صرف کہنا ہے لفظِ کُن، تُو نے
صرف لگنا ہے لمحہ بھر مولا

حالِ دل جب بتا دیا تجھ کو
یوں لگا ہو گئی سحر مولا

اور جو کچھ نہ کہہ سکا بابا
کہہ رہی ہے یہ چشمِ تر مولا

سب کو یہ کہہ دیا ہے طاہر نے
میرا کوئی نہیں مگر مولا

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

طاہر عدیم

ہر اک انجام اُس چنچل پہ چھوڑا
جلا کر اک دیا ہے جَل پہ چھوڑا

جیئے ہیں عرصۂ آئندہ میں ہم
ہمیشہ آج ہم نے کل پہ چھوڑا

تغیر دل کے سارے موسموں کا
جبینِ جانِ جاں کے بَل پہ چھوڑا

اُگلتی ہے ، نگلتی بھی نہیں ہے
مجھے اُس نے عجب دلدل پہ چھوڑا

کمانِ وصل ، تیرِ ہجر کھینچا
نشانہ لے کے جسمِ شَل پہ چھوڑا

حسابِ ہر عذابِ ہجر طاہر
تمہارے وصل کے اک پل پہ چھوڑا
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

معیدؔ رشیدی (کلکتہ)

ہر قدم ایک امتحاں سا ہے
دل مرا ٹوٹتا مکاں سا ہے

رات کالی ہے آج کیوں اتنی
ہر طرف کیوں دھواں دھواں سا ہے

تیری خوشبو بسی ہے سانسوں میں
گھر مرا ایک گلستاں سا ہے

جی رہا ہوں میں تیرے سایے میں
تیرا آنچل بھی آسماں سا ہے

تیز طوفاں ہے اور مری کشتی
حوصلہ میرا بادباں سا ہے

زندگی مختصر کہانی ہے
ایک لمحہ بھی داستاں سا ہے!

معیدؔ رشیدی

رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا
دل کا مارا ٹوٹ گیا

اوڑھ لی چادر ماضی کی
حال سے رشتہ ٹوٹ گیا

صبح نے دستک دی جس دم
رات کا قصہ ٹوٹ گیا

دھوپ کی شدّت اور سراب
پھر اک پیاسا ٹوٹ گیا

پھر ویران ہوا آکاش
پھر اک تارہ ٹوٹ گیا

ایک ذرا سی بات ہوئی
اور آئینہ ٹوٹ گیا

معیدؔ رشیدی

پیاس نے جب کہا پانی پانی
جوشِ دریا ہوا پانی پانی

جب پڑی اپنے گریباں پہ نظر
شرم سے ہو گیا پانی پانی

اس طرف جوش میں تھے کتنے فرات
اِس طرف شور تھا پانی پانی

گاؤں کی کچّی سڑک ہوں میں بھی
ابر برسا، ہوا پانی پانی

سلسلہ ختم ہوا خشکی کا
راستہ اب ہوا پانی پانی

معیدؔ رشیدی

تھی کل بھی بہت پیاس کی ماری ہوئی دنیا
ہے آج بھی احساس کی ماری ہوئی دنیا

دن میں تو ملاقات کی صورت ہی الگ تھی
تھی رات ملی یاس کی ماری ہوئی دنیا

بے گور و کفن لاش کی مانند کھڑی ہے
مدّت سے یہاں آس کی ماری ہوئی دنیا

دریاؤں کو دامن میں لیے گرمِ سفر ہے
صدیوں سے یہاں پیاس کی ماری ہوئی دنیا

دیکھو، یہ تماشا نہیں عبرت کی نظر سے
ہے گوہر و الماس کی ماری ہوئی دنیا

معیدؔ رشیدی

آنکھوں میں اشک،سینے پہ پتھر لیے ہوئے
گھر سے چلا ہوں صبر کی چادر لیے ہوئے

گاؤں کے اک مکان کی چوکھٹ کی روشنی
آتی ہے روزخواب میں منظر لیے ہوئے

یہ کیسا شہر ہے یہاں اک دوسرے سے لوگ
ملتے ہیں آستین میں خنجر لیے ہوئے

پیراک! تو اِن آنکھوں کی گہرائیاں نہ پوچھ
یہ چشمِ تر ہیں ایک سمندر لیے ہوئے

میں ٹوٹ کر بھی جی رہا ہوں اس امید پر
آئے گا کوئی پیار کا ساغر لیے ہوئے

اک شخص کی اڑان تصوّر سے بھی بعید
اک شخص پھر رہا ہے کبوتر لیے ہوئے

معیدؔ رشیدی

لٹنے کا اپنے میں نے کوئی غم نہیں کیا
لیکن غرورِ وقت پہ سرخم نہیں کیا

میں جل رہا تھا کب سے مسائل کی دھوپ میں
پھر بھی مرے وجود نے ماتم نہیں کیا

یہ سوچ کر کہ کم نہ ہو کچھ لذّتِ خلش
زخمِ جگر کے واسطے مرہم نہیں کیا

جب شدّتِ تپش میں جھلسنا ہوا نصیب
پھر گل نے بھی تصورِ شبنم نہیں کیا

تھوڑی سی روشنی تھی مگر وہ بھی چھن گئی
میں نے دیارِ شب میں سفر کم نہیں کیا

تاریخ ہے گواہ کہ دنیا میں وقت نے
ہر شخص کو سکندرِ اعظم نہیں کیا

احمد ہمیش (کراچی)

روایت بے روایت

وہ بھی کیا زمانہ تھا جب پوربی علاقے میں لوگوں کے دل چڑیلوں اور پریوں دونوں سے بہ یک وقت آباد ہوا کرتے تھے۔شیکسپیر علیہ السلام کا ذکر صرف انگریزی کی درسی ریڈر میں ہوا کرتا تھا۔افسوس کج روی کے بارے میں ارشاداتِ عالیہ نہیں پائے جاتے۔سوائے اس کے کہ اُسے نظر انداز کیا گیا یا نفرت کی اساس پر دنیا دیا گیا۔

دنیائے جانے کے پھیر میں لپیٹ لپیٹ کے کچومر کیا گیا اور پڑیوں میں باندھ باندھ کے بنیوں بقالوں کے سپرد کیا گیا۔ان بنیوں بقالوں سے ڈھیبوا، اڈھنی، پائی پیسہ، روپلی یا مجموعی معنوں میں دمڑی اور چمڑی کو رواج دیا گیا۔اس کے ساتھ ہی یہ دیکھا جانے لگا کہ چمڑی جانے لگی اور دمڑی دنیا میں رہنے لگی۔البتہ اس رواج سے ایک تصور کریدنکالا گیا کہ بینک کی بنیاد عورت نے رکھی تھی۔اور وہ سرِ راہ ذاتِ مرد سے منسلک ہوگئی یا چپک گئی اور یہ بتانا مشکل ہوا کہ تانبے کے پیسے کے بیچ چھید کیوں کیا گیا اور عورت کی ناک کیوں چھیدی گئی!اگر اس میں کوئی قدرِ مشترک تھی تو کیوں تھی؟ اور اس خرابے سے قبرستان یا مرگھٹ کتنی دور تھا۔تب محبت کیا اتنی ابھاگن تھی کہ کسی کو اپنا ہدف نہیں بنا سکتی تھی۔وہ بھی کیا رات تھی کہ لگاتار پانی برس رہا تھا اور ہمارے گاؤں کی آسیہ نامی لڑکی اُسی رات مرگئی تھی اور اُسی رات اسے دفن کرنے کے لئے بارش میں آدھی ڈوبی ہوئی قبر میں دفن کیا گیا تھا۔کاش وہ مرنے سے پہلے کسی سوکھے گیلے مرد کا چہرہ دیکھ چکی ہوتی اور جی بھر کر مل چکی ہوتی۔یہاں ذرا نظر کیجئے کہ اُس زمانے میں مرد کی ذات کیسی رہی ہوگی۔مثلاً کوئی مرد عرصۂ دراز تک کثرتِ زنا کا مرتکب رہا ہو اور پھر اچانک اُس کی مردمی کم ہونے لگی ہو تو اُس نے دواؤں کا استعمال شروع کیا ہو، پھر کیا کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اصل زمانۂ مردمی اور نقل زمانۂ مردمی میں کیا فرق رہا ہوگا!

محبت اگر کسی دل کا نام تھا تو اُس کی تلاش میں کیا کوئی مائی کا لال نکلا ہوگا! حاتم طائی کا کوئی چیلا تو نہیں ہوگا پھر بھی جو لوگ چار پانچ کوس پیدل چل لیتے تھے وہ کسی نہ کسی انجانی کھوج میں نکلے تو ہونگے۔اُنہیں اگر کچھ ملا بھی ہوگا تو کیا ملا ہوگا! اماّں کی ناک کی کیل تو کہیں نہیں ملی ہوگی۔پھر بھی یاد نہیں آتا کہ ابّا میاں نے دوسری شادی کب کی تھی۔صرف اُس سے جڑا ہوا وقوعہ یاد ہے کہ اماّں کی ڈوبتی ہوئی آواز میں بدنصیب لڑکے نے شہد ٹپکایا تھا، وہ شہد جو بل سنگھ پور کے جنگل کے کسی خاص پیڑ سے اتار کے لایا گیا تھا۔یہ شہد اتار کے لانے والے اصغر نانا ہی

تو تھے اور یاد ہے کہ انہوں نے ہی اماّں کو قبر میں اتارا تھا۔یا یوں کہا جائے کہ یہ ایک ایسی محبت کو قبر میں اتارنے کا منظر تھا جسے خدا اور خدا کے بنائے ہوئے آدمی ہی دیکھ رہے تھے۔یہاں کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ وہیں پاس ہی سگڑا نام کی ایک برساتی گڑھی تھی جس میں کئی نوعمر لڑکے ڈوب گئے تھے۔وہ بھی جس دن ڈوبنے کو تھا تو اُسے ایسا لگا کہ پانی کی تہہ میں کوئی ڈُبوا نام کی مخلوق رہی ہوگی۔اس کے بعد تو ایک عرصہ بیت چکا تھا۔بانسپار والے بانسوں کے جھنڈ سے گھا گھرا اور سرجُو ندی کا علاقہ بھاگل پور بھٹنی، گونڈا اور بہرائچ اور نان پارہ کی آبادیاں تھیں۔جبکہ ٹرین سے سفر کرتے ہوئے ''آگ کا دریا'' کی مصنف قرۃ العین حیدر کو بہرائچ کے مضافات خوب نظر آئے تھے۔

ظاہر ہے یہ قصہ کچھ بیتے ہوئے زمانے کا ہوگا جب سنجوگ سے باپ بیٹی اور بیٹی کے لمس سے آشنا جِلا وطن لڑکا تینوں بھاپ سے چلنے والے انجن کے پیچھے ریل گاڑی میں سوار چلے جاتے تھے۔البتہ معلوم نہیں سرجُو کہاں تھی۔گھاگرا ندی کا علاقہ تو بہت پیچھے کہیں چھوٹ گیا تھا سوائے اس کے کہ لڑکے نے لڑکی کی لال چنٹوں والی نیم گیلی نیم سوکھی ماس مجاّ میں انگلی ڈبو رکھی تھی، مزہ تو آرہا تھا مگر اس مزے میں مرنے والوں کی حسرت ناکی بھی یاد آرہی تھی۔وہ شہد یاد آرہا تھا جو اُس نے اماّں کی ڈوبتی ہوئی آواز میں ٹپکایا تھا گویا کبھی نہ سمجھ میں آنے والی محبت کا تعاقب جاری تھا۔تب نہ کوئی سلسلۂ نقش بندی تھا، نہ چشتیہ تھا۔ابّا میاں کے بارے میں اتنا ہی سنا تھا کہ وہ شہر گورکھ پور میں ایک دسترخوان پر حسین احمد مدنی کی جوٹھی کرُکرُی ہڈی والی بوٹی عقیدت میں چباتے ہوئے مرید ہوگئے تھے۔البتہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد اُنہوں نے فتح پور تال رتوئے والے میدان (جس میں کچھ سال گزرے ایک غیر ملکی ہوائی جہاز گر کر تباہ ہوگیا تھا) کے قریبی گاؤں میں ایک گہرے سانولے رنگ کی عورت سے شادی کرلی تھی۔ممکن ہو اس شادی کا ارادہ انہوں نے اہرامی ناک والی اماّں کے مردہ چہرے پر موت کی آخری جھلک دیکھ کر کیا ہوگا۔یہاں یاد آتا ہے کہ کیا وہ میں ہی تھا یا کیا وہ میں نہیں تھا!

''گزرتے ہوئے وقت کی کسی سطح پر لکھا ہوا چلا آتا تھا کہ میرے گناہوں میں ابرہہ کے کچھ ہاتھی بھی شامل تھے اور میرے حصہ کے کعبہ کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ ابابیلیں بھیجی تھیں۔بلکہ ان کی چونچ سے کنکریاں میری طرف کے ہاتھیوں پر آگری تھیں۔بے شک اُن کی تباہی و بربادی کی آواز میرے قلب تک پہنچی تھی۔تبھی مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ دنیا کے ہر آدمی کے حصہ کے کعبہ کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ ابابیلیں ضرور بھیجتا ہے۔جی ہاں! یہ ایک خیال تھا۔خیال ہی تو تھا کہ معاً میرے باطن میں گونج گیا اور ایک عجب کوند ہوئی۔''

(**احمد ہمیش** کے افسانہ **ہیں خواب میں ہنوز**......سے اقتباس)

عبداللہ جاوید (ٹورانٹو۔کینیڈا)

اللہ میاں

عہدِ طفلی تو نہیں کہوں گا البتہ بچپن ہی سے حیدر آباد کے جس چہرے سے مجھے واسطہ پڑا وہ مسجدوں والا حیدر آباد تھا۔اس حیدر آباد سے میرا تعارف میرے والد کی وساطت سے ہوا وہ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد مسجدوں کے ہو رہے تھے۔میں ان کی انگلی پکڑ کر مسجد جاتا تھا۔پہلی بار مسجد جانے کا واقعہ اب بھی ہوتا رہتا ہے۔چھوٹی سی خوبصورت عمارت۔گھروں اور بنگلوں سے بالکل مختلف۔چھت تو بالکل ہی بدلی ہوئی۔ہرے رنگ کا گول گنبد جس کے بیچوں بیچ سنہرے رنگ کا کلس جو سورج نکلنے سے قبل کی نیم روشن، نیم تاریک شبنمی فضا میں، میرے بچگانہ ذہن میں ایک انجانا خوف پیدا کر رہا تھا۔اس عمارت کی ایک اور امتیازی خصوصیت، اس کے بلند و بالا مینار تھے۔جو شاید آسمان کو چھونے کی انسانی خواہش کا استعارہ تھے۔اس وقت تک اللہ میاں کے بارے میں میری معلومات کچھ یوں تھی کہ وہ آسمانوں میں کسی جگہ، کسی اونچے تخت پر بیٹھتے ہیں۔

تخت پر ہی نہیں بلکہ تخت پر بچھی کسی شاندار کرسی پر اور نورانی فرشتے ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔میں ان کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔والد کے ساتھ کے باوجود، میں ڈر سے کانپ رہا تھا۔جس دروازہ سے ہم دونوں باپ بیٹے داخل ہوئے وہ عام دروازوں سے قدرے کشادہ تھا۔اس کا ایک پٹ کھول دیا گیا تھا۔ایک ہنوز بند تھا۔مسجد یعنی اللہ کے گھر کا صحن سنگ سیلو کا تھا۔دروازے کے پاس ہی ایک کیاری سی تھی۔اس کیاری میں موٹا خوب تناور جنگلی بادام کا درخت اپنی موٹی موٹی شاخیں اور پتلی پتلی ٹہنیاں مسجد کی چھت سے بھی بلند تر فضا میں چاروں اور پھیلائے کھڑا تھا۔ان ٹہنیوں میں لمبے چوڑے اور دبیز دبیز پتے لگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ موٹے موٹے ہرے جامنی دھبوں والے بادام دیکھنے والوں کی نظروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔چند ایک نیچے بھی گرے پڑے تھے، وہ پھٹے پھٹے تھے۔ان کا اندر کا سرخ، جامنی، سخت لیکن رس بھرا ریشہ باہر جھانک رہا تھا۔اندر داخل ہو کر میں نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔میری آنکھیں اللہ میاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دروازے کے بالکل قریب جوتے اتار کر چھوڑنے ہوتے تھے۔والد نے اپنی چپلی اتار دی تھی۔میں کھڑا رہا۔میرے جوتے والد صاحب نے اتارے اور اپنی چپلیوں کے ساتھ رکھ دیئے۔بالآخر ہم دونوں صحیح معنوں میں اللہ میاں کے گھر میں داخل ہو گئے۔۔ننگے پاؤں۔۔اللہ میاں کو جوتے شاید اس لئے پسند نہ تھے کہ ان کے تلوں کے ساتھ مٹی اور گندگی ان کے گھر آ جاتی، اللہ میاں کو گندگی پسند نہیں تھی۔وہ صفائی پسند تھے میری والدہ کی مانند

۔دروازے کے پاس ایک بانس سے لپٹی ہوئی چنبیلی کے پھولوں کی ایک بیل تھی۔ہرے رنگ کی اس بیل پر سفید کلیاں لگیں تھیں۔کھلی بھی، ادھ کھلی بھی اور بند بھی۔مجھے پھول پیارے لگتے تھے۔ہر طرح کے پھول۔مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ میاں کو بھی پھول پسند ہیں۔۔۔اللہ میاں کی اور میری پسند ایک سی ہے۔۔۔میرے بچہ ذہن نے سوچا۔ تو کیا اللہ میاں میرے جیسے ہیں۔۔؟۔۔میری سوچ ایک قدم اور آگے بڑھی۔۔نہیں اللہ میاں میرے جیسے نہیں ہو سکتے۔۔۔سب کہتے ہیں وہ بہت بڑے ہیں۔۔تو پھر مجھ جیسے کس طرح ہو سکتے ہیں۔۔؟۔۔میں تو ابھی ایک بچہ ہوں۔۔۔میں نے اپنی بچگانہ سوچ کی نفی کی اور ایک بار پھر اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔اللہ میاں دکھائی نہیں دیئے۔ایک جانب پانی کے دو مٹکے تھے۔وضو کرنے کی جگہ تھی، وہاں ایک ادھڑ عمر کا آدمی وضو کر رہا تھا۔ایک بے حد موٹا آدمی تسبیح ہاتھ میں لٹکائے ٹہل رہا تھا۔دو چار آدمی صحن سے اندرونِ مسجد جا رہے تھے۔میں نے سوچا۔۔اللہ میاں اندر ہوں گے۔۔۔والد کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر چلا گیا۔اندر صفیں بچھیں تھیں۔دور ایک بڑی سی محراب تھی اس کے قریب ایک چوبی منبر تھا۔محراب کے پاس سفید ململ کا کُرتا اور آسمانی رنگ کی چارخانہ تہبند پہنے ہوئے ایک چھلیے چھلیے بدن کے گورے چٹے آدمی بیٹھے ہوئے تھے، والد صاحب نے ان کو سلام عرض کیا اور مجھے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔وہ اللہ میاں ہرگز نہ تھے۔مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ میاں آدمیوں جیسے نہیں ہوتے۔اور یہ تو آدمی تھے۔لوگ ان کو بغدادی صاحب کے نام سے مخاطب کر رہے تھے ٹوٹی فصیل، سلطان پورہ، نور خان بازار میں واقع وہ مسجد بھی بغدادی صاحب کی مسجد کہلاتی تھی۔بغدادی صاحب نے میرے سر اور کندھوں پر اپنے دونوں موٹے موٹے گوشت بھرے ہاتھ پھیرے۔وہ ہاتھ بے حد نرم تھے جیسے ربر کے بنے ہوں۔بغدادی صاحب خود بھی ربر کے بنے ہوئے تھے۔ایک بڑے سے گُڈے لگتے تھے۔انہوں نے مجھے سامنے بٹھایا اور میرے چہرے اور سر پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔پاس رکھی ہوئی ایک سفید رنگ کی طشتری میں کچھ کھجوریں تھیں۔بغدادی صاحب نے اس طشتری سے ایک کھجور اٹھائی اپنا منہ تھوڑا سا کھولا اور نصف کے قریب کھجور اپنے دانتوں سے بڑی چترائی سے کتری اور باقی آدھی میرے منہ میں گھسیڑ دی۔ان کے منہ کی کھجور کو میں برداشت نہ کر سکا اور فوراً تھوک دیا۔

" کندرا تا ہے"بغدادی صاحب کی زبان سے نکلا۔میری اس حرکت سے والد صاحب کو ندامت ہوئی۔

انہوں نے میری دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال دیئے اور مجھ کو اٹھا کر باہر لے گئے۔کچھ دیر بعد اذان شروع ہوئی اور نمازی صف بستہ ہونے لگے۔کسی نمازی نے مجھے اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا اور اس طرح میں نے اپنی زندگی کی پہلی باجماعت نماز ادا کی۔وہ بھی اس طرح کہ سب کو دیکھ کر ان کی نقل میں رکوع و سجود کرتا اٹھتا، بیٹھتا رہا۔اس تجربہ سے مجھ پر یہ راز افشا ہو گیا کہ اللہ کے گھر میں، اللہ کے بندے اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔لیکن اس گھر میں اللہ میاں نہیں ہوتے۔مجھے بے حد مایوسی ہوئی تھی۔یہ ایک طرح کی زیادتی تھی۔۔۔صاف۔۔صاف۔

ایک انجانے خوف کے باوجود جو میرے ننھے سے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔میں اللہ میاں کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ابّا جان مجھے اللہ میاں کے گھر لے جانے والے ہیں

۔میں بے حد خوش تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔اللہ کے گھر میں اللہ میاں کو نہ پا کر ۔۔میں اتنا ہی اداس ہو گیا تھا۔ایسے وقتوں میں میرا معمول تھا کہ میں خوب روتا اور بسورتا تھا۔زمین پر ٹانگیں گھس گھس کر اپنی مطلوبہ چیز مانگتا۔گھر کے اندر داخل ہوتے ہی میں سیدھا دالان کے اس گوشے میں پہنچا جہاں بیٹھ کر یہ سب کچھ کرنے کا عادی تھا۔میں وہاں بیٹھ تو گیا لیکن کوشش کے باوجود نہ تو اپنی مخصوص ۔۔ریں۔ریں۔۔شروع کر سکا اور نہ ہی ٹانگیں گھسنے میں کامیاب ہو سکا۔میرے حلق سے ریں۔۔ریں۔۔کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی میں نے سوچا یہ مجھے کیا ہو گیا۔۔؟۔۔میں اپنی معمول کی ریں۔۔ریں۔کرنے میں کیوں ناکام ہو رہا ہوں۔

اچانک میں نے حیرانی سے یہ محسوس کیا کہ اندر ہی اندر مجھے کچھ ہو رہا ہے۔میں کسی کو آواز دے رہا ہوں۔میں بلک بلک کر پکار رہا ہوں۔اللہ میاں۔۔!۔اللہ میاں۔۔!۔میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔روتے روتے میں نے اسی طرح دالان کے فرش پر سر ٹکا دیا جیسے اللہ میاں کے گھر میں لوگ نماز کے دوران کر رہے تھے۔سجدے کی حالت میں اللہ میاں کو پکارتے ۔۔بغیر آواز کے لیکن آنسوؤں سے روتے ۔میں جانے کب سو گیا یا غافل ہو گیا۔مجھے یاد نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ ہی خواب میں اور نہ ہی میری غفلت کی حالت میں مجھے اللہ میاں دکھائی دیئے۔ کروڑوں برس پہلے جب پہلی مرتبہ آدمی نے اللہ کا گھر بنایا اور پھر بناتا ہی چلا گیا۔میں اپنے کسی بزرگ کی انگلی تھام کر اللہ میاں کے ہر نئے گھر میں برابر جا رہا ہوں۔اور اللہ کے گھر میں، اللہ کو نہ پا کر مایوس لوٹ رہا ہوں۔پھر کسی اور جگہ اور وقت۔۔۔کسی اور اللہ کے گھر میں جانے کے لئے۔ ☆☆☆

ابا جی کی وفات پر ٹیپو پریشان تھا کہ دادا ابو جاگتے کیوں نہیں؟۔اسے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب نہیں جاگیں گے کیونکہ اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ٹیپو نے غصے سے کہا میں اللہ میاں کو مار دوں گا۔ تب چار سال کے اس بچے کو مزید سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات نہیں کہتے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ٹیپو کے نزدیک تو سارے خاندان میں دادا ابو ہی سب سے بڑے تھے چنانچہ اس نے پوچھا کیا اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں؟ اس پر اسے یقین دلانا پڑا کہ اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں اور ہر کسی سے بڑے ہیں۔کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟۔۔ بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔جس کی بانہیں جہاں تک جا سکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔تاہم اس سے مجھے تمام مذاہب کی خدا کے معاملے میں سچی جستجو اور محبت کا احساس ضرور ہوا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ہستی کسی بھی عقیدے اور تصور سے بڑھ کر ہے۔(**زندگی کا تسلسل** از **حیدر قریشی** سے اقتباس۔۔۔۔بحوالہ ادبی جریدہ **اوراق** لاہور۔شمارہ جولائی اگست ۱۹۹۴ء۔ص ۲۳۷)

شہناز خانم عابدی (ٹورانٹو، کینیڈا)

ہیلن جاج گرین

اخبار پڑھنے میں میرا دل نہیں لگا میں نے اخبار ایک طرف رکھ کر ٹی وی آن کر دیا تھوڑی دیر بعد اس سے بھی دل بیزار ہو گیا۔ میں نے سوچا ناول ختم کر لوں۔تاکہ واپس کر سکوں کل ہی لائبریری سے مسز میکنزؔی کا فون آیا تھا کہ میں کتابیں واپس کرنے میں لیٹ ہو گئی ہوں' ناول میں بھی دل نہ لگا۔ایسا تو پہلے بھی کئی بار ہوا تھا کہ میرؔی اور فلپسؔ اپنی اِسٹڈی کی وجہ سے ویک اینڈ میں مصروف ہوتے اور میں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی کیونکہ مجھے بھی پورے ہفتے کے مسائل جوب کی وجہ سے ان ہی دو دنوں میں نمٹانا ہوتے۔ میں نے چابی اٹھائی، گاڑی اسٹارٹ کی اور لانگ ڈرائیو کے خیال سے چل دی۔ پتہ نہیں کون کون سے خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔انہی خیالات میں غوطہ زن میں ڈرائیو کرتی رہی۔نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہوتے ہی میں نے روڈ سائن پر نظر کی' میں لیک روڈ پر تھی۔ یہ جگہ مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔شاید اسی لئے میں غیر ارادی طور پر یہاں پہنچ گئی۔خوبصورت جھیل اور اسکا صاف شفاف نیلگوں بہتا ہوا پانی ساری اداسی' ساری تنہائی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔۔۔۔۔کیسا رشتہ ہے ان ابھرتی ڈوبتی لہروں سے انسان کا۔۔۔۔۔۔؟

میں نے ایک طرف گاڑی پارک کی اور جھیل کے ایک طرف تھوڑی اونچائی پر بنے لان کی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں پہنچ گئی۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کا کارپٹ بچھا دیا ہے خوبصورت پھولوں اور پھلوں کے درختوں سے مزیّن یہ لان رات کی بارش کی وجہ سے اور بھی نکھر گیا تھا سارا سبزہ زمرّدی رنگ کا دکھائی دیتا تھا۔گلاب اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبو سے پورا لان مہک رہا تھا۔ بڑا ہجوم تھا۔ویک اینڈ ہو اور موسم اچھا ہو تو ہجوم لازمی ہے۔بچے بڑے سب انجوائے کر رہے تھے۔کوئی جھیل کے پاس کوئی لان میں۔بعض لوگ بوٹنگ کر رہے تھے کچھ کنارے پر کھڑے لطف اندوز ہو رہے تھے۔کنارے کنارے سفید بطخیں قیں قیں کرتی تیر رہی تھیں جیسے وہ بھی موسم کے مزے لے رہی ہوں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لان میں آ گئی اور درختوں کے سائے میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی ۔ سامنے ایک کنج میں درختوں کے جھرمٹ میں بہت ساری چڑیاں چہچہاتی ہوئی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک رہی

تھیں۔ پیلی چونچ، نارنجی اور ہرے پروں والی یہ چڑیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کافی دیر تک اس حسین نظارے میں قدرت کی کاریگری دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ اچانک کسی بچے کی بڑی سی گیند ایک درخت سے ٹکرائی اور ساری کی ساری چڑیاں اُڑ گئیں۔ جب وہ اُڑتی ہوئی جا رہی تھیں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے فضا میں نارنجی اور ہرے رنگ کے ستارے جھلملا رہے ہوں۔ میں دور تک ان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنی منزل کی جانب میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا دل بھی نہیں لگا۔ میں نے سوچا کیوں نہ کافی پی جائے میں ریسٹوراں کی طرف چل دی جولان کے ساتھ ہی تھا یہاں بھی خاصا رش تھا میں نے دیکھا کونے میں دو میز خالی تھیں، یہ جگہ کھلی ہوئی تو تھی لیکن اوپر شیڈ ہونے کی وجہ دھوپ نہیں آ رہی تھی یہ جگہ مجھے پسند آئی اور میں وہاں جا کر بیٹھ گئی اس جگہ میں ایک یہ بھی خوبی تھی کہ یہاں سے جھیل بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی پانی کی ریشمی لہریں دور سے مچلتی ہوئی آتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لہریں نت نئے رنگوں میں تبدیل ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ کبھی گہرا سبز، کبھی ہلکا سبز، کبھی ہلکا نیلگوں اور کہیں کہیں اس نیلگوں رنگ کے ساتھ گلابی رنگ جھلکتا نظر آتا۔ لہریں سنگیت کی پائل پہنے دور تک مدھر گیت سناتی چلی جاتیں اور میں لہروں کے اس مدھر گیت کے سحر میں اور جھیل کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ہیلو''

ایک جانی پہچانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے جارج گرین کھڑا تھا۔ پانچ سال کے بعد آج میں نے جارج کو دیکھا تھا۔

''ہائے مائی ڈارلنگ، ہاؤ آر یو''۔ میں نے مسکراتے ہوئے جارج سے کہا۔ شاید میں اسکو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔

''آئی ایم فائن، تھینک یو۔ مگر یہ ڈارلنگ وغیرہ۔۔۔۔۔۔ چھوڑو یہ رسمی باتیں۔۔۔۔ معنوں سے خالی الفاظ۔''

''او کے۔ میں نے کہا میں نہیں چاہتی تھی کہ اتنے برسوں بعد جارج ملا ہے اور اس وقت کوئی لمبی بحث چھڑ جائے۔ اگر چہ کہ میں اندر سے اسکو ڈارلنگ ہی خیال کرتی تھی مگر اوپر کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میرے باہر کو دنیا نے اور خاص طور پر معاشی مجبوریوں نے مضبوطی سے جکڑے رکھا۔ ساری زندگی اپنے اندر کو کچلنے اور اپنے باہر کو سنبھالنے میں گزر گئی۔ مگر جارج برسہا برس ساتھ رہ کر بھی شاید چند لمحوں کی سچی رفاقت نہ دے سکا۔''

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا ''اگر تم میرا ساتھ دیتیں اور میرا کہا مانتیں تو ہم لوگ علیحدہ نہ ہوتے۔ تم نے مجھے کسی طرح کی سماجی زندگی گزارنے نہیں دی۔ کسی کو بھی کبھی ڈنر پر بلانے نہیں دیا نہ دوستوں کو نہ رشتے داروں کو۔''

''جارج تم جانتے ہو میں ویک اینڈ پر دوسری جگہ جوب کرتی تھی اخراجات پورے کرنے کے لئے''۔ میں

نے اسے یاد دلایا۔

''مجھ پر تو مجھ پر بچوں پر بھی تم نے کتنی پابندیاں لگائی تھیں انکی زندگی کو سوگوار بنا دیا تھا، ڈیٹ پر مت جانا، زیادہ وقت دوستوں میں نہیں گزارنا، بس پڑھائی۔۔۔ پڑھائی۔۔۔۔۔ پڑھائی۔ تمہیں یاد ہے ایک مرتبہ جب میں نے میری کو ڈیٹ پر بھیج دیا تھا بغیر تمہیں بتائے کتنا ہنگامہ کیا تھا تم نے۔۔۔۔ اور تو اور میری کو اسکی کسی دوست کے گھر 'سلیپ اوور' کے لئے بھی کبھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ اور اف تمہاری تقریریں ۔۔۔۔ ڈرنک مت لیا کرو صحت خراب ہو جائیگی، یہ کرو، وہ نہ کرو۔ اللہ رے تمہاری ہٹلریت۔ جارج بولتا گیا۔

میں نے ہمت کر کے جارج کو سمجھانے کی کوشش کی اور بولی ''جارج بچوں کی اچھی تعلیم اور تربیت کے لئے ضروری تھا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ میری ماں نے بھی کبھی مجھے ڈیٹ پر جانے نہیں دیا تھا۔ پھر تم نے خوشی خوشی مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ اور اس وقت تو تم میرے ہم خیال تھے ''میں نے جارج کو بیچ میں روک کر کہا۔

''تو کیا بن گئے تمھارے بچے '' اس نے پوری کڑواہٹ کے ساتھ کہا۔

''میری ڈاکٹر بن رہی ہے اور فلپس سی اے کر رہا ہے۔'' میں نے جارج کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز سے کہا۔ مگر اس نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور کہنے لگا: ''تم نے کبھی سمر انجوائے نہیں کرنے دیا ہمیشہ یہ بہانہ، وہ بہانہ، یہ پابندی وہ پابندی'' وہ بولے جا رہا تھا۔

''جارج تم جانتے ہو کہ ہماری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تمہاری کبھی بھی کوئی مستقل جوب نہیں رہی تھی۔ میں دو دو جوب کرتی تھی۔ گھر کے اخراجات، بچوں کی تعلیم کے اخراجات، بچوں کے اخراجات یہ سب بہت ہوتے تھے۔ اور بچے ہی ہماری سب سے پہلی ترجیح تھے مگر اب۔۔۔۔ کچھ نہیں ہو سکتا کیا بہت دیر ہو گئی ۔۔؟ میں نے نرمی سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' مگر وہ تو جیسے میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا۔

''میں فی الحال سمر انجوائے کر رہا ہوں۔ اور مجھے زندگی انجوائے کرنے دو۔ تمہارے پاس تو زندگی صرف ذمّہ داریوں کا نام ہے سو تم نبھاؤ۔۔۔۔۔'' وہ اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ اٹھا اور مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی تمام کڑواہٹ اگل کر جا رہا تھا۔ اس نے کافی بھی نہیں پی جو میں نے اس کے لئے منگوائی تھی۔

میں نے اسے اپنی بصارت میں بہت دور تک اور بہت دیر تک پکڑے رکھا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی موسم کے مزے لوٹنے سے اس کی کیا مراد ہے، سمندر، پانی کی موجیں، ساحل کے نظارے اور، اور، کوئی سی بھی عورت۔۔۔

مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے ایسے ہی ایک سمر کی دوپہر تھی اس دن میری چھٹی تھی بچے بھی دونوں گھر پر تھے۔ ہم سب لنچ کر رہے تھے جارج نے کہا۔ ''ہمیں کہیں گھومنے پھرنے چلنا چاہئے۔ تم آفس سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لو ہم سب فلوریڈا چلتے ہیں۔ ہوٹل میں یہیں سے بک کرا لیتا ہوں۔ خوب سمر انجوائے کرینگے۔''

''جارج۔۔ مگر فلپس اور میری دونوں کی سمسٹر کی فیس جانی ہے اور اسکے بعد کہاں اتنے پیسے بچیں گے کہ ہم جا سکیں۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے دیکھا جارج کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ مگر جارج بولا کچھ نہیں۔ میں دل میں بہت شرمندہ تھی کہ جارج کی

یہ خواہش پوری نہیں کرسکی۔مگر میں بھی کیا کرتی۔؟ دوسرے دن صبح میں ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی وہ میرے پاس آیا اسکے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا کہنے لگا ۔''میں جا رہا ہوں''

''مگر کہاں'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''معلوم نہیں۔مگر اس گھٹن سے بہت دور۔''

میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا اور چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دو چار مہینے میں راپس آ جائیگا۔مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا اور آج پانچ سال گزرنے کے بعد وہ اس طرح ملا۔۔اور مجھ پر الزامات کی بارش کر کے چلا گیا۔میں چاہتی تھی کہ وہ رک جائے' میرے ساتھ گھر چلے اور ہم ایک بار پھر پہلے کی طرح ساتھ زندگی گزاریں۔شاید میں اس سے ابھی بھی بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا جب وہ ایک سے زائد عورتوں والا ہوسکتا ہے تو میں ایک سے زائد مردوں والی کیوں نہیں ہوسکتی ۔۔۔؟
میرے لئے بھی تو دوسرا مرد عرصۂ دراز سے موجود ہے ہیری جو میرے ساتھ برسوں سے کام کرتا ہے۔وہ میرا انتظار کر رہا ہے کب سے؟ اور شاید آج بھی میرا منتظر ہو۔لیکن میں تو آج بھی مسز ہیلن جارج گرین ہوں۔

میں پتھر کے زمانے کی عورت نہیں ہوں کہ اس کی اجازت دے دوں کہ کوئی بھی مرد مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنے غار میں لے جائے۔

میں نے جھیل کی طرف نظر کی۔ڈوبتے ہوئے سورج نے جھیل کے پانی میں سینکڑوں فانوس روشن کر دیئے تھے۔میں اٹھی' کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ایک نئے عزم کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

جتنی دیر ہٹ مین کھڑے کھڑے سویٹ کا جائزہ لیتا رہا، بلیک برڈ دو گلاسوں میں وہسکی بھر لائی۔ہٹ مین اس سے ایک گلاس پکڑ کر صوفے میں دھنس گیا اور ایک ہی ڈیک میں وہسکی کا اتنا بڑا پیگ خالی کر دیا۔''اور!''
''اس شرط پر کہ کپڑے اتار کر ایک دَم سو جاؤ گے'' وہ اُس کے لیے ایک اور پیگ بنانے کے لیے بار کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی ''دائیں طرف ہمارے لیے دو نہایت کوزی بیڈ روم ہیں''
''ایک ہی کیوں نہیں؟ ہم کوئی میاں بیوی ہیں جو الگ الگ سوئیں؟'' ہٹ مین نے اس کی پیٹھ سے مخاطب ہر کر کہا۔آؤ سو جائیں دوسرا پیگ رہنے دو''
''نہیں اب پی ہی لو' بلیک برڈ نے سوچا کہ نشے میں غنودگی بڑھ جائے گی تو وہ آرام سے سو جائے گا۔
ہٹ مین اچانک کچھ سوچ کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا ''برڈی! میری بیوی حرافہ نیو یارک میں اپنے پچھلے شوہر کے ساتھ گل چھرے اُڑا رہی ہوگی''

(**جوگندر پال** کے افسانہ **مارکیٹ اکانومی** سے اقتباس)

قیصر اقبال (مونگیر)

بازرفت

خوشبو نے اپنے خوبصورت بدن پر دو چار مگ پانی ڈالا ہی تھا کہ سر کے اوپر سے ایک بڑا سا ڈھیلا بورئے کے چاک کو مزید پھاڑتا ہوا بالٹی کے پاس گرا۔اس کا سر بچ گیا مگر اسے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ ڈھیلا آیا کہاں سے اور کیوں گرا ہے کیونکہ چند روز قبل بھی جب اس کی ماں نہا رہی تھی تو ایسا ہی کچھ ہوا تھا جسے خوشبو نے بھی دیکھا تھا لیکن اس کی ماں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی تھی کہ کہیں سے دھوکے میں یہ ڈھیلا آ گیا ہوگا۔مگر آج پھر.........یہ سوچ کر خوشبو اپنی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بورئے کے چاک سے اوپر جھانکنے لگی۔اس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔بلاک C کے چودہ نمبر فلیٹ کی بالکونی میں دو جوان چھوکرے کھڑے ہوکر دوربین سے بورئے کے چاک کے اندر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کے ہاتھ میں دوربین اور فوٹو کیمرے تھے۔خوشبو سہم کر ایک کونے میں دبک گئی۔اس کے جوان جسم سے پانی کے چمکدار موتی جھڑ رہے تھے۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔آخر اس نے مجبور ہوکر ماں کو پکارا۔ماں نے سوچا پانی کم پڑ گیا ہوگا، مگر جب وہ ٹاٹ اور ٹن سے گھرے غسل خانے کے اندر گئی تو خوشبو نے سر کے اوپر پھٹے بورئے اور پھر ڈھیلے کی جانب اشارہ کیا۔ماں فوراً باہر آ کر دائیں بائیں آگے پیچھے ہر جانب بنی اونچی عمارتوں کو تکنے لگی۔تب تک وہ چھوکرے بالکونی سے ہٹ چکے تھے۔

خوشبو کی ماں کملا بھی جوان اور خوبصورت تھی بلکہ اکثر لوگوں کو دونوں ماں بیٹی کے سگی بہن ہونے کا گمان بھی ہوا کرتا تھا۔جس سے کملا دل ہی دل میں خوش ہو جایا کرتی تھی۔آج بھی اسے غصہ آنے کے بجائے کچھ انجانی خوشی ہی کا احساس ہوا۔پھر اس نے بڑی سی چادر لا کر پھٹے بورئے پر ڈال دیا اور خود سپاہی بن کر اوپر چہار جانب تکنے لگی۔خوشبو کپڑے پہن کر بھیگی لٹ کو ہاتھ میں تھامے سیدھی جھونپڑی میں چلی گئی۔

یہ ایک بڑی سی جھونپڑی تھی جس میں ایک مرد بھر مٹی کی دیوار اٹھا کر کئی کھٹال بنائے گئے تھے جو الگ الگ کمروں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔اس جھونپڑی میں رہتے ہوئے خوشبو کے باپ رام گوپال، ماں کملا اور چھوٹے بھائی مونو اور سونو کو دس سال گزر چکے تھے۔اس سے قبل یہ لوگ صادق نگر کالونی کے سامنے سڑک کے اس پار ایک تالاب کے کنارے جھونپڑی بنا کر آباد ہوئے تھے اور گاؤں سے ساتھ لے کر آئے تین گائے سے دودھ اور چائے، جھونپڑی سے منسلک ایک سٹال پر، بیچ کر پیٹ پال رہے تھے۔یہ غیر مزروعہ سرکاری زمین تھی اس

لئے یہاں ڈیرا ڈالنے میں اول اول تو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی، مگر پھر تھانیدار صاحب کے یہاں سے آدمی آ گیا اور روز آنہ ایک سیر دودھ تھانیدار صاحب کے یہاں پہنچانے کے عوض رام گوپال کی جاں بخشی ہو گئی۔

صادق نگر کالونی والوں کے گھر دودھ بیچ کر رام گوپال نے مناسب کمائی کر لی تھی اور تین گائے کے علاوہ اب دو بھینس کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جس سے رام گوپال کے بچے چین اور سکھ کی زندگی گزارنے لگے تھے۔ کالونی کے بچوں کی دیکھا دیکھی رام گوپال کے بچے بھی کتابوں کے بستے ڈھونے لگے تھے جسے دیکھ کر رام گوپال اور اس کی بیوی کملا کو بہت خوشی ہوتی اور وہ سنہرے مستقبل کے سپنوں میں کھو جاتے۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے صادق نگر کالونی کے ہاتھ پاؤں بڑھنے لگے اور سڑک کے اس پار جہاں رام گوپال کی جھونپڑی تھی، نئی عمارتوں کی بنیاد پڑنے لگی۔ ہر طرف کنکریٹ اور لوہے کی سلاخوں کا جنگل پھیل گیا۔ ایک دن میونسپل کارپوریشن میں کام کرنے والے دیال بابو نے، جو اکثر دودھ لینے رام گوپال کے یہاں آتے تھے یہ خبر سنا دی کہ رام گوپال والی جھونپڑی کی جگہ پر نئی کالونی میں بسنے والے مکینوں کے لئے پانی کے حوض کا ٹاور بنے گا۔ لگتا ہے دیال بابو نے پلاننگ کے نقشے کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ رام گوپال کی پیشانی پر سکڑن آ گئی لیکن اس وقت وہ خاموش رہا۔ دوسرے دن دودھ لے کر وہ خود تھانیدار کے یہاں سویرے سویرے پہنچا اور تھانیدار صاحب سے میونسپل کارپوریشن کے دیال بابو کی کہی ہوئی بات کی تصدیق چاہی۔ تھانیدار سب کچھ سن لینے کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر رام گوپال کو ملول دیکھ کر بولا:

''فکر کیوں کرتے ہو؟ جھگی جھونپڑی کی صفائی کی مہم شروع کرنے کے لئے سب سے پہلے مجھ سے ہی کہا جائے گا اور جب وہ وقت آئے گا تو میں تمھیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا'' شاید تھانیدار صاحب کو اپنے ایک سیر دودھ کے بند ہو جانے کا خدشہ بھی ہو گیا تھا۔

رام گوپال تھانیدار کے یہاں سے لوٹ آیا مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ وہ رات بھر یہی سوچتا رہا تھا کہ اس کے گاؤں میں اس کے چچا زاد بھائیوں نے اسے کمزور جان کر اس کے کھیت زمین پر قبضہ کرنا چاہا اور اسے طرح طرح سے پریشان کر دیا۔ تنگ آ کر وہ شہر چلا آیا۔ یہاں کچھ چین کے دن نصیب ہوئے تو کھونٹا اکھاڑنے کی بات آ رہی ہے۔ وہ یہاں سے اکھڑ گیا تو کہاں جائے گا؟ وہ جانتا تھا کہ سارے بڑے شہر یا مہانگر بے مروت ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تو کالے دھن والے جگہ پاتے ہیں یا پھر سیاسی لاگ بھاگ رکھنے والے چوکس لوگ۔

صبح سویرے کملا نے اپنے شوہر کو یہ صلاح دی کہ میونسپل کارپوریشن والے دیال بابو سے یہ مشورہ کرو کہ جھونپڑی اکھاڑنے کی نوٹس مل جانے کے بعد ہم لوگ کہاں جائیں اور کس سے ملیں کہ کچھ بچنے کی صورت پیدا ہو جائے۔ رام گوپال نے کملا کی بات کو غیر ضروری سمجھ کر ٹال دیا اس لئے کملا ایک روز اپنی طرف سے دودھ کا تحفہ لے کر دیال بابو کے دروازے پر جا پہنچی۔ دیال بابو نے سنجیدگی سے کملا کے مسائل کو سنا اور پھر بتایا کہ گنگا نگر کالونی میں پرائمری اسکول بنانے کے لئے ایک بڑا میدان خالی ہے مگر اس زمین پر رادھے شیام نام کے ایک شخص نے اپنا دعویٰ پیش کر رکھا ہے اور پچھلے دس سالوں سے مقدمہ زیر سماعت ہے۔ غالباً دیال بابو نے یہ سوچ کر گنگا نگر آنے کا مشورہ دیا ہوگا کہ ہماری عدالتوں میں چلنے والے مقدمے کئی کئی نسلیں جھیلتی ہیں، تب جا کر حتمی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس

درمیان رام گوپال کے بچے سکھ چین کی زندگی کاٹ لیں گے۔ کملا گاؤں کی رہنے والی حرف ناآشنا عورت تھی مگر بے پڑھی لکھی عورت بھی کبھی کبھی ایسے کارنامے دکھاتی ہے کہ دانا و بینا مرد انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

صادق نگر میں ایک روز سرکاری بلڈوزر لا کر تمام غیر قانونی تعمیرات اور جھگی جھونپڑیوں کو برابر کر دیا گیا۔ وہاں کے سارے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ جیسے وہاں زندگی تھی ہی نہیں۔ اگر کملا، دیال بابو کی مدد سے گنگا نگر میں جھونپڑی گاڑنے کا ٹھکانہ نہ کی ہوتی تو رام گوپال کیلئے گاؤں واپس جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اس لئے اب رام گوپال ہر مسئلے میں بیوی کی صلاح پر بھی دھیان دینے لگا تھا۔ آج جب کملا نے غسل خانے کے بورئے پر ڈھیلے گرنے کا واقعہ رام گوپال کو بتایا تو رام گوپال کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے بالکونی پر کھڑے چھوکروں کو اس طرح غصے سے دیکھا کہ جیسے وہ کسی سپر مین یا بچوں کے شکتی مان کی طرح اوپر اُڑ کر ان کے چہروں کو نوچ لے گا۔ کملا کو رام گوپال کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ اگر اسے نہیں روکا گیا تو آج کوئی بڑا ہنگامہ وہ کھڑا کر دے گا جس سے مزید رسوائی ہو سکتی ہے اس لئے وہ اسے کسی طرح جھونپڑی کے اندر لے گئی اور تھوڑا اچھا چھ پلا کر کہنے لگی:

''سارا قصور ان چھوکروں کا نہیں ہے۔ جہاں میٹھا ہوتا ہے وہاں مکھیاں آتی ہی ہیں۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ اب اپنی خوشبو کی خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی ہے۔ کتنی موہنی اور سندر لگنے لگی ہے اب ہماری خوشبو...... کتنی بھیڑ ہونے لگی ہے تمھاری چائے کی دکان پر...... تمھاری پیٹھ پر خوشبو جو کھڑی رہتی ہے تمھاری مدد کے لئے...... اور دوپہر کے سمے..... وہ مونچھوں والا سپاہی اور مچھلی آفس کے بڑے بابو پابندی سے آتے ہیں...... جب تم جانور کے لئے چارہ کاٹتے ہو...... میں انھیں چائے بنا کر دیتی ہوں تو وہ آہ بھر کر کہتے ہیں: ''کچھ بھی ہو خوشبو کی اماں! تم دونوں ماں بیٹی سگی بہنیں لگتی ہو..... بھگوان ایسی سندرتا اور جوانی سب کو دے'' پھر وہ اچانک تیور بدل کر کہنے لگی: ''یہ سب سالے چائے کے بہانے ہم ماں بیٹیوں کی سندرتا پر رال ٹپکانے آتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو یہ.....'' وہ غصے سے لال پیلے ہو رہی تھی۔ رام گوپال چونک گیا اور اپنی بیوی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ سچ مچ کملا تو اب بھی ویسی ہی دکھتی ہے جیسی بیس سال پہلے تھی۔ کیا اس پر سمے کا پربھاؤ نہیں پڑا۔ اس بیچ ہماری خوشبو بھی......

رام گوپال کو کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ کملا کچھ دھیمی ہو کر بولی کہ اب تو خوشبو کے لئے کوئی لڑکا دیکھنا ہوگا، مگر کیا ہمارے بنجارے بنے رہنے سے اچھے لڑکے والے ہماری طرف دیکھنا بھی پسند کریں گے؟ وہ تو ہمارے پوروج، گھر، مکان اور پریوار سب کو جاننا چاہیں گے۔ پھر کچھ رک کر کہنے لگی: ''ہم کیوں نہیں اب سب کچھ سمیٹ لیں؟''

رات کا اندھیرا باقی تھا۔ صبح کا اجالا پھیلنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ رام گوپال ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور ایک ہاتھ میں لالٹین لئے اپنی گائے اور بھینسوں کو کچی سڑک پر ہانک رہا تھا اور کچھ آگے ایک بیل گاڑی کے نیچے ایک لالٹین جھول رہی تھی اور گاڑی پر کوچوان بنی کملا..... بیلوں کو قابو میں کئے..... خوشبو، مونو اور سونو کے ساتھ کچے راستے کی لیک پر آگے بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

تمغۂ جُرات

پھر ایک کرب ناک خاموشی کچھ لمحوں کے لیے اُن سفید پوش بیواؤں اور یتیم بچوں کے اندر ماتم کی طرح گونجنے لگی۔ سسکیاں اُن کی ناکوں کے سِروں پر قطار در قطار آنسوؤں کی شکل میں ٹھہرنے لگیں، آہیں سانسوں کی شکل میں اُن کے سینوں کے زیروبم میں بسنے لگیں۔ یکا یک ایک فوجی آواز فضا کا سینہ چیرنے لگی اور شہیدوں کے ناموں سے بیواؤں کو طلائی تمغے اور سلائی مشینیں نوازی جانے لگیں۔

لانس نائیک شفقت رسول شہید کی بیوہ نے اپنی کرسی کے دونوں داہنوں کو اور بھی مضبوطی سے تھام لیا، پل بھر میں اُسے لگا جیسے اگر اُس کی کرسی پر گرفت زرا بھی دھیمی پڑی تو وہ سیدھی زمین پر ڈھہ جائے گی اور کرسی کے نیچے بچھی ہوئی یہ بے درد زمین اُسے بھی اُسی طرح درندگی سے نگل جائے گی جس طرح اُسکے جوان جہان شوہر کو زندہ چبا گئی۔۔ زمین۔۔ ماں جائی۔۔ اُس نے حقارت سے سوچا۔۔ اونہہ۔۔ اُس کا اندر ہی اندر جلنے لگا۔۔ آگ تھی جو اُس میں پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔۔ اور پھر لمحے بھر میں شعلے آسمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ پل بھر میں آگ کے شعلوں میں اُس کے اردگرد پھیلی ہوئی ساری ہی روشنیاں راکھ ہوگئی اور پھر یکا یک وہ گُھپ اندھیرا پھیلا کہ وہ خود کو آس پاس نہ پا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ زرا سی دیر میں آنسو جو پلکوں سے گرے تو دھوئیں کا ایک بادل سا اُٹھا اور اُس کے اردگرد کا نظارہ ایک نئے ہی منظر میں ڈھلنے لگا۔۔

زمین۔۔ ایک بھیانک عفریت کا روپ دھارے خلاؤں میں گھوم رہی تھی۔ انسانی ہڈیوں سے بھرا قبرستان زمین کے دہانے سے دھیرے دھیرے اُتر کر اُس کی آنتوں کو بھر رہا تھا۔ گرم گرم خون کی لہریں اُس کی رگوں میں موج در موج اُبل رہی تھیں اور ٹھاٹھے مارتے ہوئے اُس کی شہِ رگ کو سیراب کر رہی تھیں۔۔۔ یہ خون ہی تھا جو پگھلتا تھا تو اُس کے بدن کے سیاہ بدبودار تیل کے ندی نالے بن جاتا تھا اور جو جمتا تھا تو سونے، چاندی اور پیتل کی دھاتوں کی شکل میں ڈھل کر اُس کے پیٹ میں جمع ہو جاتا تھا۔۔ مگر پھر بھی وہ بھاری بھرکم بدنما سا پھولا ہوا پیٹ، اپنی بھوکی نظروں سے خود پر پھیلے ہوئے انسانی زندگیوں کے بے کداں سمندر کو للچائی نظروں سے تک رہا تھا۔ دور خلا میں پھیلے ہوئے اُس کے ان گنت بازوں انسانی گردنوں کو دبوچنے کے لیے بے تابی سے خود کو مسل رہے تھے۔۔۔ وہ خوفناک عفریت ہر ایک لمحے میں سیکڑوں بار اپنی شکل بدلتا تھا۔۔۔ کبھی بھیانک زلزلہ بن کر

ہزاروں، لاکھوں بے بس لوگوں کا زندہ نوالہ بنا لیتا، تو کبھی لمحے بھر میں اُنہیں آندھی وطوفان میں سمیٹ کر اپنے بھوکے معدے کا حصہ بنا دیتا، کبھی گل گلزار میں ڈھل کر معصوم انسانوں کو للچاتا اور پھر اُن کی لاشوں کے تر نوالے چباتا تو کبھی مادر وطن اور دھرتی ماتا کا تلنگا بن کر جنگ کے دلدل میں اُنہیں جھونک دیتا اور پھر اُن کی لاشوں پر لپٹ کر بے رحمی سے اُنہیں اپنے سینے میں اُتار لیتا۔۔۔

اچانک فوجی بینڈ اور توپوں کی بھونڈی آوازوں سے فضا کا سینہ پھر سے شہید ہونے لگا۔

لاس نائیک شفغت رسول کی بیوہ جھرجھری لے کر اپنی جگہ پر کانپنے لگی۔ اُس نے سہمی سہمی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہر ایک بیوہ طلائی تمغے ہاتھوں میں لیے، سر جھکائے اپنی اپنی سلائی مشینوں کو، کھوئی کھوئی نظروں سے تک رہی تھی۔ پل بھر میں اُسے لگا جیسے اُس کے اردگرد پھیلی ہوئی بے رحم زمین نے ان عورتوں کے شوہروں کو چبا کر سلائی مشینوں سے بدل دیا ہو اور پھر اُنہیں کے لہو کے رنگوں سے سجے دجے طلائی تمغوں سے نواز دیا ہو۔ ایک شدید نفرت کا طوفان اُس کے اندر سے اُٹھا اور اُس نے غصے سے اپنے پاؤں زمین پر رکھ دیے جیسے اُس کے سینے پر جوتے رکھ کر اپنے سینے میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی ہو اور جب اُس سے مزید برداشت نہ ہوا تو اچانک کھڑی ہو کر اپنے پیروں سے زمین کو بار بار روندنے لگی اور منہ ہی منہ میں بڑ بڑانے لگی۔۔ مائیں اپنے بچوں کا خون نہیں پیتی، مائیں اپنے بچوں کا خون نہیں پیتی۔

کچھ ہی دیر میں فوجی بینڈ پھر سے چپ ہو گیا اور ایک بار پھر شہیدوں کے نام پکارے جانے لگے۔

اس بار پہلا نام لاس نائیک شفغت رسول شہید کا تھا۔

’’لاس نائیک شفغت رسول شہید۔۔ رجمنٹ ۲ اے ۲، مادر وطن کے لیے جان کا نذرانہ دے کے تمغہ جرات کے حق دار قرار پائے۔‘‘

یہ سنتے ہی لاس نائیک شفقت رسول کی بیوہ دوڑتی ہوئی فوجی افسروں کے پاس پہنچی۔۔۔ اور اپنی پوری جُرات سے اُن سے چیخ چیخ کر کہنے لگی۔۔ یہ دھات کا ٹکڑا اور لوہے کی مشین اس کلموہی زمین کو واپس کر دو اور میرے شوہر کا خون اِس سے واپس لے لو۔

’’مجھے لگتا ہے، امی مری نہیں، ہمیں یونہی وہم ہو گیا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔۔۔ ذرا سوچو ماں مر جائے، ہماری زمین ہی مر جائے تو ہم کیونکر اپنے پیَروں پر کھڑے رہ سکتے ہیں؟ نہیں خورشی ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کون سی ماں چاہے گی کہ اس کے لہلہاتے پودے کھڑے کھڑے سوکھ جائیں؟ قدرت معصوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں برتتی، ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ہمیشہ!‘‘ (**جوگندر پال** کے افسانہ **مقامات** سے اقتباس)

علی محسن (فیصل آباد)

نارسائی

مَیں اُس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ اِس شہر میں واجبی سی شکل وصورت کی بیسیوں لڑکیاں ہیں، چاکلیٹ کھانے کی شوقین جنہوں نے رُخصتی کے دِن نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

ہماری پہلی ملاقات بہت عجیب تھی، بالکل فلمی انداز میں۔

مَیں جُوں کی طرح جاگنگ ٹریک پر رینگ رہا تھا، وہ برق رفتار میرے پاس سے گزری۔ پارک میں اُس وقت چار چھ لوگ ہی ہوں گے۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بلب آف، نیم تاریکی تھی۔ میں خوشبو کے اُس جھونکے کو ابھی محسوس کر رہا تھا جو اُس کے گزرنے سے فضا کو معطر کر گیا تھا، وہ رُکی، مُڑی، کھڑے کھڑے میرے پیروں کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا میں چڑیل ہوں جس کے مُڑے ہوئے پیروں کو وہ بغور دیکھ رہی ہے۔

''بیمار ہیں؟'' میرے قریب آ کر اُس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔ کالے ٹریک سوٹ میں ملبوس وہ واجبی سی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ بے اختیار میرے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ میری سُست رفتاری کو وہ میری بیماری سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ ذرا سا جھینپی، یکدم کھلکھلا کر ہنسی اور جاگنگ ٹریک پر دوڑتی چلی گئی۔ اُس کے خوبصورت بال اُس کی پشت پر پھیل گئے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

اُس سے اگلی شام میں پسینے میں شرابور جاگنگ ٹریک پر دوڑ رہا تھا جب وہ پیچھے سے بھاگتی ہوئی آئی اور میرے کندھے کو تقریباً چھوتے ہوئے گزری۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی، میں آخری چکر میں سخت تھکا ہوا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ ٹریک خالی تھا، زیادہ تر لوگ جا چکے تھے۔ دو تین بنچوں پر بیٹھے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ وہ کالے ٹریک سوٹ والی دوسری بار برق رفتار میرے پاس سے گزری، مجھے لگا اُس کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔ میں رُکتے رُکتے پھر بھاگنے لگا۔ میں نے بھانپ لیا اُس کا اسٹیمنا بہت زیادہ تھا مگر ضد مجھے بھی دوڑا رہی تھی۔ میں اُس کے تھک کر رُک جانے تک بھاگنا چاہتا تھا۔ آٹھویں چکر میں اُس کے قدم رُکے تو میرا ابھی سانس اُکھڑ چکا تھا۔ میں مزید ایک قدم بھاگتا تو یقیناً بے جان ہو کر گر جاتا۔ مجھے گیٹ کے پاس کھڑے لمبے لمبے سانس لیتے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ ٹریک پر سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔ میری ہمت جواب دے چکی تھی، میں اُس کی ضد میں مزید بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں بنچ پر لیٹ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس رُکی اور

چاکلیٹ کا پیکٹ میری چھاتی پر آ گرا۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر بلا کی پُر اعتماد۔ اُس شام ہماری شناسائی ہوئی! مجھے نہیں معلوم ہم اتنی جلدی کیسے اتنا قریب آ گئے۔ اس سے پہلے ہماری ملاقات، کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ پارک میں سیر کے لئے بیسیوں لوگ آتے، اُن میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ واجبی سی شکل وصورت والا۔ ٹریک پر روزانہ کئی لڑکیاں جاگنگ کرتیں، اکثر کو مَیں دو سال سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کسی نے رُک کر پوچھا نہیں تھا ''بیمار ہیں؟'' کبھی مَیں نے کسی کی پشت پر پھیلے ہوئے بالوں کو اتنے غور سے دیکھا نہیں تھا۔ وہ لڑکی جس نے پہلے روز سے تکلف کی دیوار گرا دی، برسوں کی شناسا بن گئی، بہت عجیب تھی وہ۔ تیسری شام نجانے کیسے ہم دونوں ایک ہی وقت پر پارک کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں موٹر سائیکل کو لاک کر رہا تھا جب اُس کی کار میری ٹانگوں سے ایک انچ کے فاصلے پر آ رُکی۔ اُس نے مسکرا کر مجھے ہیلو کہا، منرل واٹر کی بوتل ہاتھ میں لئے بالوں کو جھلاتی ہوئی وہ میرے ساتھ جاگنگ ٹریک پر آ گئی۔ ''دوڑ لگانی ہے؟'' اُس نے چیلنج کیا۔ آج وہ سکن کلر کے ٹراؤزر شرٹ میں تھی۔

''نہیں! تھکا ہوا ہوں!'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل تو خوب بھاگے!'' اُس کی شرارتی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اسی لئے تو آج چلا نہیں جا رہا'' میں واقعی بمشکل چل پا رہا تھا، ساری رات بخار میں پھنکتا رہا، جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

''تو پارک کیوں آئے؟ ریسٹ کرتے'' اُس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پتا نہیں کیوں آ گیا'' مجھے واقعی معلوم نہیں تھا، اس حالت میں میں کیوں چلا آیا۔

''اچھا چلو بیٹھ جاؤ وہاں'' اُس نے بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ میں چُپ چاپ بنچ پر جا بیٹھا، انکار کی ہمت تھی نہ چلنے کی سکت۔ وہ پانی کی بوتل مجھے پکڑا کر ٹریک پر دوڑنے لگی۔ چار چکر لگا کر وہ لوٹ آئی۔ میں بنچ پر لیٹا ہوا تھا، وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''اتنی جلدی؟'' میں نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں، جسم بے جان ہو رہا تھا۔

''طبیعت؟'' اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا، تھکن بھرے چہرے کو بغور دیکھا۔

''ٹھیک نہیں ہے، شدید سر درد'' درد کی ٹیس نے مجھے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبانے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھکی اور میری پیشانی کو چھوا۔ ''اوہ مائی گاڈ! اُٹھو!'' تحکمانہ انداز، اُس کا لہجہ تشویشناک تھا۔

''نہیں! ہمت نہیں ہے، مجھے کچھ دیر لیٹنے دو'' میں نے بازو چہرے پر رکھ لیا۔

''تیز بخار ہے تمہیں! چلو ڈاکٹر کے پاس!'' اُس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بنچ سے اُٹھا لیا۔

تب ہم ایک دوسرے کا نام نہیں جانتے تھے۔ وہ سانولے رنگ کی عام سی لڑکی تھی جس کی شخصیت کا سارا حُسن اُس کی آواز میں تھا۔ سحر انگیز لہجہ۔ بڑی مشکل سے چلتا ہوا میں گیٹ تک پہنچا، اُس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کے ٹائر چیخ اُٹھے، وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی کلینک کے سامنے جا رُکی۔ اُس کے ہاتھ کا سہارا لے کر میں کلینک کی سیڑھیاں چڑھا۔

''نام کیا لکھوانا ہے؟'' استقبالیہ پر کھڑے کھڑے اُس نے پوچھا، میں انتظار گاہ کے بنچ پر بیٹھ چکا تھا۔

''سرمد! سرمد منیر!''

''سرمد منیر!'' اُس نے نرس کو نام لکھوایا۔

''عمر؟'' وہ ایک بار پھر پلٹی، مجھے لگا اس بار اُس کے سوال میں ہلکی سی شرارت بھی شامل تھی، حالانکہ عمر کے بارے میں نرس نے پوچھا تھا۔

''چھبیس۔۔۔! نہیں!۔۔ستائیس!۔۔۔شاید اٹھائیس۔۔۔!'' جسمانی تکلیف کے باوجود میرے لہجے میں شرارت عود آئی تھی۔

''تیس لکھ لیں!'' اُس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ نرس کو لکھوایا جو حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں بمشکل اپنا قہقہہ روک سکا۔ اُس شام ہماری آشنائی ہوئی۔

پھر روزانہ یونہی ہونے لگا۔ موبائل پر اُس کا پیغام موصول ہوتا ''لمبے! اکیڈمی سے نکل رہی ہوں، دس منٹ میں پہنچ جاؤں گی''

میں جواب میں لکھتا ''ٹھگنی! بائیک پر ہوں، رستے میں۔ ملتے ہیں''

وہ چاکلیٹ کی شوقین تھی، میں فریش جوس کا دیوانہ۔ گھنٹہ بھر واک کے دوران وہ چاکلیٹ کے کئی پیکٹ میری مٹھی میں پکڑاتی، کئی خود کھا جاتی۔ پارک کے سامنے کینٹین میں لکڑی کے کھردرے بنچ پر بیٹھ کر فریش جوس منگوا لیتے۔ بے تکی باتیں، جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ مَیں تو وقت گزاری کے لئے بہانہ ڈھونڈتا تھا، وہ کیوں اِن فضول باتوں کو طُول دیتی تھی؟ ''لمبے! تمہارا کمرہ تو صاف ستھرا ہوگا؟'' جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے اُس نے کہا۔

''نہیں! بہت گندا'' میں نے گلاس منہ سے لگا کر گھونٹ بھرا۔

''ہائیں؟ کمال ہے'' اُس نے بالوں کو جھٹکا دیا۔

''اس میں کمال کی کیا بات؟ ہاسٹل کبھی دیکھا نہیں تم نے، بہت گندے کمرے ہیں''

''جالے تو نہیں ہوں گے تمہارے کمرے کی چھت، دیواروں پر۔۔۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''جالے؟'' میں اُس کی بات واقعی نہیں سمجھ پا رہا تھا، وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

''لمبے! تمہارے کمرے میں جالے کیسے ہو سکتے ہیں؟'' اُس کی آنکھیں شرارت سے چمک اُٹھیں۔ میرے لبوں پر ہنسی کھیل گئی۔ ''ٹھگنی! دھیان سے چلا کرو، کوئی جیب میں ڈال کر لے جائے گا'' میں نے بھی جوابی وار کیا۔

''ایویں ہی! اتنی چھوٹی تو نہیں، بس تمہارے سامنے ٹھگنی لگتی ہوں لمبے!'' اُس نے اپنا گلاس بنچ پر رکھ کر میرا گلاس اُٹھا لیا، ایک ہی گھونٹ میں جوس کا آدھا گلاس خالی ہو گیا۔ میں نے کبھی کسی کا جھوٹا کھایا، پیا نہیں تھا مگر اُس شام اُس کا چھوڑا ہوا جوس میں نے پی لیا۔

وہ ٹھگنی نہیں تھی، میں اتنا لمبا نہیں ہوں مگر ایک ساتھ کھڑے ہوتے تو وہ بہت چھوٹی لگتی، میرا قد سرو برابر ہو جاتا۔ بلی اُونٹ کی مثال بھی اُسی نے دی تھی ایک بار۔ بلی جو ایک اُونٹ کے گلے پڑ گئی تھی اور اُونٹ اُسے لے کر

صحرا میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اُونٹ کا مالک اُونٹ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ ہارا اور بلی کی مالکن بلی کی تلاش میں پھرتی رہی۔ اُونٹ اور بلی تو نہ ملے مگر مالک اور مالکن اِسی تلاش میں ایک دُوسرے کو مِل گئے، ہمیشہ کے لئے۔ صحرا میں جانے والے اُونٹ، بلی کا کھوج آج تک نہیں ملا۔

مجھے نہیں معلوم تھا بظاہر فولاد کی طرح مضبوط اور پُر اعتماد نظر آنے والی لڑکی اندر سے اتنی سہمی ہوئی، بالکل چند سال کی بچّی جیسی ہے۔ ''لمبے! جاگ رہے ہو؟'' یہ ایک بھیگی ہوئی رات تھی۔ موسلا دھار بارش، ہوا کے تھپیڑوں سے کمرے کے کھڑکی دروازے بار بار بج اُٹھتے۔

''ہاں!'' مَیں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا، وال کلاک نے رات دو بجے کی گھنٹی بجائی۔

''کیوں؟'' اُس نے پوچھا۔

''تم کیوں جاگ رہی ہو ٹھگنی؟'' مَیں نے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُس سے سوال کیا۔

''مَیں؟ سچ کہوں؟'' اُس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

''کہو!''

''ڈر لگ رہا ہے'' لرزتی ہوئی سہمی آواز، مَیں چونکا۔

''ڈر؟''

''مجھے بارش سے بہت ڈر لگتا ہے ، لائٹ بھی نہیں ہے۔ گُھپ اندھیرا ہے کمرے میں'' وہ چھ سال کی بچّی لگ رہی تھی جس کے والدین اُسے گھر میں اکیلا چھوڑ گئے ہوں اور وہ تنہائی کا شکار، اندھیرے سے خوفزدہ ہو۔

''اِس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ مجھے تو بارش میں بھیگنا بہت پسند ہے، سنو ٹھگنی! پارک جا رہا ہوں واک کرنے'' مَیں نے کہا۔

''پارک؟ اِس وقت؟ اِس تیز بارش میں؟'' وہ حیران رہ گئی۔

''ہاں!'' میں نے بُوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

''رات کے دو بجے کوئی نہیں ہوگا وہاں۔ اکیلے تم۔۔۔ پاگل ہو؟''

''تم پاگل ہو ٹھگنی! ایسے زبردست موسم میں بند کمرے میں گھسی بیٹھی ہو۔ اچھا بائے، مَیں نکل رہا ہوں'' مَیں بُوٹ کے تسمے باندھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

''لمبے!'' یکدم اُس کا لہجہ منّت آمیز ہو گیا۔

''کیا ہے؟''

''بات مانو گے؟''

''بولو!''

''مت جاؤ! اِس وقت مت جاؤ!'' مَیں ششدر رہ گیا، اُس کا مُلتجی لہجہ مجھے روک رہا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، پلیز!'' مَیں اُس کی بات سُن کر کھڑا رہ گیا، قدم نہیں اُٹھے۔

’’بہت ڈر لگ رہا ہے مجھے، خوف آ رہا ہے‘‘ وہ واقعی خوفزدہ تھی۔

’’تو؟‘‘

’’میرے ساتھ باتیں کرو، جب تک لائٹ آ نہیں جاتی۔۔۔ جب تک بارش تھم نہیں جاتی۔۔۔!‘‘ اُس کے لہجے میں عجیب بیچارگی تھی۔

مَیں رُک گیا، بُوٹوں سمیت بستر پر لیٹا مَیں اُس سے باتیں کرتا رہا، یاد نہیں کیا کہا، اُس نے کیا کُچھ کہا یہ بھی یاد نہیں مگر جب فون بند ہُوا تو صبح کی سپیدی روشندان اور کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

اُس کے ہاتھ میں مہنگا موبائل فون ہوتا، لباس قیمتی، کار کی چابی اُنگلی میں گھماتی، چاکلیٹ چباتی وہ کسی کو بھی مرعوب کر سکتی تھی۔ مَیں مرعوب سے زیادہ حیران تھا۔ وہ اکیڈمی میں چند ہزار کے عوض بچّوں کو پڑھا رہی تھی۔ مجھے یقین ہے تنخواہ سے زیادہ رقم وہ گاڑی کے پٹرول اور چاکلیٹ کے شوق میں اُجاڑ دیتی تھی۔ مَیں اُس سے کبھی نہ پوچھ سکا، یہ معمہ فضیلہ نے بھی حل نہ کیا جو پہلی ملاقات میں بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ اکیڈمی میں اُس کی کولیگ تھی۔

’’لمبے! یہ فضیلہ ہے، میری بہت اچھی دوست!‘‘ اُس نے تعارف کرایا۔ لمبے کو اِس تعارف سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی، فضیلہ کا منہ بھی کُھلا رہ گیا تھا۔ اُس نے ہم دونوں کی بوکھلاہٹ کا مزا لیا۔

’’سرمد منیر نام ہے مگر مجھے یہ نام پسند نہیں، اتنے لمبے بندے کا نام اتنا چھوٹا، عجیب سا لگتا ہے نا؟‘‘ اُس نے فضیلہ سے پوچھا جس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا، مَیں جھینپ رہا تھا۔ فضیلہ اچھی لڑکی تھی مگر یوں پہلی ملاقات میں۔۔۔ عجیب لگتا ہے نا؟ یادیں ہیں جو ہمیشہ اذّیت دیتی ہیں۔ یہ گٹھڑ کیوں ہم سنبھال کر رکھ لیتے ہیں اور تنہائی کی اکثر راتوں میں کھول کر پُرانی، میلی یادوں کا ڈھیر اپنے اردگرد پھیلا دیتے ہیں۔ بیتے ہوئے لمحوں کی خوشبو کمرے میں رقص کرتی ہے، جی جلاتی ہے۔ ’’فوراً اکیڈمی پہنچو، دس منٹ میں!‘‘

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے وہ دسمبر کی آخری شب تھی، میں ہاسٹل کولیگز کے نرغے میں تھا۔ وہ سب میوزک شو دیکھنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور میں راہ فرار ڈھونڈھ رہا تھا۔ اُس کے موبائل پیغام نے میرا لہجہ یکدم سرکش کر دیا۔

’’مجھے نہیں جانا میوزک شو میں‘‘ اتنے تلخ لہجے میں اُن سے کبھی بات نہیں کی تھی، وہ سب حیران رہ گئے۔ میں بائیک پر سوار اکیڈمی گیٹ پر پہنچا تو وہ منتظر تھی۔

’’لمبے! سات منٹ لیٹ ہو!‘‘

’’ٹھگنی! کیا پرابلم ہے؟‘‘

’’گاڑی خراب، ورکشاپ میں کھڑی ہے‘‘ وہ چاکلیٹ چباتی اطمینان سے بولی۔

’’تو؟‘‘

’’تو! تھوڑی سی شاپنگ، اُس کے بعد مجھے ورکشاپ ڈراپ کر دینا!‘‘ میرا جواب سنے بغیر وہ بائیک پر پیچھے بیٹھ گئی۔ اُس کے سانسوں کی مہک مَیں محسوس کر سکتا تھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ اطمینان سے بیٹھی تھی، مجھے کچھ زیادہ عجیب نہیں لگا۔ اُس شام ہم پارک نہیں گئے، واک نہیں کی۔ کتابوں کے سٹال دیکھے، آئس کریم کھائی،

چاکلیٹ خریدے، نئے سال کے کارڈ۔۔۔ ایک اُس نے پسند کیا، ایک مجھے اچھا لگا۔ ایک خوبصورت گلدستہ اُس نے خریدا، مجھے نہیں معلوم کس کے لئے۔ ورکشاپ میں اُس کی گاڑی تیار کھڑی تھی، میں اُسے ڈراپ کر کے ہاسٹل پہنچا تو سناٹے کا راج تھا، سب میوزک شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ کمرے کا لاک کھولتے ہوئے میں نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش کی نئے سال کا وہ شوخ رنگوں والا کارڈ میں کس کے لئے خرید لایا تھا؟ میرے پاس اپنے ہی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وال کلاک کی سوئی بارہ کے ہندسے کو چھو رہی تھی جب میرے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔

’’لمبے! ہیپی نیو ائیر!‘‘ اُس کی آواز میں بیحد اپنائیت تھی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

’’ہیپی نیو ائیر ٹھگنی!‘‘

’’نئے سال کی پہلی کال تمہیں کی ہے‘‘ مجھے نہیں معلوم اُس نے نئے سال کا وہ کارڈ اور گلدستہ کس کے لئے خریدے تھے مگر دل نے گواہی دی وہ سچ کہہ رہی تھی۔

وہ تو ہمیشہ سچ ہی بولتی تھی۔ ’’میں رُوٹھی تو پھر کبھی نہیں مانوں گی لمبے!‘‘

مَیں اُسے بہت ستانے لگا تھا مگر مجھے یقین تھا وہ کبھی مجھ سے خفا نہیں ہو گی، وہ مجھ سے کبھی رُوٹھ نہیں سکتی۔ یہ یقین اُس کے بچھڑ جانے تک میرے دِل میں رہا۔ مَیں کسی سے خفا کب ہوتا تھا، کب کسی سے روٹھتا تھا، یہ عادت بھی اُسی نے ڈال دی تھی بات بے بات رُوٹھ جانے والی۔

’’آج بلیک مت پہننا!‘‘ میں موبائل پر اُسے کہتا۔

’’کیوں؟ میں نے تو بلیک پہن لیا، بس نکل رہی ہوں‘‘ وہ کہتی۔

’’تو اکیلے ہی واک کرنا، میں نہیں آ رہا‘‘ پتا نہیں کہاں سے خفگی خود بخود میرے لہجے میں آ جاتی، میں کال منقطع کر دیتا

’’سکن؟‘‘ وہ فوراً کال کرتی، ملتجی انداز میں پوچھتی۔

’’نہیں!‘‘

’’تو؟‘‘

’’بلیو!‘‘ میں یوں حکم چلاتا جیسے وہ میری رعایا ہو۔

’’بلیو نہیں ہے میرے پاس! بلیک ہے یا سکن ٹریک سوٹ‘‘ وہ بیچارگی سے کہتی۔

مجھے نہیں معلوم میں کیوں ان بے مقصد باتوں میں اُلجھتا جا رہا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر خفگی، وہ بار بار مناتی، میں بار بار رُوٹھتا۔ یہ عجیب کھیل کچھ دنوں سے چل نکلا تھا۔ مَیں اُس سے ناراض ہوتا اور میرے مُنھ کو قُفل لگ جاتا، چُپ سادھ لیتا۔ اُس کی کسی بات کا جواب دیتا نہ کوئی بات اُس سے کرتا۔ میری خاموشی اُس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ سو حیلے کرتی، کئی جتن مگر مَیں جیسے گُونگا ہو جاتا۔ وہ بھی تھکتی جا رہی تھی۔

’’رات کو فون کیوں نہیں کیا؟‘‘ ہم دونوں اکیڈمی گیٹ پر کھڑے تھے، میرا لہجہ برہم تھا۔

’’سو گئی تھی‘‘ بیگ کو کندھے پر ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے اُس کے لہجے میں معذرت تھی۔

''کیوں سوگئی؟'' میری آواز میں غصہ نمایاں تھا۔
''تھک گئی تھی، کل بہت تھک گئی تھی'' اُسے کلاس میں جانے کی عجلت تھی۔ میں خوامخواہ بات بڑھا رہا تھا۔
''میں تو جاگتا رہا نا۔۔'' پیر پٹختا، تیز قدموں سے میں لان کی طرف چل دیا۔ وہ گومگو کی حالت میں کھڑی رہ گئی، بچے کلاس میں اُس کے منتظر تھے اور میں منہ پھلائے جا رہا تھا۔
''اچھا سوری۔۔!'' وہ میرے پیچھے بھاگی چلی آئی جیسے بچہ بھیڑ میں ماں کے پیچھے۔ اس خوف میں مبتلا کہ بچھڑ جائے گا، ہجوم میں کھو جائے گا۔ میں رکا نہیں، اُس کے لئے کبھی نہیں رُکا۔
''کہا نا سوری۔۔'' اُس کی آواز میں منت تھی مگر میں ہونٹ بھینچے چپ چاپ لان میں بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ دو کشتیوں کی سوار تذبذب میں کھڑی رہی پیر پڑے یا مجھے منائے؟ پھر ہمیشہ کی طرح وہ ہار گئی، ہلکان! میرے پاس آ بیٹھی۔
''چپ کی اذیت تم نہیں سمجھ سکتے، تمہیں اندازہ نہیں یہ کتنی بڑی سزا ہے'' وہ بولی، میں خاموش، کاغذ کے ٹکڑے کرتا رہتا۔
''کبھی سوچا تم نے میں کس عذاب سے گزرتی ہوں؟''
میں نے جواب نہیں دیا۔
''کبھی کبھی اپنا آپ بوجھ لگتا ہے، خود سے نفرت ہونے لگتی ہے، اتنا اگنور کرتے ہو جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں'' اُس کی آواز بھیگ گئی۔ میں کچھ نہیں بولا، مسلسل چپ۔
''خدا کے لئے کچھ بولو! میرا دماغ پھٹ جائے گا'' اُس کا چہرہ دُکھ کی شدت سے دہک اٹھا۔
''میں جاگتا رہا۔۔'' میرے لہجے کی چبھن نشتر سی تھی۔
''کہا نا سوگئی تھی، آنکھ کھلی تو موبائل پر تمہاری مسڈ کال تھی پھر میں دو گھنٹے ڈائل کرتی رہی تم نے اٹینڈ کیوں نہیں کیا؟''
''کیوں کرتا؟ جان بوجھ کر نہیں کیا، اتنا غصہ تھا مجھے۔۔۔'' غصہ ہمیشہ مجھے ہی کیوں آتا تھا؟
''پاگلوں کی طرح میں بار بار ڈائل کرتی رہی، تھک جاتی پھر سوچتی تم اٹینڈ کرلو گے مگر نہیں ہر بار تم نے مایوس کیا''
وہ کس سولی پر لٹکی رہی ہوگی، مجھے کبھی اندازہ نہ ہوا۔
اُس رات بھی نہیں جب موبائل پر مجھ سے بات کرتے کرتے وہ گھر میں داخل ہوئی تھی، اُسے خیال نہیں رہا کہ موبائل آن ہے اور میں اُس کی گفتگو سُن رہا ہوں۔
''صفدر نے کل بھی تمہیں منع کیا تھا، روکا تھا اکیڈمی جانے سے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' اجنبی عورت کی آواز میں خفگی تھی۔
''وہ کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا؟'' وہ یکدم پھٹ پڑی۔ میں ششدر رہ گیا۔ یہ لہجہ تو میں نے کبھی نہیں سُنا تھا۔
''باپ ہے تمہارا۔۔!'' عورت کی کرخت آواز سنائی دی جس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی اُس نے۔
''میرا باپ مر چکا۔۔۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں وہ صرف آپ کا شوہر ہے، میرا باپ نہیں۔'' اُس کی بات

مجھے ساری کہانی سمجھا گئی۔ یہ بھید آج پہلی بار مجھ پر کُھلا تھا۔
''بہر حال صفدر کو تمہارا اکیڈمی جانا اور اُس فضول لڑکے سے ملنا بالکل پسند نہیں۔''
''آئی ہیٹ ہم! اُسے کیا پسند ہے اور کیا نہیں مجھے اِس کی پروا نہیں، میں اکیڈمی چھوڑوں گی نا کسی سے ملنا۔۔۔ ڈیٹس آل'' وہ پارک والی ہنس مکھ لڑکی نہیں تھی جس کا لہجہ ہمیشہ چاکلیٹ جیسا میٹھا ہوتا اور جو بات بے بات ہنستی رہتی تھی۔
''شٹ اپ! مجھے زبردستی کرنے پر مجبور مت کرو۔ میں تمہارا گھر سے نکلنا بند کردوں گی'' عورت جو اُس کی ماں تھی شدید غصے میں چلاّ اُٹھی۔
''مجھے روکنے کی بجائے بہتر ہوگا آپ اُسے روکیں جو گندی عورتوں کے ساتھ سونے کا شوقین مرد اور آپ کا شوہر ہے۔'' طنزیہ لہجے کے ساتھ آگ اُگلتی شائد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے قدموں کی آواز مجھے سنائی دی تھی، عورت پر شاید سکتہ طاری ہوگیا وہ کچھ نہیں بولی۔
مَیں دیر تک گم صم بیٹھا رہا، اُس کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا ''لمبے! کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' چاکلیٹ چباتے ہوئے اُس نے بظاہر بڑی لاپرواہی سے کہا تھا۔ یہ اُسی شام کی بات تھی۔
''نہیں!'' مجھے کافی دیر سوچ کر جواب دینا پڑا۔ وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے رہی۔
''جھوٹ!'' اُس نے یُوں کہا جیسے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہو، وہ جانتی ہو میں سچ نہیں بول رہا۔
''جھوٹ کیوں، سچ کہہ رہا ہوں''
''میرا خیال تھا تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔'' وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔
''اگر تمہارا خیال ہے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے تو تم غلطی پر ہو ٹھگنی!'' مَیں نے اُس کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھین لیا۔
''مجھ سے؟ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوسکتی لمبے؟'' وہ بھی خوشدلی سے بولی۔
''محبت اور تم سے؟'' مَیں طنزیہ ہنسی ہنسا، میرا مقصد اُس کا مذاق اُڑانا نہیں تھا مگر نجانے کیسے میری ہنسی میں طنز شامل ہوگیا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ ایک پَل کے لئے بدلا۔
''واجبی سی شکل وصورت والی لڑکی ہو ٹھگنی! مَیں تم سے محبت کیوں کرنے لگا؟'' مَیں نے دانستہ اُس کی دِل شکنی نہیں کی تھی، مَیں تو مذاق کر رہا تھا۔
''واجبی شکل وصورت والے انسان نہیں ہوتے؟'' اُس نے یکدم کہا، مَیں ششدر رہ گیا۔ مَیں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا تھا، مجھے احساس ہوا۔ ''یہ مت سمجھنا مَیں تمہیں دِل دے بیٹھی ہوں لمبے!'' وہ یکدم شوخ ہوئی مگر مَیں اُس کے لہجے کا اُتار چڑھاؤ بھانپ چکا تھا۔
''مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے، واقعی مجھ سے محبت نہیں ہے تمہیں؟'' مَیں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''محبت اور تم سے؟'' وہ گلا پھاڑ کر ہنسی، اُس کی ہنسی پارک میں دُور تک چلی۔ ''اتنے لمبے ہو مگر عقل۔۔۔!'' اُس

نے اپنی کنپٹی پر اُنگلی رکھ کر گھمائی جیسے مجھے پاگل کہہ رہی ہو۔

’’مجھے یقین تھا تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی‘‘مَیں نے اُسی کا فقرہ دہرایا۔

’’مَیں تمہارے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولتی، محبت تو نہیں مگر مجھے۔۔۔تمہاری عادت سی ہو گئی ہے لمبے!‘‘ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

’’عادت؟‘‘

’’ہاں! محبت سے زیادہ عذاب ہے اِس عادت کا۔تم نہیں سمجھو گے! چلو جُوس پلاؤ!‘‘ وہ بنچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔مَیں اُس کے ساتھ چل پڑا مگر سوچتا رہا ہمیں ایک دُوسرے سے محبت نہیں صرف عادت ہو گئی ہے ایک دُوسرے کی۔عادت تو کسی بھی وقت بدلی جا سکتی ہے، اِس پر اتنا سوچنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

اگلی شام وہ پارک نہیں آئی، مَیں اُس کا انتظار کرتا رہا۔موبائل پر اُس کا پیغام موصول ہُوا نہ اُس نے کال کی۔گندی عورتوں کے ساتھ سونے والے سوتیلے باپ کے روکنے پر رُکنے والی وہ لڑکی نہیں تھی۔مَیں بہت دیر تک اکیلا ٹریک پر چلتا رہا۔کیا وہ کل شام میری کسی بات پر خفا ہو گئی تھی؟ میرا ’’واجبی سی شکل وصورت کی لڑکی‘‘ کہنا اُسے بُرا لگا؟ وہ ناراض تھی؟ جی چاہا فون کر کے پوچھ لوں وہ کہاں تھی؟ پارک کیوں نہیں آئی؟ مگر جھوٹی انا نے اِس خیال کا گلا گھونٹ دیا۔’’وہ خفا ہے تو ہوتی رہے‘‘مَیں نے تلخی سے سوچا ’’اُس نے فون نہیں کِیا تو مَیں کیوں کروں؟‘‘مَیں نے اپنے آپ سے کہا مگر نظریں بار بار پارک کے گیٹ کی طرف اُٹھ جاتیں، شاید وہ آ جائے۔۔!

موبائل کی گھنٹی بجی، دِل بھی سینے میں دھک دھک بجنے لگا۔یوں کیوں ہوتا ہے؟ وہ غیر اہم تھی تو اُس کا اتنا انتظار کیوں تھا؟ انتظار تھا تو اظہار میں کیا قباحت تھی؟ اظہار میں کوئی سوچ مانع تھی تو انکار ہی۔۔۔! یہ انکار اور اقرار ۔۔۔نجانے کیا بھید ہے، مَیں تو کبھی سمجھ نہیں پایا۔

فضیلہ بول رہی تھی ’’سرمد! آج وہ اکیڈمی نہیں آئی، موبائل بھی آف ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘مَیں چونکا۔غصّہ جھاگ کی طرح بہہ گیا۔’’واک کے لئے بھی نہیں آئی، مَیں پارک میں اُس کا انتظار کر رہا ہوں‘‘

’’شام سے موبائل آف ہے، بار بار کوشش کر رہی ہوں رابطے کی مگر۔۔۔‘‘ وہ پریشان تھی۔

’’اوہ! گھر کا نمبر ہے تمہارے پاس؟‘‘ پریشانی مجھے بھی گھیر چکی تھی۔

’’ہے تو سہی مگر۔۔۔‘‘ وہ ہچکچائی۔

’’مگر؟‘‘

’’مگر تم مت کرنا!‘‘ اُس کے لہجے میں تشویش اور ہچکچاہٹ یکجا ہو گئیں۔اُسے نہیں معلوم تھا، مَیں سب جانتا ہوں، وہ سب کچھ جو فضیلہ مجھ سے چھپانا چاہ رہی تھی اور وہ سب کچھ بھی جو ٹھگنی نے مجھے کبھی نہ بتایا۔

’’نمبر بولو!‘‘ میرے کرخت لہجے نے اُسے مجبور کر دیا، مَیں اُس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

اُس شام وہ ہُوا جو مَیں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔فون کا ریسیور اُس کی ماں نے اُٹھایا تھا، مجھے اپنا مکمل تعارف کرانے

کی نوبت نہیں آئی۔وہ خوب گرجی ’’مَیں پہلی اور آخری بار تمہیں کہہ رہی ہوں آئندہ کبھی اُس سے ملنے کی کوشش مت کرنا! آج اُس نے منگنی کی انگوٹھی پہن لی ہے اور۔۔۔‘‘

پتا نہیں اُس عورت نے کیا کچھ کہا ہو گا، مَیں نے کال منقطع کر دی تھی۔منگنی کی خبر سُن کر مجھے خوش ہونا چاہئے تھا یا۔۔۔؟ وہ منگنی کی انگوٹھی پہن کر خوش ہوئی ہو گی یا۔۔۔؟مَیں اُس رات اکیلا پارک میں بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔سگریٹ کے دھوئیں نے میرا چہرہ دُھندلا دیا تھا اور آنکھوں میں نمی حلق میں کڑواہٹ بھر جانے، بار بار کھانسنے سے آ گئی تھی، کوئی اور وجہ ہرگز نہیں تھی۔

ہماری آخری ملاقات بھی بہت عجیب تھی۔

’’کس کو ڈھونڈھ رہے ہو؟ کس کی تلاش ہے لمبے؟‘‘ اُس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔رات کے دس بجے شدید سردی، سنسان پارک میں ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تھے، اُسی جگہ جہاں ہم پہلی بار ملے تھے اور شاید آخری بار مِل رہے تھے۔

’’میں؟ تلاش؟‘‘

’’ہاں! تمہاری آنکھیں میرے چہرے میں کسی اور کی مشابہت ڈھونڈتی ہیں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟‘‘ اُس نے چاکلیٹ کا آخری پیکٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔میں چُپ رہا۔اُس کی اُنگلی میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔

’’میری قُربت میں تم کسی بچھڑے ہوئے کی رفاقت پا لیتے ہو، میرے رُوپ میں تم دوبارہ اُس کھوئے ہوئے چہرے کو دیکھ لیتے ہو۔میں سچ کہتی ہوں، معلوم ہے مجھے‘‘ اُس نے پورے اعتماد سے کہا۔میں کچھ دیر کے لئے چُپ رہ گیا۔

’’آج جھوٹ مت بولنا!‘‘ اُس نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں بنچ پر رکھ کر دباؤ ڈالا۔وہ انگوٹھی کے بغیر خالی اُنگلیاں مجھے دکھانا چاہتی تھی؟

’’میں اُسے بھلا نہیں پایا، باوجود کوشش کے بھلا نہیں پایا‘‘مَیں نے اعتراف کیا۔میری بات سُن کر اُسے حیرت نہیں ہوئی جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو۔

’’پہلی بار ہم یہیں ملے تھے، اسی پارک میں۔اسی موسم، انہی دنوں میں۔اسی بنچ پر بیٹھا کرتے تھے جہاں اب ہم دونوں بیٹھے ہیں۔بہت اچھے دن گزارے، اُس نے میرے ساتھ بہت سے وعدے کئے‘‘

’’پورے کئے؟‘‘

’’نہیں! اُس نے وعدہ کیا تھا میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی، وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہی‘‘

’’شاید مجبور ہو گئی ہو، شاید وہ بھی اسی طرح یاد کرتی ہو‘‘

’’ہونہہ! مجبور!‘‘ میں طنزیہ ہنسی ہنسا۔’’وہ اب تک بھول چکی ہو گی کہ کسی نے ایک بار اُس سے نیلی ساڑھی کی فرمائش کی تھی اور اُس نے وعدہ کیا تھا۔۔رخصتی پر پہنوں گی۔‘‘

’’شاید اُسے یاد ہو، شاید وہ تمہاری یاد میں ہر روز نیلی ساڑھی پہنتی ہو‘‘

’’نہیں! اُسے کچھ یاد نہیں ہوگا! پارک میں اکیلا پھرنے والا ایک شخص نہ اُس سے کئے ہوئے جھوٹے وعدے‘‘

’’شاید وہ بھی اب اکیلی پارک میں پھرتی ہو، اتنے بدگماں کیوں ہو تم؟

’’نہیں! وہ جھوٹ بولتی تھی! مَیں جانتا ہوں وہ مجھے یاد نہیں کرتی ہوگی‘‘ مَیں نجانے کیوں تلخ ہوگیا۔

’’جھوٹ؟ تو پھر اُسے بھول کیوں نہیں جاتے؟ اُس کی یاد کیوں ستاتی ہے تمہیں؟‘‘

میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

’’تم نے کیسے جانا میں کسی کی یاد میں ۔۔۔کسی کی تلاش میں ۔۔۔؟‘‘

وہ بے ساختہ ہنسی، جیسے میں نے کوئی بچگانہ سوال پوچھ لیا ہو ’’میں جانتی ہوں، تمہارا دُکھ جانتی ہوں لمبے!‘‘

’’پہلے روز سے جانتی ہوں، جب تم سے پہلی بار ملی تھی اُسی دن سے‘‘ میں نے چاکلیٹ کا پیکٹ نہیں کھولا، جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔

’’مجھے اچھا لگا کسی کو کھو کر بھی تم نے اُسے کھویا نہیں۔ اُس کی یاد سے اُنگلی نہیں چھڑائی۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں‘‘ میں نے پہلی بار اُس کے سامنے سگریٹ سلگا کر لبوں سے لگایا، اُس نے مجھے روکا نہیں۔

’’ایک بات کہوں لمبے؟‘‘ اُس نے عجیب لہجے میں کہا، میں چونک پڑا۔

’’کہو ٹھگنی!‘‘

’’میں نے بہت کوشش کی اُس روپ میں ڈھل جاؤں جو تمہیں پسند ہے، وہی صورت بن جاؤں جسے تم ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ اپنا رُوپ بھی گنوا دیا اسی کوشش میں مگر۔۔۔نہیں! لمبے! میں ویسی نہیں بن سکی‘‘ وہ مایوس تھی مگر میں نے غور سے دیکھا وہ بالکل اُسی رُوپ میں ڈھل چکی تھی جس کی مجھے تلاش تھی، ہُو بہو ویسی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

’’پتا نہیں کیوں مجھے تمہارا اُترا ہوا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں، بہت خوش!‘‘

میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

’’کاش! میں تمہیں خوش رکھ سکتی! کاش! یہ میرے بس میں ہوتا!‘‘ اُس نے حسرت سے کہا۔ ’’محبت کا یہ روگ عجیب نہیں لمبے؟ تم اُسے ڈھونڈ رہے ہو جو تمہیں کبھی نہیں ملے گا‘‘

میں نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں کیوں اُسے بتاتا کہ میں بھی پہلے روز جان گیا تھا کہ کسی بچھڑ جانے والے کا روگ تمہیں بھی چین لینے نہیں دیتا۔ کسی جھوٹے وعدے کرنے والے کی یاد ٹھگنی لڑکی کو بھی رات دن ستاتی ہے۔ تمہاری ہنسی کے پیچھے جو کرب ہے، مجھ سے چُھپ نہیں سکا۔ تمہارا دُکھ میں بھی پہلی ملاقات میں جان گیا تھا۔ ہم دونوں تو اپنی اپنی ٹرین چھوٹ جانے والے دو مسافروں کی طرح تھے جو مسافر خانے میں ملے، دونوں کا دُکھ مشترک تھا۔

’’لمبے! کل سے میں اکیڈمی نہیں آؤں گی، لاؤ آدھا چاکلیٹ!‘‘ اُس نے اتنی تلخ بات کو ہنسی خوشی میں اُڑانا چاہا مگر سگریٹ کا کش میرا حلق کڑوا کر چکا تھا۔

’’واک بھی نہیں! تمہیں چاکلیٹ کھلا کھلا کر کباڑا ہوگیا میرا، یہ خرچہ تو بچے گا‘‘ وہ پھر ہنسی جیسے میں بھی اُس کے ساتھ ہنس دُوں گا۔

’’فون بھی نہیں کروں گی! پتا ہے کتنے ہزار اُجاڑ چکی ہوں لمبے!‘‘ وہ خوشدلی کا مظاہرہ کرنا چاہ رہی تھی۔ سگریٹ کے طویل کش لیتے ہوئے میں نے اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں فون پر اُس کی ماں سے گفتگو کر چکا ہوں۔

پارک کے دروازے پر کھڑے ہو کر اُس نے کہا ’’میں تھک گئی ہوں! بہت تھک گئی ہوں!‘‘

میں کہہ نہیں سکا ’’میں بھی! اتنا زیادہ کہ اب ایک قدم بھی چل نہیں سکتا‘‘

’’بہروپ بھرتے بھرتے تھک گئی ہوں، دن رات کی اداکاری نے نڈھال کر دیا ہے مجھے۔ آئی ایم ساری لمبے! تم بہت اچھے ہو!‘‘ وہ کار کی طرف بڑھی تو میں نے زیرلب کہا ’’تم بہت اچھی ہو ٹھگنی!‘‘

اور جب اُس نے گاڑی سٹارٹ کر کے کھڑکی میں سے الوداعی ہاتھ ہلا کر کہا ’’میں ہر روز دُعا کروں گی وہ تمہیں مل جائے، مایوس نہیں ہونا لمبے!‘‘

تو میں نے آہستہ سے کہا ’’ مَیں بھی تمہارے لئے دُعا کروں گا مگر اب یہ شہر چھوڑ دوں گا ٹھگنی!‘‘

مجھے یقین ہے میری بات اُس نے نہیں سنی ہوگی۔

مجھے یہ بھی یقین ہے وہ ہر روز میرے لئے دُعا کرتی رہی ہوگی مگر میں یہ شہر نہیں چھوڑ سکا جس نے مجھے ہجر و وصال کی لذت سے آشنا کیا۔

وہ دوبارہ کبھی اکیڈمی کے گیٹ سے داخل نہیں ہوئی، پارک نہیں آئی۔ میں رات رات بھر جاگنگ ٹریک پر سگریٹ پھونکتا اور جُوں کی طرح رینگتا رہا۔ موبائل کی گھنٹی کبھی اُس سرشاری سے دوبارہ نہیں بجی، اُس کا پیغام کبھی موصول نہیں ہوا ’’لمبے! بارش! بہت ڈر لگ رہا ہے‘‘

میری بائیک کا رُخ دوبارہ کبھی اکیڈمی کی طرف نہیں ہُوا۔ مَیں نے وہ رستہ ہی چھوڑ دیا جہاں گیٹ پر کھڑی وہ میری منتظر ہوتی تھی۔ موبائل نمبر تبدیل کر لیا جس پر دن رات اُس کے پیغام موصول ہوتے، اُس سے لمبی لمبی گفتگو ہوتی تھی۔ مجھے اُس سے محبت نہیں تھی مگر یہ حقیقت ہے مَیں اُس کا عادی ہوگیا تھا۔ اُسے دِل و دماغ سے نکالنے کے لئے ایک مدت درکار تھی اور مَیں یہ شعوری کوشش کر رہا تھا۔

بہت دنوں بعد فضیلہ ایک شام پارک کے بنچ پر میرے پاس آ بیٹھی۔ میں اُسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

’’اُسے چُپ لگ گئی ہے سرمد!‘‘ اُس نے کہا۔ مجھے لگا فضیلہ کہے گی کہ وہ مجھ سے رابطے توڑ کر بہت اُداس ہے مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔

’’تم سمجھتے ہو اُس سے دُور رہ کر اُسے بھلا دو گے، وہ بیوقوف بھی یہی سمجھتی ہے‘‘ مجھے فضیلہ کی بات سے اُلجھن ہو رہی تھی، وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس لڑکی سے میرا تعلق اتنا گہرا نہیں تھا کہ مَیں اُس کی جدائی برداشت نہ کر سکتا۔ ہم اتفاقاً ملے تھے، چند دن اکٹھے گزرے، چند شامیں ایک ساتھ! اِس سے زیادہ تو کچھ نہیں تھا۔

’’وہ ویسی نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے، اپنا دُکھ تو کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں، شاید تمہیں بھی نہیں۔ میرا خیال تھا تم اُسے سمجھ

گئے ہو مگر نہیں! تم بھی اُسے سمجھ نہیں پائے۔'' فضیلہ پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کیوں تمہید باندھ رہی تھی؟

''عجیب چُپ لگ گئی ہے، آخری بار ملے تو کیا کہا تھا اُسے؟'' اُس نے پوچھا۔

مَیں سوچتا رہا کیا کہا تھا مَیں نے؟ آخری ملاقات مَیں ایسا کیا کہہ دیا جو اُسے عجیب سی چُپ لگ گئی تھی۔

فضیلہ کچھ دیر میرے جواب کی منتظر رہی پھر اُس نے چاکلیٹی رنگ کا ایک شادی کارڈ میری گود میں رکھ دیا اور چُپ چاپ لوٹ گئی۔ وہ درد جسے سلانے کے لئے میں رات رات بھر جاگا میرے سینے میں شدت سے جاگ اُٹھا۔ میں تو اُسے بُھلا دینے کی کوشش میں تھا یہ کیا ہُوا؟ چنگاری پھر سے کیوں سُلگ اُٹھی؟ سینہ کیوں بجنے لگا؟

پھر مہندی کی رات فضیلہ کا فون آیا ''اُس کی الماری میں نئے سال کا ایک کارڈ رکھا ہے سرمد!''

ڈھولک کی آواز سنائی دے رہی تھی، لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا، میں بھی تو دراز کھولے بیٹھا تھا۔

''لمبے! نیا سال مبارک۔ اس دُعا کے ساتھ کہ تمہاری ساری دُعائیں ہمیشہ قبول ہوں۔ ٹُھگنی!'' فضیلہ نے کارڈ پر لکھی عبارت پڑھی۔

''یہ لمبا کون ہوسکتا ہے سرمد؟'' اُس نے پوچھا مگر میں کیا بتاتا میں تو اُس وقت دراز میں رکھا نئے سال کا ایک پرانا کارڈ نکال کر پھاڑ رہا تھا۔ یہ کسی لمبے کی طرف سے ایک ٹُھگنی کے لئے تھا جس کو ہمیشہ خوش رہنے کی دُعا دی گئی تھی۔

''میرا خیال ہے آج اس کارڈ کو جلا دینا چاہئے، کل اس کمرے کا سارا سامان دُلہن کے ساتھ رُخصت ہو جائے گا۔'' فضیلہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

''بہت رنگ آیا ہے ہتھیلی پر، خوب سجی ہے مہندی۔ دیکھو گے نہیں؟''

مجھے نہیں معلوم مہندی سجی ہتھیلی والی اُس وقت فضیلہ کے پاس موجود تھی یا نہیں۔

''آؤ گے اُس سے ملنے؟ آخری بار؟'' فضیلہ نے پوچھا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

''نہیں!'' بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ایک سسکی سنائی دی، جیسے ضبط کا بند ٹوٹ گیا ہو، وہ فضیلہ کی سسکی نہیں تھی۔ فون بند ہو گیا۔ ڈھولک کی آواز بھی بند ہو گئی، مجھے لگا میرا سانس بھی بند ہو جائے گا۔

مجھے یاد آ رہا ہے آخری ملاقات میں مَیں نے کہا تھا ''ٹُھگنی! نئے گھر میں جا لے ہوئے تو؟'' وہ میری بات سُن کر دیر تک چُپ رہی تھی۔

فضیلہ نے بتایا رخصتی کے وقت وہ روئی نہیں، ہنستی ہوئی کار میں بیٹھ گئی اور صرف اتنا کہا ''لمبے! اب میں یہ شہر چھوڑ جاؤں گی!''

اُس نے نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

☆☆☆

مجید امجد

اپنی آنکھ پہ۔۔۔

اپنی آنکھ پہ پٹی باندھ کے دیکھو،
اپنی اوٹ سے اپنے آپ کو دیکھو،
اندھیارے میں سوچو،
کس کے ٹھنڈے، مشفق، حکمت والے ہاتھ تھے،
جن میں رُٹھنڈی، تیز، کٹیلی، دھارتھی دُکھ کی،
چِرتی جلد سے گرتی، انگارہ سی بوندیں،
یہ اک، سانس تو شاید۔۔۔
اس اک رُکتی رستی سانس کے بعد تو شاید
میلی گیلی کافوری مٹی کا بچھونا۔۔۔
اسی بچھونے سے میں اُٹھا،
سدا جئیں وہ ٹھنڈے ہاتھ، جنھوں نے پٹی باندھی،
اب آنکھوں پر پٹی باندھ کے دیکھا،
یہ دنیا کتنی اچھی ہے،

تنہا بیٹھ کے سوچا،
اس اک اِتنی اچھی دنیا میں بھی
کون اِدھر کو میری جانب دیکھے گا
جب تک میری آنکھوں پر پٹّی ہے!

نصرت ظہیر (دہلی)

روتی ہوئی تنہائی

تم بھی نہیں ہو
میں بھی نہیں ہوں
کوئی نہیں ہے
پھر یہ آنسو
پھر یہ آہیں
پھر یہ سسکنے کی آوازیں
یہ سب کیا ہے
کس کی طرف سے
کس کے لئے ہے
کون اس کمرے میں رہتا ہے!

نصرت ظہیر

خود گرفتہ

یہ مجھ میں کون رہتا ہے
جو مجھ سے روز کہتا ہے
کہ تم کو یہ نہیں کرنا
کہ تم کو وہ نہیں کرنا
تمھیں اِس سمت جانا ہے
تمھیں اُس سمت آنا ہے
تمھاری منزلیں یہ ہیں
تمھارے راستے یہ ہیں

یہ مجھ میں کون ہے
جو میری آنکھوں سے مجھے ہی دیکھتا ہے
میرے کانوں سے مجھے سنتا ہے
میرے نطق سے
ہردم مجھے آواز دیتا ہے
جو میری سوچ بن کر
میرے بارے میں
مرے سب فیصلے کرتا ہے
اور ہر فیصلے کو مجھ سے ہی نافذ کراتا ہے

یہ مجھ میں کون آ بیٹھا ہے
جو مجھ کو دکھائی تک نہیں دیتا
جسے چھو بھی نہیں سکتا
مگر میں اُس کے آگے
عہدِ رفتہ کے غلاموں کی طرح
سر کو جھکائے بیٹھا رہتا ہوں
جو وہ کہتا ہے کہتا ہوں
جو وہ کہتا ہے سنتا ہوں
جو وہ کہتا ہے بس وہ دیکھتا ہوں
ورنہ آنکھیں بند رکھتا ہوں

یہ مجھ میں کون ہے
جو مجھ پہ قابض ہے
جو مجھ کو مجھ سے ہی بے دخل رکھتا ہے
مجھے کچھ بھی مری مرضی سے اب کرنے نہیں دیتا
مجھے جینے نہیں دیتا مجھے مرنے نہیں دیتا

یہ مجھ میں کون رہتا ہے
جسے میں پا نہیں سکتا
کبھی اپنا نہیں سکتا
جسے میں چھوڑ کر بھی جا نہیں سکتا
یہ مجھ میں کون رہتا ہے؟

عبداللہ جاوید (ٹورانٹو،کینیڈا)

لفظ

جب یہاں کچھ نہ تھا
جب وہاں کچھ نہ تھا
یہ جہاں کچھ نہ تھا
وہ جہاں کچھ نہ تھا
کہکشانوں کا یہ کارواں کچھ نہ تھا
جب زمیں کچھ نہ تھی
جب زماں کچھ نہ تھا
اور
وجودِ زماں و مکاں کچھ نہ تھا
نہ ازل نہ ابد
اک نہ ہونا تھا
پھیلا ہوا
چار سو
پھر جو، ہونا ہوا
سارے ہونے سے پہلے
بس اک "لفظ" تھا
"لفظ" تھا
آپ کا

ہُو ۔۔

عبداللہ جاوید

وقت کی، وجود کی
زیست کی، نمود کی
بود اور نبود کی
ابتداء
صدائے کن
انتہا
صدائے صُور
ارتعاشِ موجِ نور۔۔!
وقت کیا۔۔؟۔۔ہوا ہوا
زیست کیا۔۔۔ہَوا ہَوا
سانس کیا۔۔ہوا ہوا
ابتداء کی ابتداء۔۔!
انتہا کی انتہا۔۔!
ایک "ہُو"۔۔!!

نیّر جہاں (امریکہ)

پیپل سے میپل تک

میں سوچتی ہوں، تمہیں بتا دوں
جو اوڑھنی تم نے مجھ کو دی تھی
وہ پہلی بارش بھی سہہ نہ پائی
سو کچے رنگوں کے درد انگیز
نقش دل پر بنے ہوئے ہیں
وہ تتلیاں جو محبتوں کی علامتیں تھیں
وہ جن کو تم نے پکڑ کے مجھ کو تھما دیا تھا
ابھی تلک انگلیوں پہ میری
پَروں کی رنگت کا دُکھ لگا ہے

کبھی دبے پاؤں پیچھے سے آ کے
آنکھوں پہ ہاتھ رکھنا
کبھی اکیلے میں ''ہاؤ'' کہہ کر مجھے ڈرانا
ابھی بھی دیوارِ دل پہ یادوں کے
زخم سارے سجے ہوئے ہیں
میں سوچتی ہوں کہ پھر بھی تم کو بتا ہی ڈالوں
گلاب کی خوشبوؤں سے مہکی، وہ ساری باتیں
وہ جگنوؤں کی طرح چمکتی، تمام راتیں
صبا کے جھونکوں سے ملتا جلتا لطیف لہجہ
تمہارا لہجہ
ہمارا لہجہ
جو موسمی تھا
خمار سب کا اتر چکا ہے

میں سوچتی ہوں، تمہیں بتا دوں
سو تم کو میپل کے زرد پتّے پہ لکھ رہی ہوں
کہ دل کا موسم بدل چکا ہوں!!

نیّر جہاں

WORRY DOLL

*

کوئی شریکِ درد نہ پا کر
اور تنہائی سے گھبرا کر
اپنی چھوٹی سی بچی کو
میں نے اک شب پاس بلایا
اور بتایا۔۔۔۔۔

''چھٹی میں نے زیادہ لے لی
تنخواہ اب کے بھی کم ہوگی
گھر کا کرایہ
دودھ کے پیسے
بجلی کا بل
فیس تمہاری
جانے یہ سب کیسے ہوگا؟''

چھوٹا سا معصوم سا چہرہ
سخت پریشاں، سوچ میں ڈوبا
آنکھ میں فکر کے بادل چھائے
ننھے سے ماتھے پر بَل تھے
دھیمے لہجے میں وہ بولی
''اب کیا ہوگا؟۔۔۔اب کیا ہوگا؟۔۔''

کتنے خدشے، کتنی فکریں
اس جملے میں جاگ رہی تھیں
اُس سے میں نے اُس کا بچپن
بے فکری کے خواب سہانے
سب کچھ اک لمحے میں چھینا۔۔۔

اُن لمحوں کو بیتے اب تو صدیاں بیتیں
پھر بھی اب تک
میری بچی کے چہرے کی
اک اک سلوٹ
دنیا سے پوچھا کرتی ہے
''اب کیا ہوگا۔۔۔؟''
''اب کیا ہوگا۔۔۔؟''

---

* وسطی امریکہ کے کئی ملکوں میں دھاگے اور تاروں سے ننھی ننھی، چھوٹی چھوٹی گڑیاں بنائی جاتی ہیں، جن کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا یہ عام یقین ہے کہ روز رات کو سونے سے پہلے اپنے تمام دُکھ اگر اُن کو سنا دیئے جائیں تو صبح تک گڑیاں اپنے اوپر سب دکھ لے لیتی ہیں اور اس طرح سارے دکھوں سے نجات مل جاتی ہے۔

خاور اعجاز (ملتان)

تجھے کیا ہماری ضرورت نہیں

کہانی !
کہاں سے کہاں تُو مجھے لے کے پھِرتی رہی
باغِ جنّت کی رُخصت سے آغاز ہوتی ہے
پانی پہ بہتی ہُوئی ایک کشتی کے ہمراہ چلتی ہے
بازارِ مصر اور سِینا کے صحرا سے ہوتی ہُوئی
شہرِ مکہ میں کچھ دن ٹھہرتی ہے
اور پھِر مدینہ کی سمت آ نِکلتی ہے
تیرے مآخذ
پُرانے صحیفوں کے دریاؤں سے پھُوٹتے ہیں
ہزاروں برس کا سفر کر کے آئی ہے تُو
بھیدِ تخلیق کے اپنے الفاظ میں باندھ لائی ہے تُو
کس طرح زِندگی کو بسر کرنا ہے
یہ بتایا مجھے
ضابطے اور قانونِ اخلاق و برتاؤ کے
سب سِکھائے مجھے
خانہء دِل بھی کافی تھا
لیکن کہا
اپنے رَب کی عبادات کے واسطے گھر بنا

مَیں نے تعمیل کی
گھر کی بنیاد رکھی
ہر اِک اینٹ کے درمیاں میں تِری یاد رکھی
مگر اے کہانی !
مِرا ذکر ہی
داستانِ محبت میں معدوم ہونے لگا ہے
یہ معلوم ہونے لگا ہے
خود اپنے ہی گھر میں ٹھہرنے کی صورت نہیں اَب
تجھے کیا ہماری ضرورت نہیں اَب!؟

خاور اعجاز

خدشہ

کہانی !
کتابوں میں
اور آسمانی صحائف میں / توراتِ وانجیل میں
اُس سے پہلے بھی
تُو زندگی کے مقدس ترانے سناتی رہی ہے
مِرے لب پہ آتی رہی ہے / تمنّا کی صورت
مِرے دِل کی کلیاں کھِلاتی رہی ہے
تجھے مَیں ہمیشہ سے پڑھتا رہا ہُوں
تِری روشنی کے اِشارے پہ چلتا رہا ہُوں

کہانی !
ترے پنجگانہ صحائف
نئے روپ میں جگمگاتے رہے ہیں
سبق ابتداء پھر ہُوا پانچ آیات سے
پانچ وقتوں میں مَیں
تیرے اسرار کے در پہ آتا ہُوں
جھولی اُٹھاتا ہُوں
اکثر یونہی لوٹ جاتا ہُوں
ڈرتا ہُوں / مایوس ہو کر
مِری آرزو مختلف ہو نہ جائے
کہیں تُو کسی اور پر
منکشف ہو نہ جائے !

عبدالاحد ساز (ممبئی)

بے نشاں ہونے سے پہلے

زندگی اک دور تک سنگیت تھی، اب شور ہے
ہاں مگر اس شور کے بکھراؤ میں
بے محابا صوت کے ٹکراؤ میں
شاید ابھی اندوختہ کچھ زیروبم ہوں
آؤ ہم تم کوئی زیروبم تلاشیں
کوئی پیچ وخم تراشیں
اور اس ترتیب کاری کی شعوری کوششوں کو
لاشعوری نغمگی کی آخری مٹتی ہوئی سی گونج سے انگیز کر
کے، ایک شب
کوئی سا آہنگ دے دیں
اس سے پہلے کہ یہ شورِ ناتمام
صورِ اسرافیل کے اتمام میں کھو جائے
حشر اٹھے اور قیامت آئے اور ہم کو جھونک دے
آواز کے اک منقطع رشتے کے دوزخ میں
فیصلہ کر دے ہمارے درمیاں
اک دائمی خودناشناسی کے جہنم کا
۔۔۔اس سے پہلے
آؤ ہم تم
اس خلیج نارسائی پر صدا کے پُل بنا دیں
بے نشاں ہونے سے پہلے
اس زمیں پر آخری پہچان کی دنیا بسا لیں !

عبدالاحد ساز

آخری دور کے انساں

حشر بپا ہے
دور تلک پھیلے میداں میں
گرمی، شور، تذبذب، وحشت، ہنگامہ سا جاری ہے
ہر اک دور کے لوگوں کے
لاکھوں گروہ استادہ ہیں
اپنے چہروں پر لئے
اپنے اپنے دور کے ان گنت نقوش
سہمی، سہمی آنکھوں میں
ایک تجسس / سانسیں تیز
دل میں اندیشوں کا ہر دم پیچ وتاب
ہر جنبش میں اضطراب
بے چینی اور انتشار کا عالم ہے

دور مگر
حشر کے دور تلک پھیلے میداں کی آخری صف میں
حال عجب ہے / کوئی شور، نہ کچھ ہیجان
کوئی کشاکش ہے نہ ہراس / نفسا نفسی، نہ بے چینی
رُکی ہوئی مشینوں کی سی خاموشی ہے!
انسانوں کے گروہ کھڑے ہیں
ایسے، گویا دھرے ہوئے ہیں
بے حس، ساکت اور جامد / چہرے بے اظہار، سپاٹ
آہنی پیکر، میکانیکی حلیئے
بند کھلی پلکیں۔۔آف اور آن سوئچ
کان کے پردے۔۔مقناطیسی ڈرم
نتھنے گیسوں کے دو پائپ
جن سے آکسیجن اندر جایا کرتی تھی
ہونٹ کہ جیسے ٹیپ ریکارڈر کے اسپیکر
چکنی زبانیں جیسے فوم ربر
تہہ لعاب کے گریس کی جن پر چڑھی ہوئی ہے
بال کہ جیسے وائر کے گچھے
ہاتھوں کی دس انگلیاں، بجلی کے کنڈکٹر
دل کی جگہ پاور کنٹرول
سُرخ تیل کی سپلائی کے مرکز
اور دماغی خلیئے / کمپیوٹر کے خانوں جیسے
جن میں اعصاب کی برقی حرکت سے
مبہم نقش منقش ہوتے رہتے تھے!
ہر اک کے ہاتھوں کے انگوٹھوں کے ناخن کی پن میں
پھنسا ہوا ہے اک سادہ سا کاغذ
اعمال کا کورا صفحہ / دونوں کالم خالی
کوئی گنہ نہ کوئی ثواب!
نیچے کراماً کاتبین نے بس اتنا سا لکھا ہے:

(کوئی عمل تحریر کے قابل تھا ہی نہیں
لکھنے کا کچھ کام نہیں ہوتا تھا
ہم اِن لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اُکتایا کرتے تھے
ہم اِن لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اُکتایا کرتے تھے)

حمیدہ معین رضوی (لندن)

وفائے رائیگاں

زیست کا سنگِ گراں یا وقت کا کوہِ گراں
ان کو شانوں پہ اٹھائے
دکھ بھری ویران وادی میں رواں
دیکھتی ہوں ہر طرف، موت کا پھیلا سکوت، بیکراں
کیا میں تنہا ہوں یہاں؟
یا اور کوئی ہے یہاں، میری سرگوشی ہے گنبد کی صدا،
ربِ مشرق اور مغرب!
تجھ سے کرتی ہوں دعا بھیج اپنا ہمنوا،
لگتا ہے صدیوں سے بیٹھی ہوں
اکیلی چوٹیوں پہ نوحہ خواں،
دیکھنے کو۔۔۔ ابنِ آدم کارواں در کارواں
مسخ چہروں کے یہ انساں،
چھین کر آواز بھی تو لے گئے، قتل یہ الفاظ کو بھی کر گئے
ہیں عجب عفریت، گونگے اور بہرے بے نشاں
آنکھیں رکھتے ہیں، مگر اصلی بصارت کھو گئی،
اہلیت حق سننے کی بھی انکی رخصت ہو گئی
ہر عمل اپنا مگر لگتا ہے انکو خوش نما، چاہے ہو وہ بدنما،
خواہشوں کو پوجتے ہیں یہ ہی ہیں انکے الٰہ
دل منافق جب ہوئے انساں وہ پتھر ہو گئے
چھن گئی انسانیت، خصلت میں بندر ہو گئے
سوچتی ہوں میں غلط رستے پہ ہوں کیا؟
کاٹتی ہے دل کو جس کے آگہی کی اک سناں
یا یہ سارے بے ضمیر ہنستے گاتے کارواں در کارواں
میں اکیلی سوچتی ہوں،
ننگے پاؤں یہ مسافت کب تلک؟۔۔۔
اور مسلسل زخمی کرتی یہ جراحت کب تلک؟
خستہ جانی اور جنوں کی یہ حکایت کب تلک؟
اک وفائے رائیگاں
اور ہونٹوں پر جمی اک بددعا
"جس کو اللہ نے نہیں دی روشنی،
اس کو مل سکتی نہیں ہے روشنی" القرآن سورہ نور
منتظر ہوں
"کن" کی اک آواز آنی ہے ضرور
ریزہ ریزہ ہو کے رہ جائے گا جس سے
ظلم کا سنگِ گراں۔ وقت کا کوہِ گراں،
عسرِ یسراً عسرِ یسراً
ماورا سے
آتی رہتی ہے صدا!

اشہر ہاشمی (دہلی)

ہوا کا کام ہے چلنا

ہوا چلتی ہی رہتی ہے
ہوا بالکل نہیں تھکتی
ہوا بالکل نہیں تھمتی

ہوا کی چال میں تبدیلی ہوتی ہے
کبھی آندھی
کبھی طوفاں
یہی ولوں کو بھی شانوں پہ لادے رقص کرتی ہے
کبھی بارش کی شدت تیز کرتی ہے
یہی بادِ نسیم صبح بھی لہلاتی کے اور بادِ صرصر بھی
مگر چلتی ہی رہتی ہے
کبھی تھکتی نہیں ہے یہ
ہوا کا کام ہے چلنا، مچلنا
ہوا شکوہ نہیں کرتی
ہوا تو چلتی رہتی ہے
ہوا بالکل نہیں تھمتی
ہوا بالکل نہیں تھکتی

ہوا کی ہر فضیلت اور فطرت
مجھ پہ ظاہر ہے
ہوا کا میں بھی شیدائی ہوں
اس کے موڈ سے واقف، ادا سے آشنا ہوں میں
تمہیں بھی علم ہو گا کہ
ہوا ہی فروری کے وسط میں
پھاگن کے حیلے سے بدن کو گدگداتی ہے
اسے احساس دیتی ہے
نئی فرحت کا
لیکن تم ہوا کی اس فضیلت سے
ابھی تک جانے کیوں انکار کرتی ہو
مگر مجھ سے ہوا کی طرح
چلتے رہنے اور شکوہ نہ کرنے کے لئے
اصرار کرتی ہو!

اشہر ہاشمی

برسوں بعد اچانک

پہلے سے کچھ اور زیادہ
گہری بھی شفاف بھی تھیں
اس کی ساکت، جھیل سی آنکھیں

پہلے سے کچھ اور زیادہ
گویا بھی، خاموش بھی تھیں
اس کی باتیں کرتی آنکھیں

پہلے سے کچھ اور زیادہ
ششدر بھی حیران بھی تھیں
اس کی خود میں کھوئی آنکھیں

پہلے سے کچھ زیادہ
گیلی بھی، پُرشور بھی تھیں
اس کی مگر صم، تیکھی آنکھیں

برسوں بعد اسے جب دیکھا
یہ محسوس ہوا کہ وہ تو
جیسی تھی، اب بھی ویسی ہے

کم لفظوں میں باتیں کرنا
آنکھیں ہر قدم نیچی رکھنا
استفسار سے بچ کر رہنا
خاموشی سے رخصت ہونا

جیسے کچھ بھی کہیں نہیں تھا
جیسے کچھ بھی کہیں نہیں ہے!

پھر یہ برسوں بعد اچانک؟

طاہر عدیم (جرمنی)

کُھل نہ پایا حال

ہجر کے تپتے صحرا میں جب
اوڑھی بھٹکے لمحوں نے
خوشیوں کے ریشم سے سلجھی / وصل اُگاتی شال
صدیوں سے رگ رگ میں اُلجھے
ٹوٹے سب جنجال
کٹتا چہرہ، پھٹتی آنکھیں، / ہجر زدہ سے گال
اپنے باپ کو ملنے جب وہ
پار سمندر سے آیا تھا
کالے کر کے بال
کُھل نہ پایا حال
باپ کے چہرے پر تھی رقصاں
خوشیوں کی ہر تال
(جھکی جھکی سی چال)
لیکن آنکھوں میں پھیلا تھا
سوچوں کا اِک جال
کُھل نہ پایا حال
اپنی اپنی ''ایکٹنگ'' میں تھے
دونوں ہی پامال
دونوں ہی کے دوش دھرا تھا
ہجرت کا پاتال
کُھل نہ پایا حال۔۔۔!

احمد منظور (ممبئی)

گلاب خواہش

فضا میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں بھرا تھا
سبھی مناظر تھے خواب منظر
کہ جن کو دیکھیں تو جی میں آئے
کہ ہاتھ اپنے بڑھا کے چھو لیں
مگر بڑھے جب بھی ہاتھ میرے تو میں نے دیکھا کہ خواب منظر
مری پہونچ سے ہیں دور اتنے کہ جتنا دھرتی سے آسماں ہے
گمان گذرا یہ خواب پیہم عذاب شاید کبھی نہ ٹوٹے
مگر تبھی اس زمیں کے سینے میں نرم خواہش نے سر ابھارا
گلاب مہکے، اے کاش کوئی گلاب مہکے
زمیں کے سینے کی نرم خواہش نے روپ دھارا
گلاب مہکا، شباب مہکا، شتاب مہکا،
فضا کا سارا دھواں، دھوئیں کی گھٹن، گھٹن کی تمام تر سازشوں کے پردوں کو چاک کر کے وہ نور نکلا
کہ جس نے دھرتی سے آسماں تک تمام مہتابیاں کھلا دیں

گلاب کانٹوں پہ کھل رہا تھا
مگر لبوں پر وہ موہنی مسکراہٹوں کی حسین پریاں سجا رہا تھا
گلاب مظہر روایتوں کا
گلاب گلشن کا پاسباں تھا
وہ راہبر تھا، وہ رہنما تھا
جواب بھی دنیا میں چلنے والی ہوا کی سانسوں میں گونجتا ہے
جواب بھی کھیتوں میں اگنے والی ہر ایک بالی سے جھانکتا ہے
یہ دیکھتا ہے کہ اب بھی گلشن فضا میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں بھرا ہے
میں سوچتا ہوں کہ کاش میری بھی خواہشیں روپ دھار سکتیں
تو میں بھی کہتا۔ گلاب مہکے، شباب مہکے، شتاب مہکے
اے کاش کوئی گلاب مہکے

احمد منظور

جھٹلا سکو گے؟؟؟

گذرتے جارہے ہیں
ہم اس چکنی پھسلتی رہگذر پر
کہ جس کے بائیں جانب
اُفُق کو چومتا، دھرتی بدن ڈھکتا، اجالوں کی طرح پھیلا
پہاڑوں کا عجب سا سلسلہ ہے
ہماری رہگذر کے دائیں جانب
ہرا جنگل درختوں سے اٹا ہے
اور اس جنگل سے ہو کر
کئی چھوٹی بڑی پگڈنڈیاں بستی کو جاتی ہیں
یہ وہ بستی ہے جس کا دل عبادت گاہ کے اونچے مناروں
میں دھڑکتا ہے
عبادت گاہ کے مینار و گنبد سے صدائیں آرہی ہیں
ارے نادان انسانو بتاؤ حشر کے دن
ندی، جنگل، گھروندے، ریت، چٹانیں،
ستارے، چاند، سیارے، ہوائیں، بارشیں، آکاش، دھرتی
تم اپنے رب کی کتنی نعمتیں جھٹلا سکو گے؟
ہم اپنے رب کی ساری نعمتوں کے معترف ہیں
مگر ہم ہیں کہ اپنے سر نفی سُر میں ہلاتے بڑھ رہے ہیں
اسی چکنی پھسلتی رہگذر پر پھسلتے جارہے ہیں
کہ جس کے دونوں لب پر
کروندے کی کنواری جھاڑیاں کثرت سے ملتی ہیں
کروندے کی کنواری جھاڑیوں کی آرزو ہے
کسی جانب سے کوئی شاہزادہ اپنے گھوڑے پر سوار
آئے
اور ان کے جسم سے کچے پھلوں کو توڑ کر چکھ لے
انہیں آسودگی دے
اگر چاہیں تو ہم وہ شاہزادے بن بھی سکتے ہیں
مگر ہم ہیں کہ اپنے سر نفی سُر میں ہلاتے بڑھ رہے ہیں
اسی چکنی پھسلتی رہگذر پر
گذرتے جارہے ہیں
ہماری پشت پر شاید کروندے کی کنواری جھاڑیوں کی
التجاؤں اور عبادت گاہ کے مینار و گنبد کی صداؤں نے
کوئی سازش رچی ہے
تعاقب میں ہمارے چل پڑی ہیں
ہمارے کان میں اک تیسری آواز آتی ہے
ارے نادان انسانو!
ہمیں آسودگی دو
بتاؤ حشر کے دن
ندی، جنگل، گھروندے، ریت، چٹانیں، ہمارا دھوپ
میں جلتا بدن
جھٹلا سکو گے؟
لا سکو گے؟؟

محمود شاہد (کڈپہ، آندھرا پردیش)

وطن

وطن کے معنی
نہ ڈھیر ساری زمیں کی مٹی
نہ سرحدوں کے / حصارِ سنگیں میں قید خطہ
نہ مذہبوں کی / عجیب دنیا میں گم علاقہ
نہ ہی سیاست کے / زہرِ قاتل کا مارا رقبہ
نہ خوں سے لکھا / شکست اور فتح کا ترانہ
نہ سر اٹھا کر / ہوا میں پھیلا بلند پرچم
وطن کے معنی
وجودِ آدم کا اک ٹھکانہ
زمیں کی عظمت کا راز انساں
مکاں کے دیوار و در کی زینت / مکیں سے قائم
گلی کی رونق / ہجومِ انساں کے دم سے باقی
دلوں کے رشتوں کا اک خزانہ
قدم قدم پر / صداقتوں کے چراغ روشن
نظر نظر میں / محبتوں کے گلاب منظر
کہیں عداوت نہ بیج بوئے
کہیں حقارت نہ سر اٹھائے
مقامِ تسکیں کا راحتوں کا
سکوں میسر ہو ہر نفس کو
کسی جگہ بھی / نہ خوف و دہشت کا شائبہ ہو
نہ بربریت کا دبدبہ ہو
نشان انصاف اور حق کا
سبھی کو حاصل سہولتیں ہوں
حقوقِ انساں کا مرتبہ ہو
نہ کوئی کم تر
نہ کوئی برتر
اماں کا محفوظ ایک خیمہ
کہ جس کے سائے میں جمع ہم سب
نہ کوچہ کوچہ فساد پھیلے / نہ قریہ قریہ ہو فتنہ پیدا
دیار، وحدت کا آشتی کا
مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹیں
کہ زلزلوں کا عذاب اترے
کہ آندھیوں کی بلا ہو نازل
کہ خشک سالی کا دور گزرے
غموں میں شامل رہیں سبھی کے
کہ ایک جیسے ہیں غم ہمارے
وطن کی صورت
کھلی فضا میں
اسی کشادہ زمیں پہ حدِ نظر ہو پھیلا
جہاں تمدن کی دلکشی ہو
جہاں ثقافت کی رونقیں ہوں
جہاں روایت کی روشنی ہو
جہاں بشر سے بشر کا رشتہ
قریب تر ہو
عمیق تر ہو
عظیم تر ہو

فیصل عظیم (امریکہ)

جشنِ آزادی

بھیگی آنکھیں لئے
مُٹھیاں بھینچتے
ہونٹ دانتوں تلے لے کے بیٹھے ہوئے
کچھ ٹہلتے ہوئے
اور سر دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے
بے پنہ مضطرب
اَن گنت رشتے داروں کی اک بھیڑ ہے
آنکھیں سوجی ہوئی، بال بکھرے ہوئے
دل جلے، سر پھٹے
چیتھڑوں سے بدن کو چھپاتے ہوئے،
کچھ تو زخمی بدن،
اور نظریں سبھی کی ایمرجنسی کی راہداری کے آخر میں
اُٹھتی ہوئی
آپریشن کے کمرے سے
ہر آتے جاتے کے چہرے کو، آنکھوں کو پڑھتی ہوئی
تھک گئی ہیں
مگر کوئی جاتا نہیں

بھیڑ ہے، اور بڑھتی ہوئی بھیڑ ہے
ہر معالج کے ماتھے کی بڑھتی شکن،
سرخ آنکھوں کو خوناب کرتی،
تھکن اوڑھے،
گہری ہوئی جاتی ہے
آتے جاتے ہوئے سارے جرّاح
دستانے پہنے ہوئے
خون کے چھینٹے سب سے چھپاتے ہوئے
آتے جاتے ہوئے
ایک جھوٹی تسلّی سی دے جاتے ہیں
بھیڑ بڑھتی ہوئی
اور بڑھتی ہوئی،
اتنے برسوں سے وہ سانس روکے ہوئے،
کتنی صدیوں کو خود میں سمیٹے ہوئے
نت نئے کچھ سوالوں میں ڈھل جاتی ہے
سوچتے سوچتے جاں نکل جاتی ہے۔۔۔

فیصل عظیم (امریکہ)

تخلیق

مزدور بچارا کیا جانے
وہ مسجد ہو یا مندر ہو
وہ جھونپڑی ہو یا کوٹھی ہو
یا وہ کوئی مے خانہ ہو
مزدور بچارا کیا جانے
کس کس کا آنا جانا ہو
اور کون بسیرا کر جائے!
اُس کوٹھی میں ویرانہ ہو
مسجد لوگوں سے بھر جائے
یا بسنے والوں کے ہاتھوں
خود ہی اک روز بکھر جائے
مزدور بچارا کیا جانے
اُس کے اطراف کی دنیا تو
ٹھیکیداروں کی دنیا ہے
کچھ دین کے ٹھیکیدار بھی ہیں
کچھ ٹھیکیدار ہیں ملت کے
کچھ لفظوں کے سوداگر ہیں
کچھ جذبوں کے رکھوالے ہیں
کچھ رکھوالے تاریخ کے ہیں
کچھ سوداگر توصیف کے ہیں
کچھ شعر کے ٹھیکیدار بھی ہیں
کچھ ٹھیکیدار معانی کے
کچھ ٹھیکیدار ہیں رتبوں کے
جو گویا سب سے برتر ہیں
کچھ صنفوں کے پیغمبر ہیں

اب اتنے ٹھیکیداروں میں
مزدور بچارا کیا جانے
وہ اینٹ جو اُس نے رکھی ہے
وہ کل کس کے کام آ جائے
بنیاد جو اُس نے رکھی ہے
اک عالی شان عمارت کی
اُس عالی شان عمارت میں
کل کون بسیرا کر جائے
مزدور تو پھر مزدور ہے جی
تعمیر ہے اُس کا کام سدا
اِن اینٹ کے ٹھیکیداروں کو
مزدور بچارا کیا جانے......!

فیصل عظیم

نظریۂ اِضافت

کبھی سمتوں کی باتوں سے
کبھی رفتار سے اپنی
کبھی ذرّے کی ہیئت سے
کبھی جسموں کی حرکت سے
جو ہم کچھ جان پائے ہیں
تو اتنا جان پائے ہیں
''یہ سب آنکھوں کا پردہ ہے
یہ سب نظروں کا دھوکہ ہے
کہ جتنے راز کھلتے ہیں
وہ پراسرار ہوتے ہیں''
اصولِ بے یقینی پر یہ اونچی اک عمارت ہے
جو دیکھا تھا اضافت تھا
جو جانا ہے اضافت ہے

پروین شیر (کینیڈا)

اب کہاں جاؤں گی؟

منہ اندھیرے، جو گھر سے نکلتی تھی میں
سارا دن جنگلوں میں بھٹکتی ہوئی
میرے پاؤں ٹپکتے ہوئے
آبلوں میں پروئے، تھکے ماندے چلتے ہی رہتے تھے
دن بھر جھلتی ہوئی دھوپ میں
دن ڈھلے گھر کی دہلیز پر/پاؤں رکھتی تھی، تو
ایسے لگتا تھا جیسے یہ اک دن نہ تھا/پورا اک سال تھا!
ٹوٹا پھوٹا ہوا میرا بوسیدہ گھر/میری جائے اماں
جس کی پارینہ دیواروں پر سر ٹکائے ہوئے
چین کا سانس لیتی تھی تو
سارے دن کی تھکن بھول جاتی تھی میں
آج جب پو پھٹے/گھر سے نکلی انہیں جنگلوں کی طرف
راستے میں ہوا نے، درختوں نے اور طائروں نے
بتایا مجھے/میری جائے اماں
سخت موسم کے جوکھم میں میرا سہارا، وہ پارینہ گھر
ڈھے گیا/شام ڈھلنے کو ہے/رات کی دل شکن تیرگی
تلخ، سنگیں حقائق کا زہرِ ہلاہل لیے
میری جانب کسی افعی کی طرح
آ رہی ہے لگاتار بڑھتی ہوئی
بے اماں میں اکیلی کھڑی دشت میں
سوچتی ہوں کہ اب/ننگے سر، ننگے پاؤں کہاں جاؤں گی

ارشد خالد (اسلام آباد)

دیکھ سمندر!

دیکھ سمندر
تیرے اندر
کتنے دریا بہتے ہیں
کتنی خلقت رہتی تجھ میں
دیکھ سمندر
میں نے مانا
اتنے خزانے تیری تہہ کے اندر ہیں
جو گنتی سے بھی باہر ہیں
دیکھ سمندر!
میرا دل بھی ایک خزانہ
ایک سمندر
تجھ سے بڑا سمندر ہے
دیکھ سمندر
میرا رب بھی-----
میرے دل کے اندر ہے

ارشد خالد

زادِ سفر

ذرا ٹھہرو
اے مرے ہمراہی ٹھہرو
کہ میں اپنا زادِ سفر ساتھ لے لوں
وہ کمرے میں خوشبو کی مانند پھیلا
میری ماں کا بوسہ جو بچپن میں اس نے
سحر کے دلآویز اجلے اجالے کی صورت
مرے ماتھے پہ ثبت اک دن کیا تھا
اسے ساتھ لے لوں
ذرا ٹھہرو
اے میرے ہمراہی ٹھہرو
کہ میں اپنا زادِ سفر ساتھ لے لوں
وہ ماں کی دعاؤں کا پرنور ہالہ
جو چاروں طرف
اک محافظ کی صورت ہے سایہ فگن
وہ ماں کی دعاؤں کا ہالہ بھی ہمراہ لے لوں!

سیفی سرونجی (سرونج)

اداسی

دور سنسان سڑک پر کھڑی
وہ مسکراتی رہتی ہے
اس کی یہ مسکراہٹ
خطرے سے خالی نہیں ہوتی
یہی وجہ ہے کہ
میں اپنے کمرے کا دروازہ
ہمیشہ بند رکھتا ہوں
کہ پتہ نہیں کب
وہ ادھر کا رُخ کر لے
لیکن میری اتنی احتیاط کے باوجود
نجانے کس طرح
وہ بے خوف
میرے کمرے میں چلی آتی ہے!

فرحت حسین خوشدل

(ہزاری باغ)

زندگی کا کینوس

میں ادھورا ہوں
ادھوری زندگی کے ساتھ ہوں
زندگی کے کینوس پر
مجھ کو جب لایا گیا
اک نیا عنوان پا کر
میں مکمل ہو گیا
اور پھر میں زندگی کے
کینوس پر چھا گیا!

ستیہ پال آنند (کینیڈا)

مایوسی کے عالم میں خلق ہوئی چار نظمیں

تجا ہوا، بیکار، اکارت

پوچھو مت یہ کیسا خلا ہے
ہم جس میں محبوس کھڑے ہیں
وقت کی ریت گھڑی سے کیسے
ذرّہ ذرّہ گرتے پل چھن
ہم کو اکارت جان کے، یارو
تجا ہوا، بوسیدہ کپڑے کی اترن سا
چھوڑ گئے ہیں
رسّی، جس سے
عمر گریزاں کے موسم، اجلے کپڑوں سے
ٹنگے ہوئے جاں بخش فضا میں جھوم رہے تھے
ادھڑی ادھڑی، مُڑی تُڑی سی
گدلی سرد ہوا میں پھانسی کے پھندے سی
جھول رہی ہے
کل کی سندر کنیائیں، جو
اپنی کلائیوں میں پھولوں کی قوس قزح کے گجرے پہنے
گلشن گلشن گھوم رہی تھیں
اب بوڑھی بیوائیں ہیں، جو
ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں سی سوکھی۔۔ بال کھلے
گاڑھی مٹّی کی رنگت جیسے
رات رات بھر جاگ کے سینہ کوبی کرتیں
راکھ پہ بیٹھی سسک رہی ہیں
جلتے الاؤ بُجھ سے گئے ہیں
کہر آلود فضا کی گدلی تاریکی میں
تارہ، جگنو، کچھ بھی نہیں ہے!
وقت کی ریت گھڑی سے کیسے
گرتے پل چھن
اے ہم عصر ساتھیو، ہم کو
تجا ہوا، بیکار، اکارت چھوڑ گئے ہیں!

ستیہ پال آنند

کوئی رفتہ، نہ آئندہ

یہ کیسا آج ہے جس میں
کسی فردا کے سورج کے نکلنے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی
کسی کل کے افق میں ڈوب جانے کا کوئی غم بھی نہیں
ہوتا رعجب بے رنگ سا ماحول ہے دل کے احاطے کا
جہاں بے اعتنائی، بے حسی کی راکھ اڑتی ہے
نہ قدموں کے نشان باقی ہیں آنے جانے والوں کے
نہ کچھ امید ہے کوئی کبھی لوٹے گا اس گھر میں
نہ کچھ آسودگی، اقبال مندی کی طمانیت
نہ کچھ آزردگی، فکر و تردد کی اذّیت ہے!
کوئی کل ہے، نہ فردا ہے

کوئی رفتہ، نہ آئندہ
فقط نامعتبر اک لمحۂ موجود، جگنو سا
مری مٹھی میں رہ رہ کر تڑپتا
مرتا جاتا ہے!

ستیہ پال آنند

کون ہیں ہم تم؟

کون ہیں ہم تم؟
ہم تم ہیں دیوار پہ لکھے نام
جنہیں لکھنے والے نے
خشت خشت تحریر کیا تھا
لیکن آتی جاتی صدیاں
وہ ابجد ہی بھول گئی ہیں
جس میں ہم تم لکھے گئے تھے!
آنے والی صدیاں شاید
یہ دیوار نوشتہ پڑھ سکنے کی خاطر
بھولا بسرا ابجد پھر سے از بر کر لیں
نام پڑھے بھی جائیں، لیکن
نام نام ہیں
شخص نہیں ہیں
نام میں آخر کیا رکھا ہے؟

ستیہ پال آنند

ہمیں حنوط کرو

ہم جیتے جی فرعونوں جیسے افضل تھے
برتر، اعلیٰ، سب سے اونچے
ہم مخدوم، مکرّم، مقبول و ماجد
سب کے آقا تھے!

آج ہماری ہار ہوئی ہے
ہم خاقانی
اپنی خِفّت میں لپٹے بے حرمت لاشے
گلیوں، صحنوں، دالانوں میں پڑے ہوئے ہیں

شاید ایک عجائب گھر میں
رکھے نمونوں جیسے ہم تم
آنے والی نسلوں کی
تدریس و آموزش کا ایک وسیلہ بن کر
اپنے ماضی کی فوقیت قائم کر لیں

فاتح لوگو
ہمیں حنوط کرو، لاشیں لافانی کر دو!!

تنہا تماپوری (تماپور)

میاں ہوش میں ہو؟

زمیں پر ہو تم
یا خلاء میں کھڑے ہو
میاں ہوش میں ہو!!؟
زمین جب ہنسے گی
ہنسی دور تک زلزلہ جب بنے گی
خدا کی زمیں کو زباں جب ملے گی
کہاں اور کب تم نے کیا کیا کیا تھا
بتانے لگے گی
یہ ہاتھ اور پاؤں، یہ کان اور آنکھیں
زمیں کی گواہی کو تفصیل دیں گے
تم اپنی صفائی میں کیا کہہ سکو گے؟
خدا کی عدالت سے کیسے بچو گے؟
زمیں پر ہو تم
یا خلاء میں کھڑے ہو
میاں ہوش میں ہو!!!؟

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

شاید

یہ دن، ہفتے، مہینے، سال
کیلنڈر کے قیدی ہیں
ورق بدلا، مہینہ کھو گیا
کس بانجھ دھرتی میں
بس اک درجن ورق جب
پھڑ پھڑا کر ہو گئے مردہ
تو اس دیوار پر
ایک اور کیلنڈر طلوع ہو گا
نیا اک سال پھر سے اپنی سانسیں
گن رہا ہو گا۔
مری دیوار کتنے سال کھو کر
آج بھی چپ ہے
میرے جیون کا ہر اک سال
شائد مجھ میں زندہ ہے

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

ایک ٹکڑا روٹی کا

ہوئے دو دن مرے چولہے نے
آنکھیں تک نہیں کھولیں
دھواں پلکیں نہیں جھپکا
نہ چنگاری کوئی بولی
فقط ہانڈی کا پانی گھر گیا ہے پیٹ میں میرے!!
وفاداری کے آنگن میں
اُگی آواز۔۔''بھوں بھوں''۔ کی...........
اُٹھا، غصے سے چپل میں نے اس آواز پر پھینکی
کہیں سے سوکھی روٹی وہ
اٹھالایا تھا کھانے کو
اسی روٹی کا اک ٹکڑا
گرا تھا میری چپل پر
اسی ٹکڑے کو ہاتھوں میں لئے ٹھہرا ہوا ہوں میں
مگر کیوں پیٹ کے اندر سے پانی بڑبڑاتا ہے
میرے ہاتھوں میں اس روٹی کا ٹکڑا کیوں لرزتا ہے

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

پانچ پڑوسی

کان اور آنکھ
ناک اور اک جیبھ
لمس کے ساتھ
مل کے رہتے ہیں
اپنے کاموں میں کس قدر مصروف
کیسے بے مثل یہ پڑوسی ہیں
اپنی اپنی حدیں سمجھتے ہیں
ایک دوجے کے کام میں ہرگز
دخل دیتے ہیں اور نہ لڑتے ہیں
یہ بدن مملکت میں رہتے ہیں
امن اور چین کا نمونہ ہیں۔

جائے عبرت ہے آدمی کیلئے
آدمی آدمی سے لڑتا ہے
بے حیائی کی موت مرتا ہے!!!

تنہا تماپوری

ایسے بھی دن آئینگے

کچھوا پہلے یا خرگوش
بہت پرانا قصہ ہے
اب ہر رستے پر بہتی ہیں
قسم قسم کی کئی گاڑیاں
رستوں پر ادنیٰ سا ٹکڑا
خالی کہیں نہیں ملتا ہے
ٹرافک کے اس شور میں لیکن
میری ساتھی
گاڑی میں ہے۔
میں پیدل ہی چلا نکلا ہوں
ہم دونوں کی منزل ایک
دونوں کی رفتار الگ
حیرت ہے، منزل پر پہلے
مجھ جیسا کچھوا پہنچا ہے
گاڑی کا خرگوش ابھی تک
رستے میں ہے!!

تنہا تماپوری

تقدیر

لفظ ''بھوک''، لکھی
اور چلی گئی
محنت کے نوالوں پہ
طمانچہ تھا وقت کا
اور پیٹ اس ہتھیلی میں
کشکول بن گیا!!

رخسار ہٹالو

ابھی میت میں
تعزیت کی خاطر
آ گئی ہو تم
دکھاوے کیلئے ہی کیوں نہ ہو
آنسو بہانا ہے
بس اتنا یاد رکھو
تم اپنے رخسار ہٹالو
ورنہ یہ میک اپ بگڑے گا!

ستیہ پال آنند (امریکہ)

مولانا رومی

ایران سے چل کر ہالی وڈ تک کی زیارت

(**نوٹ**: مغربی دنیا علم اور ٹیکنالوجی میں عظیم الشان ترقی کے دور سے گزر رہی ہے۔تاہم روحانی لحاظ سے یہاں کی عمومی اپروچ بہت ہی سطحی ہوتی جا رہی ہے۔تصوف کی مشرقی روایت میں مولانا رومی ایک بڑا نام ہیں۔حالیہ دنوں میں مغربی دنیا میں انہیں بہت زیادہ پسند کیا جا رہا ہے۔لیکن کس بنیاد پر؟ صرف جسم کی سطح پر۔روح کو منہا کر کے۔ستیہ پال آنند جی نے اس مضمون میں دلچسپ حقائق بیان کیے ہیں۔اس سے مغرب کے عوامی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔**ح۔ق**)

جب مولانا رومی تصوف سے چھلکتی ہوئی اپنی شاعری سے صرف ایران ہی نہیں، بلکہ سارے عالم اسلام کو اپنا گرویدہ بنا رہے تھے تو کیا کولمبس نے امریکا دریافت کر لیا تھا یا نہیں، سوال یہ نہیں ہے۔سیدھا سادہ سوال یہ ہے کہ مولانا جلال الدین رومؔی کو ایران سے چل کر امریکا تک پہنچنے میں اتنی صدیاں کیوں لگیں؟ دیر آید درست آید! خبر یہ ہے کہ اب اکیسویں صدی میں مولانا کے یہاں پہنچتے ہی جیسے سارا امریکا ان کے سامنے بچھ گیا ہو۔اس کی اکلوتی وجہ یہ ہے کہ امریکا میں کسی بھی شاعر، فنکار، ایکٹر، رقّاص، یا گلوکار کو قبول عام کی سند حاصل کرنے کے لیے اس عظیم ملک کے شوبز show biz کے مرکز یعنی ہالی وُڈ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔مولانا رومی جیسا مقدّر تو کوئی ہی رکھتا ہو گا، کیونکہ ان کی ''باادب باملاحظہ ہوشیار!'' آمد کی خبر سنتے ہی ہالی وُڈ کے دروازے ان کے لیے وا ہو گئے، خوش آمدید کے زرّیں قالین بچھ گئے اور اب وہ اپنے صوفیانہ کلاہ اور ریش دراز کے ساتھ قبول عام کی کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔

کچھ سال پہلے ہی امریکا کے 'پاپ کلچر' Pop Culture کے ایک نئے ہندوستانی نژاد گرو نے مولانا رومی کی شاعری کو انگریزی کے جدید امریکی روزمرہ یعنی عام بول چال کی street language میں ترجمہ کرنے کے بعد انہیں ہالی وُڈ کے چوٹی کے موسیقاروں اور گلوکاروں کے تعاون سے اک CD کی شکل میں جب پیش کیا تو ہالی وُڈ تو کیا، پورا شمالی امریکا مولانا کے قدموں تلے بچھ گیا۔یہ ہیں پاپ کلچر اور یوگا ابھیاس کے جانے مانے ہوئے گرو دیپک چوپڑا جنہیں ہالی وُڈ کی ماڈل حسیناؤں، چوٹی کے پروڈیوسروں، اداکاروں اور کروڑ پتی فلم سازوں کی

سرپرستی حاصل ہے۔اس سی ڈی کے کتنے ہزار یا کتنے لاکھ البم اب تک بک چکے ہیں، اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔بزنس کے ماہر یار لوگوں نے کتنی جعلی C.Ds بنائی ہیں اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔ہاں، اندازہ ہے تو اس بات کا ہے کہ یہ سی ڈی ہر اس گھر میں موجود ہے جو دیپک چوپڑا یا گلوکارہ میڈانا کا گرویدہ ہے، جس نے مولانا رومی کی ''شاعری'' کو اپنی آواز کا جادو عطا کیا ہے۔اس سی ڈی کا نام Gift of Love ہے۔مولانا رومی کے شعروں کا ترجمہ گیتوں کی شکل میں کیا گیا ہے اور مترجم ہیں: ڈاکٹر دیپک چوپڑا! ڈاکٹر صاحب پنجابی نژاد ہیں اور امریکا میں یوگا سکھانے والے گرو کے طور پر ان کی شہرت مسلّمہ ہے۔یوگا ابھیاس کے درجنوں سینٹر ان کی رہنمائی میں چلتے ہیں اور یہ ایسے ٹریننگ کیمپ بھی آرگنائز کرتے ہیں جن میں دولتمند بوڑھی عورتیں اور مرد اپنی گئی گذری جوانی کو دوبارہ واپس لانے کے جتن کرتے ہیں۔ ہالی وُڈ کی حسینائیں اپنی جوانی کو سدا بہار رکھنے کے لیے لاکھوں ڈالر دے کر ان سے یوگا کی تربیت لیتی ہیں۔ڈاکٹر چوپڑا ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ان کے ناول ادبی لحاظ سے کہتر ہونے کے باوجود خوب بکتے ہیں کیونکہ یہ ناول عام طور پر ہندومت کی روحانی تعلیمات کا رشتہ مغرب کی مادی اقدار سے جوڑنے کے مرکزی خیال پر انحصار رکھتے ہوئے ان عجیب و غریب واقعات اور کرداروں پر مبنی ہوتے ہیں، جنہیں امریکی قارئین شوق اور انہماک سے پڑھتے ہیں۔

''گفٹ آف لو'' کی تیاری میں جن اہم ہستیوں نے کاروباری سطح پر ڈاکٹر چوپڑا کو تعاون دیا ان میں مقبول و معروف موسیقار فلپ گلاؔس کا نام سرفہرست ہے۔گلوکاروں میں کچھ نام تو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ان میں شہرہ آفاق گلوکارہ میڈؔانا بھی شامل ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنی جوانی کو سدا بہار، شاداب اور تروتازہ رکھنے کے لیے وہ جس یوگا ابھیاس کی مرہون منّت ہے، وہ دیپک چوپڑا صاحب کا ہی سکھایا ہوا ہے۔ دیگر شرکاء میں مارٹن شینؔ، گولڈی ہاںؔ اور ڈیمی مورؔ ہیں، اور ان کے نام اس بات کی گارنٹی ہیں کہ سی ڈی کے گانے اعلیٰ پائے کے ہیں۔اب آئیں، وہ سوال پوچھیں جو آپ کے اور میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔وہ کیا جادو ہے جو اتنی صدیوں کے بعد سر چڑھ کر بول رہا ہے؟ مولانا رومی تو شمس تبریز کی طرح ایک بزرگ صوفی شاعر تھے۔ان کا دیپک چوپڑا صاحب اور ہالی وُڈ کے کروڑ پتی اداکاروں اور ڈائریکٹروں سے کیا واسطہ؟ کہیں کچھ دال میں کالا ہے۔آئیے، اسے تلاش کریں۔صورتحال یہ ہے کہ آج سے لگ بھگ دو صدیاں پیشتر جب فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا تو ایک ایسے غلط تصور کی بنیاد پڑی، جو آج تک قائم ہے۔تب یہ فرض کر لیا گیا کہ عرب اور عجم کی جملہ شاعری صرف ایک قدر راسخ سے وابستہ ہے، اور وہ ہے شراب و شباب یا حسن و عشق۔ اس سے قبل بھی الف لیلہ اور امیر حمزہ کی داستانوں کے ترجمے جب انگریزی میں ہوئے تو یہی تصور پختہ ہوا کہ مشرق وسطیٰ کے لوگ اسی مقولے پر کاربند ہیں: بابرؔ بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! اور اس خطّے کا ادب بڑی حد تک عیش و عشرت اور حسن پرستی کے موضوعات کو ہی لے کر لکھا گیا ہے۔

یہ 1995 عیسوی کے وسط کی بات ہے کہ یونیورسٹی آف جارجیا کے پروفیسر کولین بارکس نے رومی کی غزلوں اور رباعیوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ان کی کتاب کا نام The Essential Rumi تھا۔کہا جاتا ہے کہ

اس کتاب کی اب تک پانچ لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، لیکن پروفیسر بارکس پہلے اسکالر نہیں ہیں جنہوں نے مولانا رومی سے مصافحہ کیا ہو۔ یہ آج سے آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف تب یونیورسٹی آف دی ڈسٹرکٹ آف کولمبیا واشنگٹن ڈی سی سے منسلک تھا۔ پروفیسر کولین بارکس سے ایک ٹیلیفون انٹرویو کے لیے استدعا کی تو وہ مان گئے۔ بات چیت کے دوران انہوں نے ایک عجیب وغریب داستان سنائی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ یوں ہوا، انہوں نے بتایا، کہ ایک دن ان کے پاس معروف امریکی شاعر رابرٹ بلاؔئی آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کرم خوردہ کتاب تھی۔ یہ انیسویں صدی میں مطبوعہ مولانا رومی کی غزلیات اور رباعیات کا ایک ترجمہ شدہ مجموعہ تھا۔ بلاؔئی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور کہا، ''جب تک میں اس کتاب سے پڑھتا رہوں گا، تم کرسی سے اٹھو گے بھی نہیں اور کچھ بولو گے نہیں!''۔ ایک استفسار کے جواب میں کول مین بارکس نے کہا، ''میں کرسی سے کیسے اٹھ سکتا تھا؟ جب تک رابرٹ بلائی مجھے پڑھ کر سناتا رہا، میں مبہوت سا، خمار اور نشے کی حالت میں بیٹھا سنتا رہا۔'' اور تب رابرٹ بلاؔئی نے جیسے تحکمانہ لہجے میں مجھے کہا، ''یہ الفاظ پنجرے میں بند پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے ہیں۔ انہیں ان کے پنجرے سے آزاد کر دو!''۔ The Essential Rumi کا جنم اس گفتگو کے ایک برس کے بعد، یعنی 1975 میں ہوا۔ اور وہی کتاب ''ملاّئے رومی'' (ن۔م۔ راشدؔ) اب اتنے لاکھ جلدوں میں فروخت ہو چکی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ انٹرنیٹ پر رومی سے متعلق درجنوں ویب سائٹس موجود ہیں۔ شائقین آن لائن کتب فروشوں، مثلاً ''ایمے زان'' سے اسے خرید سکتے ہیں۔ رسالوں، اخباروں، نیوز لیٹرز اور فلائیرز سے ''ملائے رومی'' کے بارے میں نئی نئی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ Nigel Watts کی ایک ڈاکومانٹری The Way of Love اسی سلسلے یعنی مولانا رومی کو کمرشلائز کرنے کی ایک کڑی ہے۔

وہ جادو کیا ہے جو مولانا رومی کی شاعری میں سر چڑھ کر بولتا ہے اور جس نے مغرب کے عیش پرست اور لادین اشرافیے کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ میں ٹورونٹو (کینیڈا) کے نواحی قصبے کیمبرج میں رہتا ہوں اور مجھے ٹورونٹو تک اپنی کار میں جانے کے لیے صرف پنتالیس منٹ درکار ہیں، اس لیے جب اخبارات میں یہ اشتہار چھپا کہ رائے تھامسن ہال میں مولانا رومی کی شاعری پر مبنی ایک میوزیکل شو پیش کیا جا رہا ہے تو میں بھی پچیس ڈالر کا ٹکٹ خرید کر وہاں پہنچ گیا۔ شو کا نام تھا Monsters of Grace جو کہ بجائے خود ایک معمّہ تھا کیونکہ 'گریس' اور 'مانسٹرز' بعد المشرقین ہیں۔ کمپوزر فلپ گلاؔس اور ڈائریکٹر رابرٹ ولسؔن (جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے) بنفس نفیس موجود تھے۔ یہ ایک ویکلی انگریزی اخبار کے کالم نگار ہونے کا چمتکار تھا یا میرا نام اردو کے شاعر کے طور پر ہی اتنا معروف تھا کہ مجھے اسٹیج کے پیچھے ان سے دو چار منٹ گپ شپ کرنے کا موقع مل گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس شو میں پیش کی جانے والی غزلیات اور رباعیات The Essential Rumi سے ہی اخذ کی گئی ہیں۔

Where Everything is Music عنوان تھا پہلی قرات کا۔ عرب کا لامحدود صحرا اس کا پس منظر تھا، جو 3-D میں اسٹیج کے عقبی پردے پر ابھارا گیا تھا۔ (یہ خیال صرف مجھ جیسے شخص کو ہی آ سکتا تھا کہ مولانا رومی کا وطن ایک سرسبز و شاداب چمن کی طرح تھا اور عرب کے ریگزاروں سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، لیکن گورے کینیڈین یا کینیڈا

میں مقیم بھیڑ چال چلنے والے نو دولتیے ہندوستانی اور پاکستانی یہ کہاں سمجھتے تھے!) اسے اردو مشاعروں کے ترنم میں فارسی اور انگریزی کی مخلوط زبان میں گایا گیا تھا۔ شو کے ختم ہونے پر میں نے کچھ لوگوں سے سوالات کیے۔ مثلاً میں نے پوچھا۔ کیا آپ تصّوف یا صوفی ازم کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ جواب تھا، نہیں، میں اس لفظ سے واقف نہیں ہوں۔ سوال تھا، تو پھر قبلہ آپ کیا سننے یا دیکھنے کے لیے یہاں آئے؟ جواب تھا۔ شاعری اور موسیقی! اوگاڈ! کیا لوگ تھے یہ تیرھویں صدی میں! کیا خوبصورت کنیزیں تھیں! میرے خیال میں شراب کی تو شہروں میں نہریں بہتی ہوں گی! اور اغلام! کیا یہ سب لوگ gay تھے؟...... مجھے ابکائی آ گئی لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔

یہ البم اب لاکھوں گھروں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ بہت سے نغمے مشرق وسطیٰ کے صحرائی ساز یعنی اکتارے کی سحر کن موسیقی سے شروع ہوتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے صحراؤں کے خانہ بدوش لوگوں کی یادیں جو کہیں ہمارے لاشعور میں محفوظ ہیں، بیدار ہو گئی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں خود ہال کے اندر بیٹھے ہوئے کچھ دیر کے لیے اس طلسم ہوش ربا میں کھو گیا تھا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ دیپک چوپڑا کی اپنی آواز بری نہیں ہے۔ اس کی آواز میں جب نغمے کا مکھڑا اسن پڑتا ہے تو نشّہ سا آ جاتا ہے۔

My heart is burning with love

All can see its flames!

یہ سُر مدّھم سے شروع ہوتا ہوا، آیتوں کی قرات سا ابھرتا ہے اور پھر مدھم ہوتے ہوئے میڈوناؔ، ہاؔن، بلائتھ ڈینؔز، اور مارٹن شینؔ کی آوازوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ باری باری سے solo یا کبھی کبھی duet میں گلوکار اور گلوکارائیں اس کو اپنی مترنم آواز میں پیش کرتے ہیں۔ لگ بھگ ایک گھنٹے تک یہ سحر آگیں سماں بندھا رہتا ہے۔ میں نے اسٹیج کے پیچھے ہندوستانی ساز دیکھے تھے اور جب میں نے بیک گراؤنڈ میوزک میں ستار، اکتارہ اور بانسری (اور یہاں تک کہ ہارمونیئم بھی) سنا تو مجھے خود یہ احساس ہوا کہ (بقول شخصے) میرے ٹکٹ کے پیسے وصول ہو گئے! ڈاکٹر چوپڑا نے ایک اخباری انٹرویو میں بتایا کہ یہ نغمے لفظ بلفظ ترجمے نہیں ہیں، بلکہ ''موڈ'' ہیں جو میں نے دوبارہ تخلیق کیے ہیں۔

امریکا میں 'نیوز ویک' کے تبصروں کا ایک اہم مقام ہے۔ اس لیے جب نیوز ویک میں اس البم کو ایک پُر معنی لقب سے نوازا گیا تو لوگوں کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ 'نیوز ویک' نے اسے The Love Machine کہا۔ اس ایک انگریزی لفظ Love میں بسیار الاصلاح معانی چھپے ہوئے ہیں، جو تصوف کی روحانی بلندیوں سے لے کر عشق کی سطح مرتفع اور پھر وہاں سے تعشق اور تکمیل نفس کی پستیوں میں جا گرتے ہیں اس سارے عمل میں مولانا رومی (بے چارہ مولانا رومی!) امریکا کے پاپ کلچر میں کھو جاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ مغربی موسیقی کے شائقین کے لیے مولانا رومی کا تصوف اگر کچھ معنی رکھتا بھی ہو تو وہ صرف جامعات کے ادب اور موسیقی کے شعبہ جات تک ہی محدود ہے۔ پاپ کلچر کے شیدائیوں کے لیے ایسے البم اور ایسے شو صرف حسن پرستی کا دوسرا نام ہیں۔

حیدر قریشی (جرمنی)

کھٹی میٹھی یادیں

۔۔۔ادبی کائنات میں رنگ

شعروادب میں مردانہ اور زنانہ ڈبوں والی کوئی بات نہیں رہی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی سوسائٹی میں خواتین کے مختلف رشتوں اور رنگوں سے حسن پیدا ہوا ہے۔میری زندگی پر میری والدہ کا جتنا گہرا اثر ہے وہ میری مختلف تحریروں میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔اردو میں والدہ کے حوالے سے اب کئی لوگ لکھنے لگے ہیں۔ عام طور پر قدرت اللہ شہاب کے خاکے ''ماں جی'' کو اس نوعیت کا پہلا اردو نمونہ کہا جاتا ہے۔تاہم میں اپنی معلومات کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں کہ قدرت اللہ شہاب سے بھی بہت پہلے سر محمد ظفر اللہ خان نے ۱۹۳۸ء میں ایک مختصر سی کتاب ''میری والدہ'' شائع کی تھی۔اپنے کردار کی مضبوطی کے حوالے سے اور بعض دوسرے حوالوں سے بھی سر محمد ظفر اللہ خان کی والدہ کا کردار قدرت اللہ شہاب کی ''ماں جی'' سے کہیں زیادہ اہم دکھائی دیتا ہے۔لیکن کچھ ہماری اردو سوسائٹی کے بعض تحفظات اور تعصّبات کے باعث اور کچھ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین میں سے بعض کی بے خبری کے باعث اردو میں ماں کے بارے میں لکھے گئے اس اولین شہ پارے کی طرف توجہ ہی نہیں جاسکی۔میرا خیال ہے کہ سر محمد ظفر اللہ خان اور قدرت اللہ شہاب کے بعد اکبر حمیدی نے ''ماں جی'' کے عنوان سے ایک زبردست خاکہ لکھا جو ان کی والدہ کا نہیں بلکہ دادی کا خاکہ تھا۔دادی کو انگریزی میں گرانڈ مدر یعنی بڑی ماں کہتے ہیں۔سو یوں اکبر حمیدی نے اس خاکے کے ذریعے ماں کے رشتے کے ایک اور زاویے کو اجاگر کیا۔

اکبر حمیدی کے بعد میں نے ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' کے عنوان سے اپنی امی جی کا خاکہ لکھا۔اس کے بعد جیسے والدہ کے بارے میں لکھنے والوں کی بہار آگئی۔بعض دوستوں نے اپنی اپنی والدہ کے حوالے سے پوری کتابیں لکھ دیں۔اگرچہ ایسی کتابوں میں طوالت کے باعث جذباتیت زیادہ راہ پا گئی ہے تاہم ایک مثبت رویے کی طرف لکھنے والے دھیان تو دینے لگے،یہی بڑی بات ہے۔اپنی والدہ کے علاوہ میں نے اپنی بڑی بہن کا خاکہ ''محبت کی نمناک خوشبو'' اور اپنی اہلیہ کا خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' لکھا جنہیں ادبی دنیا میں کافی پسند کیا گیا۔مجموعی طور پر میرے خاکوں اور یادوں میں ماں،دادی،نانی،بہن، بیٹی، ممانی، کے کردار براہ راست آئے ہوئے ہیں۔مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی امی جی کے اثرات سے خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کرسکتا بلکہ ان کے اثرات سے

آزاد ہونا ہی نہیں چاہتا۔

عورت کے یہ سارے روپ میرے دل میں عقیدت،احترام اور محبت سے گندھے ہوئے ہیں۔اس پس منظر کے ساتھ اردو دنیا کی خواتین کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تو مجھے لگا کہ وہاں عقیدت تو نہیں ہے لیکن بہت ساری ایسی ادبی خواتین ہیں جن کے لئے میرے دل میں احترام اور محبت کے جذبات ہیں۔کئی ہیں جن کے لئے دنیاوی سطح پر سہی لیکن اخلاص موجود ہے۔بعض خواتین کے منفی روپ بھی ہیں۔کئی ایسی ادبی خواتین ہیں جن سے ملنا میرے لئے ذاتی طور پر ایک اعزاز سے کم نہیں۔سو یادوں کے اس باب میں ادبی حوالے سے ایسی شاعرات اور ادیباؤں کو یاد کروں گا جن سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ملاقات ہوئی ہے۔کہیں کہیں ادب سے غیر متعلق خواتین کا ذکر ناگزیر ہوا تو وہ بھی آجائے گا کیونکہ یادوں کا بہاؤ تو خواتین کی طرف ہے۔

قرۃ العین حیدر سے دو بار ملاقات ہوئی۔ایک بار جب وہ پاکستان آئیں تو ان کے اعزاز میں فیصل آباد کے چناب کلب نے ایک ادبی تقریب کا بھی اہتمام کیا تھا۔میں اس میں شریک ہوا تھا اور تقریب کے بعد بھی ان کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔تاہم اس ملاقات کا حاصل فوٹو سیشن رہا۔کشور ناہید لاہور سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔میں نے دیکھا کہ وہ جو بڑے بڑے مردوں کے سامنے مردانہ وار گفتگو کرتی ہیں وہی کشور ناہید ان کے سامنے سراپا نیاز بنی ہوئی تھیں۔قرۃ العین حیدر سے دوسری ملاقات سال ۲۰۰۰ء میں لندن میں ہوئی۔یہاں بھی ایک کانفرنس چل رہی تھی اور یہاں بھی سلام دعا،پہلی ملاقات کا ہلکا سا ذکر اور فوٹو سیشن۔فیصل آباد والی تصویر انہیں دنوں میں ماہنامہ ماہِ نَو لاہور میں چھپی تھی اور لندن والی تصویر تو انگلینڈ اور جرمنی کے رسالوں میں چھپ چکی ہے۔پہلی ملاقات میں وہ زور آور دکھائی دی تھیں جبکہ اس بار وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔تاہم ان کے ساتھ ملنا بھی میرے لئے ملاقاتِ مسیحا و خضر جیسی بات تھی۔

کشور ناہید کا ذکر ہوا ہے،ان کے بارے میں مثبت اور منفی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ان سے میری بہت زیادہ ملاقاتیں تو نہیں رہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں ہوئیں۔میں جدید ادب کی اشاعت کے سلسلے میں جب لاہور جاتا تھا تو مختلف ادباء سے ملا کرتا تھا۔کشور ناہید سے بھی سات آٹھ بار تو ملاقات ہوئی ہوگی۔خوش مزاج اور لبرل خاتون ہیں۔مردوں کی محفل میں بیٹھ کر بھی پوری محفل پر چھا جاتی تھیں۔مرد حضرات زچ ہو کر پھر ان کے ساتھ مردوں جیسا رویہ اختیار کر لیتے۔ایک بار عید الفطر کے بعد ادیبوں کی عید ملن پارٹی ہوئی۔اس میں کشور ناہید حسبِ معمول خوب چہک رہی تھیں جبکہ ان کے شوہر یوسف کامران خاموش بیٹھے تھے۔کسی ادیب نے اس صورتحال کی طرف توجہ دلائی تو ڈاکٹر انور سدید کہنے لگے عید الفطر کے موقعہ پر کشور ناہید بولتی ہیں اور یوسف کامران چُپ رہتے ہیں اور عید الاضحیٰ پر یوسف کامران بولتے ہیں اور کشور ناہید خاموش رہتی ہیں۔ایک اور موقعہ پر پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق حفیظ جالندھری کشور کے جملوں کی لپیٹ میں آگئے۔انہیں کشور ناہید کے جملوں کا جواب نہیں سوجھ

رہا تھا، آخر تنگ آ کر بولے: اگر میں نے تمہیں پہلے دیکھ لیا ہوتا تو قومی ترانے میں کبھی یہ مصرعہ شامل نہ کرتا۔
کشورِ حسین شاد باد!

مدت کے بعد ماریشس کی ادبی کانفرنس میں ان سے ملاقات ہوئی۔شفقت سے پیش آئیں۔لیکن جملہ بازی سے وہاں بھی باز نہیں آئیں۔رات کو مشاعرہ ہوا تھا۔میں نے اس میں جو غزل سنائی تھی، اس کے ایک شعر پر کشور نے داد دی۔

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اَب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں

اگلے دن ایک اجلاس کی صدارت کشور ناہید کے ذمہ تھی۔وہ کرسیٔ صدارت پر بیٹھی تھیں۔اسٹیج سیکریٹری اعلان کر رہے تھے کہ اب فلاں صاحب اسٹیج پر آ کر ساری کانفرنس کی تقاریر اور ملاقات کا خلاصہ دو دو سطروں میں کوزے میں سمندر کی طرح بند کر کے پیش کریں گے۔جب وہ صاحب اسٹیج کی طرف جانے لگے تو میں نے صدا لگائی: لائیے صاحب! آپ اپنے کوزے۔اس پر کشور ناہید نے صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہی جواب داغا: ''پر۔۔۔مصری اپنی اپنی''۔

کشور ناہید غزل اور نظم کے میدان میں آگے چلتیں تو ان کے ہاں موجود امکانات بہتر طور پر سامنے آتے لیکن انہوں نے خود ہی نثری نظم کو سب کچھ مان کر شاعری کی دنیا میں اپنے تخلیقی امکانات کی راہیں مسدود کر دیں۔اس کے باوجود ان کے مجموعی ادبی کام کے حوالے سے بھی اور خواتین کے حقوق کے حوالے سے بھی انہیں ایک بہادر خاتون کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۹۳ء میں دہلی میں مجھے امرتا پریتم سے تین چار بار ملنے کا موقعہ ملا۔حوض خاص کے علاقہ میں ان کی رہائش گاہ پر ان سے طویل نشستیں ہوئیں۔تب اردو میں ماہیے کی بحث کا آغاز ہو رہا تھا، میں نے ان سے بھی اس موضوع پر بات کی۔عروضی حوالے سے تو انہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب میں نے ایک ماہیا گنگنا کر انہیں سنایا تو کہنے لگیں یہ تجربہ تو ساحر لدھیانوی کئی سال پہلے اردو میں کر چکے ہیں۔میں نے فلم نیا دور کا حوالہ دے کر ماہیا سنایا: دل لے کے دغا دیں گے/یار ہیں مطلب کے/یہ دیں گے تو کیا دیں گے
میرے حافظہ کی تحسین کرنے لگیں۔ایک پاکستانی شاعر نے ان کی پنجابی نظموں کے اردو میں تراجم کئے تھے، امرتا پریتم ان سے مطمئن نہیں تھیں۔چنانچہ ہم نے طے کیا کہ وہ نظم سنائیں گی اور ساتھ کے ساتھ اردو ترجمہ کرتے جائیں گے۔اس طرح ان کی کوئی آٹھ دس نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔افسوس کہ میں اپنی مسافرت میں وہ قیمتی کام کہیں گم کر بیٹھا ہوں۔امروز صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔اور امرتا کے بیٹے کو بھی دیکھا جس کی شکل ساحر سے ملتی ہے اور جس کا بہت سارا ذکر امرتا پریتم نے اپنی کتاب ''رسیدی ٹکٹ'' میں کیا ہوا ہے۔امرتا پریتم نے جو

کچھ لکھا ہے سب سچ ہو گا لیکن مجھے اس جوان کا ذہنی توازن کچھ گڑبڑ سا لگا تھا۔

ایک بار ٹائمز آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن میں ہندی کے ایک معروف ادیب (اس وقت نام ذہن میں نہیں آ رہا) کا مضمون چھپا۔وہ ساحر کے اور امرتا کے پرانے دوستوں میں سے تھے لیکن اس مضمون میں انہوں نے امرتا کے بارے میں بعض نامناسب باتوں کا ذکر کیا تھا۔میں اسی روز سہ پہر کے بعد ملنے گیا تو گھر پر افسردگی اور ذہنی تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی۔امروز غصہ میں دکھائی دے رہے تھے۔مجھے افسوس ہوا کہ میں ایسے موقعہ پر ان کے گھر کیوں چلا گیا۔بہر حال امرتا پریتم سے ملنا بھی میرے لئے ایک اعزاز رہا۔یہ ان سینیئرز میں سے ہیں جنہیں پڑھ کر ہمارے دلوں میں اپنے لئے ادب کی مزید نئی راہوں کی تلاش کی جستجو پیدا ہوئی۔

بانو قدسیہ سے صرف ایک بار اور ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی۔اشفاق صاحب علیل ہو گئے تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ میں بھی ان کی عیادت کے لئے گیا۔اشفاق صاحب اور بانو قدسیہ کے لئے تو میں کوئی انجان سا نیا ادیب تھا لیکن خدا بھلا کرے ممتاز مفتی کا جو اسلام آباد سے اشفاق صاحب کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے۔جدید ادب کے حوالے سے میرا ان سے باقاعدہ رابطہ رہتا تھا سو انہوں نے اتنے تپاک سے ملاقات کی کہ اپنا کچھ بھرم سا رہ گیا۔تاہم بانو قدسیہ سے رسمی علیک سلیک ہی ہوئی۔ان سے اصل ملاقات تو تب ہوئی جب ان کا ناول راجہ گدھ پڑھا۔عشرت آفریں (کراچی۔حال امریکہ)، حمیدہ معین رضوی (لندن) نوشی گیلانی (بہاولپور۔حال امریکہ) صفیہ صدیقی (لندن) سے سرسری ایک دو ملاقاتیں ہوئیں تاہم ان کا مثبت تاثر میرے ذہن میں رہا۔پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد جرمنی میں آیا تھا۔تب انتظار حسین صاحب کو میں اپنے ہاں لے آیا۔اگلے روز انہیں جس گھر پر پہنچانے گیا وہاں پاکستانی وفد کے دوسرے افراد سے بھی ملاقات ہوئی۔میں نے ایک خاتون کو دیکھ کر استفسار کیا: آپ خالدہ حسین ہیں؟۔۔خالدہ حسین ان کے ساتھ بیٹھی تھیں اور وہ خاتون فہمیدہ ریاض تھیں۔عمر کے اس مقام پر بھی اچھی لگیں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی بے باک شاعری کبھی اچھی نہیں لگی۔شاید یہ مرد شاونزم کی کوئی صورت ہو لیکن میرا تاثر ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔

ماہ طلعت زاہدی سے ایک بار بہاولپور میں ہونے والی ایک ادبی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد ایک بار ان کے گھر ملتان میں ملاقات ہوئی۔دھان پان سی بی بی ماہ طلعت اپنے انداز کی بھلی شاعرہ ہیں۔اب بھی رسائل میں کہیں دکھائی دے جائیں تو انہیں پڑھ کر خوش ہوتا ہوں۔خانپور کی ایک شاعرہ تھیں سیدہ ماہ طلعت۔ان دونوں ماہ طلعتوں کے ناموں کا مسئلہ سامنے آیا تو خانپور کی ماہ طلعت، نے غزالہ طلعت کے قلمی نام سے لکھنا شروع کر دیا اور پھر بہت جلد ان کی شادی ہو گئی اور ان کی شاعری کا شوق اپنے انجام کو پہنچ گیا۔خانپور کی ایک شاعرہ شیما سیال تھیں۔اردو اور سرائیکی میں شاعری کرتی تھیں۔ان کی شادی کے بعد بھی شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ان کے مقابلہ میں ان کی چھوٹی بہن پروین عزیز میں شاعرانہ صلاحیت بہت عمدہ تھی۔خانپور کی سب

سے اچھی شاعرہ انہیں کہا جا سکتا ہے۔شروع میں مجھ سے ان کے معاملہ میں کچھ زیادتی ہوئی، میں نے انہیں نظر انداز کیا۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے غلطی کا احساس ہوا۔میں نے اس کی تلافی کرنا چاہی لیکن تب تک وہ مجھ سے شدید خفا ہو چکی تھیں۔وہ شاعری کی طرف آئیں لیکن بے دلی سے۔اب خانپور میں ہی انگریزی کی پروفیسر ہیں۔تاہم میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میری زیادتی کی وجہ سے پروین عزیز نظر انداز ہوئیں اور اس سے اتنا دلبرداشتہ ہوئیں کہ ادب سے ہی کسی حد تک کنارا کر گئیں۔میں خود بھی پھر ادب کی دنیا میں انہیں واپس نہ لا سکا۔اور میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ پروین عزیز کو ابتدا میں اچھی حوصلہ افزائی کرنے والے احباب مل جاتے تو وہ یقیناً آج کی ایک معتبر شاعرہ ہوتیں۔ایسا نہیں ہوا تو یہ میرا ادبی گناہ ہے۔
خدا میرے ادبی بے انصافی کے گناہ کو معاف کرے۔

ثمینہ راجہ رحیم یار خان کے قریب ایک گاؤں راجہ کوٹ میں رہتی تھیں۔ان میں شروع سے ہی شاندار تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔گاؤں کے ماحول میں تو شاید یہ صلاحیتیں پوری طرح ابھر نہ پاتیں تاہم انہوں نے ہمت سے کام لیا اور قسمت نے یاوری کی اور وہ جلد ہی اسلام آباد کے کشادہ ماحول میں پہنچ گئیں۔اردو کے ایک اچھے شاعر زمان ملک سے ان کی شادی ہوگئی۔پھر غالباً رشتہ زیادہ نبھ نہیں سکا۔تاہم ثمینہ راجہ نے بڑی بہادری کے ساتھ سماجی سطح پر بھی اور ادبی سطح پر بھی زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ثمینہ راجہ کو ادبی دنیا میں کافی حد تک پذیرائی ملی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا جو ادبی مقام بنتا ہے ابھی تک ان کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا گیا۔میری ان کے ساتھ رحیم یار خان کے زمانے سے ہی خط و کتابت تھی۔ادبی رابطہ تھا۔تاہم ان سے بالمشافہ ملاقات غالباً ۹۲۔۱۹۹۱ء ہوئی تھی۔عذرا اصغر نے میری اسلام آباد میں آمد پر اپنے گھر میں ہی ایک ''گیٹ ٹو گیدر'' کا اہتمام کیا تھا۔ثمینہ راجہ بھی اس موقعہ پر آئی تھیں۔

عذرا اصغر کے گھر اور ان کے نام سے کچھ ان کا بھی ذکر ہو جائے۔ویسے میں ان کا خاکہ لکھ چکا ہوں جو میرے خاکوں کے مجموعہ میں شامل ہے۔میرے پہلے دو شعری مجموعے اور پہلا افسانوی مجموعہ عذرا اصغر نے اپنے اشاعتی ادارہ تجدید اشاعت گھر کی طرف سے شائع کئے تھے۔ان کے سرورق ان کی صاحبزادی شبہ طراز نے بڑی محنت کے ساتھ بنائے تھے۔شبہ طراز بیک وقت شاعرہ بھی ہیں اور مصورہ بھی۔ان سے بھی عذرا کے گھر پر ہی ملاقات ہوئی تھی، جہاں وہ اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ویسے فون پر تو کچھ عرصہ پہلے بھی میری شبہ اور عذرا دونوں سے بات ہوئی تھی۔میرا دل رکھنے کے لئے دونوں نے تھوڑے تھوڑے سے ماہیے بھی کہے تھے۔

ہندوستان میں کرشنا پال سے جوگندر پال جی کے ہاں ملاقات ہوئی۔جوگندر پال جی کی اہلیہ کرشنا پال یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ہندی میں زیادہ تر لکھتی ہیں۔جوگندر پال جی کی کئی کہانیوں کے انہوں نے ہندی میں ترجمے کئے ہیں۔ان سے دہلی میں کئی بار ملاقات ہوئی۔مجھے ایک بار حدیث قدسی ''زمانے کو برا مت کہو، میں

خود زمانہ ہوں'' کا اصل عربی متن درکار تھا۔کرشنا پال سے ذکر ہوا تو انہوں نے دوسرے دن مجھے عربی متن فراہم کر دیا۔پتہ چلا انہوں نے یونیورسٹی کے عربی یا اسلامیات کے پروفیسر سے پوچھ کر متن حاصل کر لیا اور مجھے دے دیا۔جوگندر پال جی اور کرشنا پال کی صاحبزادی سکریتا پال کمار انگریزی کی ڈاکٹر اور پروفیسر ہیں۔متعدد بین الاقوامی سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکی ہیں۔انگریزی کی اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ان کی متعدد انگریزی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ان سے دو بار ملاقات ہوئی تھی اور گفتگو کرتے ہوئے اپنی کم علمی کا احساس ہوتا رہا تھا۔

ظفر پیامی کے قلمی نام سے لکھنے والے دیوان صاحب کی اہلیہ منورما دیوان اردو کی ممتاز صحافی ہیں۔یہ لوگ ہندو مسلم اتحاد کے داعیوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات کا ایک گہرا نقش میرے دل پر موجود ہے۔کرشنا سوبتی ہندی کی پاپولر رائٹر ہیں۔دیوندر اسر مجھے ان سے ملانے لے گئے۔بہت اچھی طرح ملیں۔باتوں باتوں میں حضرت خواجہ غلام فرید کا ذکر چھڑا اور پٹھانے خان کا نام آیا تو کرشنا سوبتی بتانے لگیں کہ پٹھانے خاں ہندو تھے۔پاکستان بننے کے بعد وہاں رہ گئے تو مسلمان ہو گئے تاہم انہوں نے خواجہ غلام فرید کے در کی غلامی پکڑ لی۔خیال رہے کہ برصغیر کے مسلمان اولیاء کے مزاروں پر ہندو بھی اتنی ہی عقیدت سے حاضری دیتے ہیں جتنی عقیدت سے مسلمان حاضر ہوا کرتے ہیں۔کرشنا سوبتی کا کہنا تھا کہ پٹھانے خاں کے گلے میں جو درد اور سوز ہے وہ اسی المیہ کے بھیتر کی داستان ہے۔جیسے میرے لئے پٹھانے خاں کے بارے میں کرشنا سوبتی کے بیان کی تردید کرنا مشکل ہے اسی طرح میں اس کی تصدیق بھی نہیں کر سکتا۔مجھے اتنا یاد ہے اباجی بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے بچپن میں پٹھانے خاں کو سڑکوں اور بازاروں میں گاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ظاہر ہے تب پٹھانے خاں کا بھی بچپن ہی ہوگا۔اب تو حضرت خواجہ غلام فرید کا نام اور کلام ذہن میں آتے ہی پٹھانے خاں کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔حیدر آباد دکن کی رہنے والی ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو سے ان کی پاکستان میں آمد پر ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔لیکن یہ بس رسمی سی ملاقات تھی۔شمیم حنفی کی اہلیہ صبا حنفی کے ساتھ ماریشس میں اچھی ملاقاتیں رہی تھیں۔شمیم حنفی کی صحبت نے ان کا ادبی ذوق نکھار دیا ہے۔بنیادی طور پر بچوں کی تعلیم ان کا شعبہ ہے لیکن جز وقتی شاعری بھی کرتی ہیں۔بہت ہی نفیس اور شائستہ خاتون ہیں۔

کسی زمانے کی معروف براڈ کاسٹر ثریا شہاب جرمنی میں رہ رہی تھیں۔ان سے ملاقات ہوئی تو تھوڑا ربط بڑھا۔وہ ڈیلی جنگ لندن سے بھی منسلک تھیں۔جرمنی میں مقیم پاکستانی کمیونٹی سے پوری طرح رابطے رکھتی تھیں۔مجھ سے انہوں نے جنگ لندن کے لئے ایک انٹرویو کیا جو اس اخبار میں تب ہی چھپ گیا تھا۔میں نے اس انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں ادب کی مجلسی زندگی سے اپنی بے رغبتی اور بے تعلقی کا اظہار کیا تھا۔ثریا نے دل میں طے کر لیا کہ اس بندے کو مجلسی زندگی میں لانا ہے۔چنانچہ جلد ہی ایک حلقۂ ادب قائم کر کے مجھے اس کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔میں نے کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہاں آنے والوں کی بڑی تعداد تو وزن میں شعر بھی نہیں سنا

سکتی۔بے وزن کلام تنقید کے لئے پیش کیا جانے لگا تو میں نے کہا کہ یہ تو حلقہ کے نام پر دھبہ ہے۔کمال یہ ہے کہ یہاں کے شعراءمکمل بے وزن ہونے کے باوجود پورے اعتماد کے ساتھ خودکو باوزن شاعر سمجھتے تھے۔چنانچہ میں نے ایسے ماحول سے جان چھڑانے کے لئے حلقہ کی سیکریٹری شپ چھوڑ دی۔دو تین ہفتوں کے بعد ثریا میرے ہاں آ گئیں۔نہیں حلقہ آپ نے ہی چلانا ہے۔بہرحال مجھے اس حلقہ میں دوسری اور تیسری بار بھی جانا پڑا۔لیکن حلقہ ادب تو ''ہلکا'' ادب بھی نہیں تھا۔تیسری بار میں نے کچھ ناراضی اور کچھ منت کے ساتھ جان چھڑائی۔

ثریا شہاب ادبی طور پر پہلے افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ''سرخ لباس'' چھپ چکا تھا لیکن اس میں ایک افسانہ بھی ایسا نہیں جسے کسی ادبی حوالے کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔اسی دوران ان کا ناول''سفر جاری ہے'' چھپ کر آ گیا۔میں اس ناول کو پڑھ کر حیران ہوا اور خوش بھی ہوا۔ناول بڑا نہ سہی لیکن ثریا کی ادبی پہچان اس سے بن رہی تھی۔اس دوران میں انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ترتیب دینے کے لئے مجھے اپنا مسودہ دیا۔میں نے اس پر بہت محنت کی۔بہت سی بے وزن چیزیں قلم زد کیں۔چند ایک کی درستی کی۔نظموں کی نوک پلک سنواری۔ردھم سے عاری نظموں کو الگ کر کے میں نے مشورہ دیا کہ انہیں نثری نظم کے الگ سیکشن میں شامل کر لیں۔لیکن جب مجموعہ چھپ کر آیا تو نظم اور نثری نظم سب ملی جلی تھیں۔ایک بار انہوں نے مجھے کہا کہ میرا ایک ادھورا ناول ہے،آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو شاید اس پر ہم گفتگو کر سکیں اور ناول مکمل ہو جائے۔میں نے وقت کی کمی اور اپنی دوسری مصروفیات کے باعث معذرت کر لی۔تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا ناول''بارشوں کے موسم میں'' چھپ گیا۔تاہم مجھے ایک حیرانی رہتی ہے کہ ان کے پہلے ناول کے بعد دوسرے ناول کی زبان و بیان پر گرفت مضبوط ہونا چاہئے تھی لیکن دوسرے ناول پر یہ گرفت پہلے کے مقابلہ میں بے حد کمزور ہے۔

بنیادی طور پر ثریا نیوز ریڈر تھیں۔ٹی وی سے ریٹائرمنٹ کے بعد جنگ لندن کی نمائندگی کر کے جرمنی میں رونق میلہ لگائے رکھا۔پھر انہیں کینسر کا عارضہ ہو گیا۔جرمنی میں علاج معالجہ کی شاندار سہولتوں کے ہوتے ہوئے ثریا نے پاکستان واپس جانے کا طے کر لیا۔ان کے جرمن شوہر مسٹر ہنس بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔چند برس وہاں رہے۔اب سنا ہے کہ وہ بھی ثریا کو چھوڑ کر جرمنی میں واپس آ گئے ہیں۔اور ثریا ڈپلومیٹس کے شہر اسلام آباد میں کینسر کے عارضہ کی آخری اسٹیج پر بالکل تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔

جرمنی میں برلن سے ایک شاعرہ کا پتہ چلا۔رخسانہ شمیم ان کا نام تھا۔ان سے رابطہ ہوا تو تھوڑے عرصہ کے بعد ملنے کے لئے آ گئیں۔تین چار دن ہمارے گھر پر رہیں۔شاعری واعری کا تو کچھ خاص پتہ نہیں چلا کہ کیسے کرتی ہیں لیکن مجھے ایسا لگا کہ اپنے بعض مسائل کی وجہ سے وہ کچھ نیم خبطی سی ہو رہی ہیں۔پھر پتہ چلا کہ وہ امریکہ جا رہی ہیں۔ان کا کلام''توازن'' مالیگاؤں میں چھپتا رہتا ہے۔

جرمنی میں اردو بولنے والی جرمن خواتین ڈاکٹر کرسٹینا اور اولرک اسٹارک ہیں۔دونوں ہائیڈل

برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیائی زبانوں کے شعبہ سے متعلق ہیں۔اولرک اسٹارک تو اب شکاگو چلی گئی ہیں۔کرسٹینا اب بھی اسی ادارہ میں ہیں۔انہوں نے مشرقی جرمنی کے زمانہ میں برلن سے قرۃ العین حیدر پر پی ایچ ڈی کی تھی۔میرا خیال تھا کہ انہوں نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ہوگی لیکن کرسٹینا نے خود ایک بار بتایا کہ مقالہ جرمن زبان میں لکھا تھا۔ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئی ہیں۔بوقت ضرورت ہم رابطہ کر لیتے ہیں۔اردو بول چال سکھانے کے لئے نصابی نوعیت کا کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔اردو ادب کا ایک انتخاب جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر چکی ہیں۔ادبی تحقیق کے حوالے سے کسی ریفرینس کی ضرورت ہو اور وہ ان کی دسترس میں ہو تو فراہمی کے لئے مخلصانہ تعاون کرتی ہیں۔قلی قطب شاہ اور ملاّ وجہی سے لے کر ن۔م۔راشد اور میرا جی تک کتنے ہی اردو شاعروں اور ادیبوں پر انگریزی اور جرمن زبانوں میں مضامین لکھ چکی ہیں۔شاعروں سے زیادہ نثر نگاروں پر کام کیا ہے۔کئی یورپی اور عالمی ادبی کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت کر چکی ہیں،لیکن ان کا میلان مجلسی سے زیادہ علمی ہے۔

اردو جاننے والی اور فیض احمد فیض کی عاشقِ صادق روس کی ڈاکٹر لڈمیلا باغ و بہار شخصیت کی حامل ہیں۔اردو ادب پر ان کی نظر کافی گہری ہے۔کثیر المطالعہ ہیں اور ادبی شعور بھی رکھتی ہیں۔ترقی پسند تحریک سے شروع سے وابستگی رہی جو روح میں رچ سی گئی۔لیکن اب جو سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد کیمونزم کا زور ٹوٹا ہے تو ڈاکٹر لڈمیلا نے بھی خود کو نئی صورتحال میں اچھے طریقے سے ایڈجسٹ کر لیا ہے۔فیض اور اردو سے ان کی وابستگی آج بھی قائم ہے۔دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی کوئی اردو کانفرنس ہو انہیں بلایا جاتا ہے۔بے شک ہم لوگوں کے لئے کسی گورے یا گوری کا اردو بولنا حیرانی اور خوشی کا موجب بنتا ہے اور انہیں بلانے میں یہ فیکٹر بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر لڈمیلا اپنی اہلیت کی بنا پر اردو،فیض اور ترقی پسند حوالے سے بلائے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔میری ان سے دو کانفرنسوں میں ملاقات ہو چکی ہے اور وہ اتنے خلوص کا تاثر دیتی ہیں کہ جیسے میں ان کے لئے ذرا سا بھی اجنبی نہیں رہا۔

ڈاکٹر وسیم بیگم دہلی سے انگلینڈ آئی تھیں تو میں نے شاہد ماہلی صاحب کے ساتھ انہیں بھی جرمنی میں مدعو کیا تھا۔یہاں انہوں نے غالب پر ہونے والی ایک تقریب میں اپنا مقالہ پڑھا تھا۔دہلی جانے کے بعد کبھی کبھار ان سے رابطہ ہو جاتا تھا۔پھر ایک لمبا وقفہ آیا اور اس کے بعد اچانک ان کی ای میل ملی جس میں انہوں نے لکھا کہ انہیں علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی پسند کی جاب مل گئی ہے۔تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہیں۔بعض رسائل میں ان کے تبصرے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

صدیقہ بیگم ادبِ لطیف کے بانی برکت علی چوہدری کی صاحبزادی ہیں۔خود شاعرہ یا ادیبہ نہیں ہیں لیکن نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے اپنے پُرکھوں کی یاد کے طور پر ادبِ لطیف کو جیسے تیسے جاری رکھا ہوا ہے۔پاکستان میں اپنے بے روزگاری کے دور میں مجھے ادبِ لطیف کے لئے تھوڑا بہت کام کرنے کا موقعہ ملا۔ان

کے پچپن سالہ نمبر کے لئے میں نے بطور خاص محنت کی تھی۔لاہور میں کئی بار ان سے ویسے بھی ملنا رہا۔ملنسار خاتون ہیں۔جرمنی آنے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان سے رابطہ رہتا ہے۔ادبِ لطیف کی ویب سائٹ اردوستان کے زیر اہتمام میں نے جاری کرائی تھی۔کاشف صاحب کی مہربانی ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ادبِ لطیف کی تاریخ ترقی پسند تحریک کی حمایت سے عبارت رہی ہے۔تاہم اس کی گولڈن جوبلی تقریب کی صدارت قدرت اللہ شہاب سے کرائی گئی اور انہوں نے اپنی تقریر میں ادبِ لطیف کے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پرانے دکھ بیان کئے اور ادارہ کا شکریہ ادا کیا کہ اب انہیں اتنی عزت دی گئی ہے۔صدیقہ بیگم نے جرمنی میں مقیم ایک رائٹر خاتون سلمیٰ جبیں سید کا اتہ پتہ بھیجا اور انہیں اپنی دوست لکھا۔ان سے رابطہ ہوا۔میں انہیں وہ سلمیٰ جبیں سمجھتا رہا جو خواتین کے رسائل میں لکھا کرتی تھیں اور رضیہ بٹ کی طرح پاپولر ناولسٹ بھی تھیں۔ لیکن جب وہ میرے ہاں آئیں تو انہوں نے اس کی تردید کی۔لکھنے کا شوق انہیں ضرور رہا لیکن بنیادی طور پر براڈ کاسٹر تھیں۔قمر علی عباسی بڑے خوش مزاج انسان ہیں اور ان کے سفر نامے بھی ان کی شخصیت کی طرح خوشگوار ہوتے ہیں۔اپنے جرمنی کے سفر نامہ ''اور دیوار گر گئی'' میں انہوں نے ہم سب کا محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن ثریا شہاب اور سلمیٰ سید کے ذکر میں بین السطور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کچھ گراں سا گزرا۔ہم سب خطا کے پتلے انسان ہیں کوئی ادبی خامی ہو تو ضرور بیان کریں لیکن شخصی کمزوریوں کا ذکر محبت کے باب میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔بہر حال یہ تو یونہی بات سے بات نکل آئی۔قمر علی عباسی سے اور ان کی اہلیہ اور کسی زمانے کی معروف ٹی وی اسٹار نیلوفر عباسی سے دو تین بار ملاقات ہو چکی ہے۔دونوں میاں بیوی ایک بار جرمنی میں میرے گھر بھی تشریف لا چکے ہیں۔نیلوفر عباسی کی گفتگو میں یہاں مغرب میں مقیم کئی شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ ادبی شعور جھلکتا تھا جو میرے لئے حیران کن بات تھی۔دورانِ گفتگو نیلوفر عباسی نے جب یہ بتایا کہ آصف فرخی ان کے خالہ زاد بھائی ہیں تو ان کے ادبی شعور پر حیرت دور ہو گئی اور یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ وہ ایک علمی و ادبی خاندان کی فرد ہیں۔کراچی میں مقیم فردوس حیدر معروف افسانہ نگار ہیں۔ٹی وی کے لئے ان کی ایک دو سیریلز بھی کافی مقبول ہوئیں۔ان سے سلطان جمیل نسیم صاحب اور جمیل زبیری صاحب کے ذریعے رابطہ ہوا تھا۔کراچی میں دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ایک بار دہلی میں بھی جوگندر پال جی کے یہاں ملاقات ہوئی۔مجھے ان کی شخصیت میں ہمیشہ ایک نفاست اور وقار کا احساس ہوا۔ہم بہت زیادہ نہیں ملے لیکن جتنا ملے ہماری گفتگو نے ادب کے کئی تازہ موضوعات کو اپنے محیط میں لیا اور ہم نے ان پر بے تکلفانہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

سیدہ حنا جب پشاور میں تھیں اور وہاں سے اپنا رسالہ ابلاغ نکالتی تھیں، تب ان سے رابطہ ہوا۔میں اپنے سسرال پشاور گیا تو ان سے بھی ملنے کے لئے گیا۔حامد سروش اور سیدہ حنا دونوں اچھے لوگ تھے۔دونوں بہن بھائی مل کر ادب کی خدمت کر رہے تھے۔اچانک کہیں بیچ میں ماہیے کا مسئلہ شروع ہو گیا اور پھر کسی نہ کسی بہانے سے یہ

تعلق ٹوٹنا ہی تھا، سو ٹوٹ گیا۔پھر ہمارے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا۔ماہیے کی بحث کو ادبی سلیقے سے آگے بڑھا جا سکتا تھا لیکن اُدھر سے ایسی بے جا الزام تراشیاں ہوئیں کہ پھر ویسا ہی جواب دینا پڑ گیا۔ہمارے جھگڑے سے کئی جعلی یا کمزور شاعروں اور ادیبوں نے رسالہ ابلاغ سے فائدے سمیٹے۔بہر حال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔اب سیدہ حنا کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔آمین۔

نجمہ منصور سے ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ملاقات ہوئی۔مجھے اوراق میں پڑھتی رہتی تھیں۔انہیں دنوں ان کی نثری نظموں کا مجموعہ شائع ہونے والا تھا۔انہوں نے اپنی نثری نظمیں مجھے دیں اور ان پر تاثرات لکھنے کی فرمائش کی۔میں نے انہیں بتایا کہ میں نثری نظم میں شعری مواد کو تو مانتا ہوں لیکن اسے شاعری نہیں مانتا۔اس کے باوجود انہوں نے اصرار کیا کہ میں جیسے چاہوں اپنی رائے کا اظہار کر دوں۔چنانچہ میں نے مناسب طور پر اپنی رائے لکھ دی، اسے انہوں نے اپنی اولین کتاب ''میں سپنے اور آنکھیں'' میں شامل کر لیا۔میرا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' چھپا تو انہوں نے سرگودھا میں کسی ادیب سے لے کر پڑھا اور پھر مجھے ایک خط لکھا جس میں مبارک باد اور خوشی کے اظہار کے ساتھ میری شاعری پر دلی تاثرات کا اظہار کیا۔

روشن آرا نزہت لاہور میں پنجاب سیکریٹریٹ میں شعبہ اطلاعات میں سیکشن آفیسر تھیں۔جنرل ضیاالحق کا آمرانہ دور تھا۔ملک میں سرِ عام کوڑوں کی سزاؤں اور دوسری اسی طرح کی تعزیرات کے ذریعے اسلام کی ایسی خوفناک صورت پیش کی جا رہی تھی جو مغربی دنیا کے وقتی مفادات پورے کرنے کے ساتھ آج خود مغربی دنیا کے اعتراضات کی زد میں ہے اور جس کی قیمت پاکستان ابھی تک ادا کر رہا ہے۔میں جدید ادب کو کتابی صورت میں ہر دو ماہ کے بعد چھاپ رہا تھا۔سنسر شپ لگی تو پرچہ سنسر کرانے کے لئے متعلقہ آفس میں گیا۔وہاں کی کرتا دھرتا روشن آرا نزہت تھیں۔مجھے ڈر تھا کہ کتابی سلسلہ دیکھ کر بندش کا حکم ہی نہ ہو جائے لیکن وہ بہت شفیق انداز سے ملیں۔اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ میں خانپور جیسے شہر میں بیٹھ کر ایسا کام کر رہا ہوں۔انہوں نے رسالے کی جڑی ہوئی کاپیوں کو سرسری نظر سے دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض سیاسی مواد تو نہیں ہے۔اور میری وضاحت پر انہوں نے اسی وقت پرچہ کی سنسر شپ کا مرحلہ کلئیر کر دیا۔جبکہ عام طور پر کتابوں اور رسالوں کی کلیرنس کے لئے ایک دو دن کے بعد کا وقت دیا جاتا تھا۔وہ خود ناول نگار تھیں اور نظمیں بھی لکھتی تھیں۔میرے ساتھ ان کی خصوصی توجہ اور جدید ادب کے معاملہ میں بہت زیادہ رعائت کا علم سرگودھا کے ادبی دوستوں کو بھی تھا۔چنانچہ شاید اس کو ٹھیک سے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوا کہ راغب شکیب نے اپنے سفر نامہ ''سفر ہم سفر'' میں خانپور کے حلقۂ ادب کا ذکر کرتے ہوئے روشن آرا نزہت کو بھی خانپور کی ناول نگار شمار کیا۔یہ بات جب روشن آرا کو معلوم ہوئی تو خوش ہوئیں کہ چلو آپ لوگوں کے شہر میں شمار کی گئی ہوں۔روشن آراء نزہت جہاں بھی ہوں خدا انہیں خوش رکھے۔

راغب شکیب کے ذکر سے سیما شکیب یاد آگئیں۔ان کی شادی ہونے سے پہلے ہی سیما سے میرا رابطہ تھا۔وہ جدید ادب میں چھپا کرتی تھیں۔جب دونوں کی شادی کی خبر ملی تو بہت خوشی ہوئی۔پھر ان میاں بیوی سے سرگودھا میں بھی ملاقات ہوئی اور یہ لوگ ربوہ میں بھی مجھے ملنے آئے۔وہاں میں نے اپنے گھر پر ہی چند ادبی دوستوں کو بھی مدعو کرلیا تھا۔ڈاکٹر پرویز پروازی نے راغب کے سفرنامہ پر مضمون پڑھا تھا۔سیما شکیب بطور شاعرہ چونکاتے ہوئے ابھری تھیں۔ان کی غزل تمام عام اور خاص شاعرات سے کچھ الگ دکھائی دیتی تھی۔

نہ میں کسی کی نہ کوئی مِری سہیلی تھی ہر ایک کھیل میں اپنے خلاف کھیلی تھی

لیکن شادی کے بعد گھر گرہستی نبھانے میں ان کی شاعری کی چمک ماند پڑتی گئی۔اگرچہ انہوں نے بعد میں بھی راغب کے ساتھ مل کر کافی ادبی کام کیا لیکن ان کی وہ تخلیقی چمک جو شروع کی غزلوں اور نظموں میں دکھائی دی تھی ،نہ صرف ارتقائی سفر نہ کرسکی بلکہ اسی مقام پر بھی نہ رہ سکی۔یہ صرف سیما کا مسئلہ نہیں ہے ہمارے معاشرے میں خواتین کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی وجہ سے کئی باصلاحیت خواتین اپنی خداداد صلاحیتوں کا پورا اظہار کر ہی نہیں پاتیں۔اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ سیما شکیب اردو شاعرات میں اپنی الگ جگہ رکھتی ہیں۔

پروین عاطف سے میرا قلمی رابطہ تھا لیکن آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا تھا۔افسانے بھی اچھے لکھتی ہیں لیکن مجھے ان کے سفرنامے زیادہ اچھے لگے۔اب کالم نگاری بھی کرنے لگی ہیں۔ایک بار ایک محفل میں ان کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ یہ میں ہوں ۔میرے جانے کے بعد انہیں میرا علم ہوا تو افسوس کرنے لگیں۔ایک دو دوستوں سے بھی افسوس کا اظہار کیا کہ مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ میں حیدر قریشی ہوں۔لیکن میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ جن سے کافی سارا قلمی رابطہ تھا انہیں دیکھ بھی لیا تھا۔اور اب مجھے حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی ایک تقریب یاد آرہی ہے۔اس میں بعض مرد حضرات کے انداز گفتگو کے نتیجہ میں پروین عاطف نے شکوہ کیا کہ خواتین کا کچھ لحاظ کرنا چاہئے،حلقہ کے اجلاسوں میں خواتین پہلے ہی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔تب ممتاز مفتی نے اپنی روایتی شگفتگی کے ساتھ کہا تھا:لیکن آٹے میں سارا مزہ تو نمک کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔

امریکہ میں مقیم ریحانہ قمر کا بہت چرچا سننے میں آرہا تھا۔ان سے رابطہ ہوا تو ادبی حوالے کے علاوہ ذاتی طور بھی اچھا لگا۔میں نے ان کے ساتھ جرمنی میں ایک تقریب کا اہتمام کرڈالا۔ان کی کتاب ''ہم پھر نہ ملیں شاید'' ملی تو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ یہ تو پروین شاکر سے آگے کی کوئی شاعرہ ہیں۔جرمنی میں آئیں،تقریب ہوئی،رونق میلہ رہا۔۔۔بعد میں میری زندگی کی یہ ایک ادبی غلطی ثابت ہوئی۔جب میں ان کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کررہا تھا مجھے امریکہ سے افتخار نسیم نے ایک دو بار بتایا کہ یہ خود نہیں لکھتیں بلکہ لاہور میں عباس تابش انہیں لکھ کر دیتے ہیں۔میں ان کی بات نہیں مانا تو افتخار نسیم نے اتنا کہا دیکھ لینا بعد میں جب اصلیت سامنے آگئی تو خود ہی پچھتاؤ گے۔اس بات کے معاملہ میں افتخار نسیم ولی ثابت ہوئے۔ان کی بات سچ نکلی۔ بعد میں اصلیت کھل

گئی۔جرمنی میں قیام کے دوران انہوں نے مجھ سے صرف ایک شاعر کے بارے میں فرمائش کی کہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب جرمنی میں کرادوں۔اس کے لئے پانچ سوڈالر کی رقم دینے کی پیش کش بھی ازخود کردی۔(میں نے موقعہ پر ہی معذرت کرلی کہ اب ایسی تقریب کرانا مشکل ہے)۔پھر بھی انہوں نے غور کرنے کے لئے کہا۔میں نے بعد میں غور ضرور کیا لیکن اس بات پر کہ ریحانہ قمر نے صرف عباس تابش کے لئے ہی کیوں کہا؟

ایک اور بات جو مجھے کھٹکنے لگی۔۔۔جرمنی میں قیام کے پورے عرصہ میں بھی اور اپنے طویل دورانیہ کے ٹیلی فونز پر ہونے والی گفتگو کے دوران بھی انہوں نے کبھی ادب کی صورتحال پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ادبی اشوز کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔بس اپنی غزلیں سنا دیا کرتیں یا پھر دوسری گپ شپ۔میں ان کی غزل سنتے ہوئے پیچیدہ بحر کے باعث رُک رُک جاتا۔اتنی عروضی مہارت پر حیرت ہوتی۔اسی دوران میں نے ان کی ایک زمین میں غزل کہی۔ان کی چار اشعار کی غزل ان کے شعری مجموعہ''ہم پھر نہ ملیں شاید''میں شامل تھی۔میں نے اس زمین میں آٹھ شعر کہے۔میں عام طور پر جن بحور میں شعر کہتا ہوں یہ ان سے بالکل مختلف تھی اور سچی بات ہے اس بحر میں شعر کہتے ہوئے مجھے پسینے آگئے لیکن میں نے سارے کے سارے اچھے شعر نکالے۔

جو بس میں ہے وہ کرجانا ضروری ہوگیا ہے تری چاہت میں مرجانا ضروری ہوگیا ہے

درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں خزاں رُت کا گزرجانا ضروری ہوگیا ہے

نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اس دل پہ حیدرؔ پرانے زخم بھرجانا ضروری ہوگیا ہے

جب یہ غزل محترمہ کو سنائی تو انہوں نے اسے اتنا رواروی سے لیا کہ میں حیران رہ گیا۔جس نے خود اس بحر کو نبھایا ہو اُس کی تو دوسرے کے ہر شعر کے ایک ایک لفظ پر نظر ہوتی ہے کہ اس نے کیسے اسے ادا کیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہی غزل میں نے عباس تابش کو سنائی ہوتی تو وہ اس کے معائب اور محاسن کو ساتھ ساتھ دیکھتے جاتے۔شاعر اور غیر شاعر کے فرق کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب مجھے عباس تابش کا شعری مجموعہ''چاند کسی سے مت کہنا''مل گیا۔قطع نظر اس سے کہ ریحانہ قمر کے نام کے قمر اور عباس تابش کے مجموعہ کے چاند میں کسی روحانی نسبت کا اشارہ تو نہیں ہے؟،مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عباس تابش کی پسندیدہ بحور(جو میرے لئے کافی مشکل بحور ہیں۔شاید ہر شاعر کے اپنے مزاج سے ان بحور کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے)اور ریحانہ قمر کی بحور اصل میں دونوں ایک ہیں۔مجھے یاد آرہا ہے کہ انہیں دنوں میں غالباً لاہور کی کسی تقریب کی رپورٹنگ میں یہ بات آئی کہ ریحانہ قمر کی شاعری میں نسوانیت ملتی ہے۔اور افتخار نسیم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہم نہ کہتے تھے کہ عباس تابش کی شاعری میں نسوانیت پائی جاتی ہے۔

انہیں دنوں میں لالی چودھری کا ایک خط تخلیق لاہور میں شائع ہوا۔اس میں نام لئے بغیر بتایا گیا تھا کہ ایک شاعر نے ایک بھری محفل میں خود بتایا کہ مجھے فلاں خاتون نے اتنے ڈالرز دیئے ہیں کہ میرے لئے

شاعری لکھو بھی اور اسے کتابی صورت میں چھپوا بھی دو۔ میں نے ان شاعر اور شاعرہ کے بارے میں لالی چودھری اور نیر جہاں دو ذرائع سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ ''شاعرہ'' ریحانہ قمر ہیں اور جس پاکستانی شاعر نے انکشاف کیا وہ عباس تابش ہیں۔ نیر جہاں نے تو یہ بھی بتایا کہ جب میں نے عباس تابش کو اس ادبی بد دیانتی سے روکنا چاہا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں یہ کام نہیں کروں گا تو ریحانہ کسی اور شاعر سے یہی کام کرا لے گی۔ اس لئے مجھے ہی چار پیسے کما لینے دیں۔ اور اب تو صرف عباس تابش ہی نہیں ہمارے ادب کے کتنے ہیں اچھے اور شاندار شعراء اس بُرے کام میں لگ گئے ہیں۔ اور مغربی دنیا میں اردو کی نئی بستیاں زیادہ تر اسی طرح بسی ہوئی ہیں۔ جو گنتی کے چند اچھے اور جینوئن لکھنے والے ہیں وہ ایسی بستیوں سے پرے اپنی ذات کے ویرانوں میں ادبی مراقبہ کر رہے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر جب واضح ہو گیا کہ محترمہ خود شعر نہیں کہتیں تب میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ کو یا تو اپنی ہی بحور میں موقعہ پر قافیہ ردیف کی تبدیلی کے ساتھ وزن میں شعر کہنے کے ٹیسٹ سے گزرنا چاہیئے یا پھر دوسروں سے لکھوا کر کتابیں چھپوانے کا سلسلہ بند کرنا چاہیئے۔ ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں نے آپ کے بارے میں جو مضمون پڑھا تھا اسے کہیں نہیں چھپوایئے وگرنہ مجھے معذرت کے ساتھ اعلان کرنا پڑے گا کہ اسے اب ترمیم کے ساتھ اصل شاعر عباس تابش کی شاعری پر میرا مضمون شمار کیا جائے۔ مغربی ممالک میں شاعر بن جانے والے بہت سارے شعرا اسی طرح کے ہیں۔ اس المیہ کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ ایک تو یہاں اصل اور نقل کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ دوسرے سارے جعلی شعراء اپنے مالی وسائل کے بل پر اپنے ''شاعر گروں'' اور دوسرے چاہنے والوں کے ذریعے پھر خود اور یجنل شعراء کے خلاف گند اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسئلے کا آسان حل یہی ہے کہ جو لوگ مغربی دنیا میں بس جانے کے بعد ادھیڑ عمر میں جا کر یکا یک شاعر بن گئے ہیں ان سب کا پاکستان اور انڈیا میں جانے پر ایک ٹیسٹ لیا جائے جس میں صرف اتنا دیکھا جائے کہ یہ وزن میں شعر کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ ایسا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اب ادب سے متعلق سرکاری اداروں میں بھی ایسے جعلی شعرا کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہونے لگی ہے۔ یوں مختلف حکومتی شعبوں میں کرپشن کی جو داستانیں گزشتہ نصف صدی سے بنتی آ رہی ہیں ان کی طرح اب ادب کے حکومتی شعبہ میں بھی ایسی کرپشن پھیلتی جائے گی۔ ریحانہ قمر اگر واقعی خود شعر کہتی ہیں اور ان کا اوریجنل شاعرہ ہونا ثابت ہو جائے تو میں نہایت شرمندگی کے ساتھ ان سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن جو موجودہ صورت ہے اس کے مطابق وہ قطعاً شاعرہ نہیں ہیں اور انہیں ان بحور میں تو شعر کہنے کا پتہ ہی نہیں جو اِن کے شعری مجموعوں میں شامل ہیں۔ ریحانہ قمر کے اس ذکر میں ان تمام شاعرات کو شمار کر لیا جائے جو جرمنی، انگلینڈ، امریکہ اور کینیڈا میں انہیں کی طرح یا پھر بے وزن، شعری مجموعے چھپوا چکی ہیں یا چھپوا رہی ہیں۔

ریحانہ قمر کے ذکر کے ساتھ افتخار نسیم کا ذکر ہوا ہے تو یہاں ان کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ مجھے

شروع میں ان کے جسمانی مسئلہ کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ جرمنی میں میرے ہاں آئے تو انہیں میں نے شادی کی تقریب میں مردانہ حصہ میں ٹھہرایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انسانیت میں مرد اور عورت کی بجائے تیسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس صنف میں بھی کہیں دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک مردانہ مخنث اور ایک زنانہ مخنث۔ افتخار نسیم کا تعلق موخر الذکر سے ہے۔ سو یوں خواتین شاعرات کے ذکر میں بھی انہیں شامل کیا جا سکتا ہے اور مرد شعرا کے ذکر میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس طبقہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میں اس طبقہ کے دوہرے استحقاق کا حامی ہوں۔ افتخار نسیم جو اب افتی نسیم کے نام سے مقبول ہیں اس لحاظ سے بہت بہادر ہیں کہ اپنے پاکستانی ماحول کی سماجی گھٹن اور منافقت کے باوجود انہوں نے اپنی نام نہاد مردانگی کا بھرم رکھنے کی بجائے کھل کر اپنی جسمانی حقیقت کو بتا دیا۔ اس پر ان کے خاندان میں کہرام برپا ہوا۔ ان کی ماں جیسی بڑی بہن نے انہیں خط لکھا کہ مجھے بتاؤ کس نے تمہیں اس راہ پر ڈالا ہے میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ تب افتی نے اپنی بہن کو جواب میں کچھ ایسا لکھا کہ مجھے جس نے ایسا بنایا ہے ہمارے ہاتھ اس کے گلے تک نہیں پہنچ سکتے، صرف اس کے سامنے دعا کے لئے اُٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ مجھے شروع میں افتی کے مسائل کا اندازہ نہیں تھا اس لئے میں انہیں ایک عام مرد ادیب کی طرح لیتا تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ کچھ نوک جھونک بھی رہی لیکن جیسے ہی مجھے اصل بات کا علم ہوا مجھے اپنی ساری نوک جھونک کا افسوس ہوا اور افتی سے کسی قسم کا لفظی الجھاؤ بھی اچھا نہ لگا۔ ہاں ویسے میں ان کے ساتھ ہلکی پھلکی جملہ بازی کر لیتا ہوں لیکن دلی احترام کے ساتھ۔ اپنے کڑے جسمانی، نفسیاتی اور سماجی مسائل سے گزرتے ہوئے افتی نے تخلیقی اظہار سے اپنی شخصیت کو سنبھالا دیا ہے اور ایک بڑی، کڑوی سچائی کا اظہار کر کے معاشرتی منافقت کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔ اپنے مخصوص موضوع کے حوالے سے افتی کو امریکہ کے بعض نصابوں میں بھی جگہ مل گئی ہے جو بہر حال اس کی کامیابی ہے۔

لندن میں عطیہ خان سے ملاقات ہوئی، بزرگ اور بھلی خاتون ہیں۔ مختلف نثری اصناف میں طبع آزمائی کرتی رہتی ہیں۔ ان سے بعض اصناف خلط ملط بھی ہو جاتی ہیں۔ اپنی ہلکی پھلکی تحریروں کو انشائیہ لکھ دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا تو اس میں کام کی چیز وہ تحریر تھی جس میں انہوں نے اپنی داستان بیان کی تھی۔ بڑی پُر تاثیر تحریر تھی۔ اسے ادبِ لطیف لاہور نے بھی اپنی ایک اشاعت میں شائع کر دیا تھا۔ میں نے انہیں توجہ دلائی کہ اپنے افسانوں اور اس مضمون کے فرق کو دیکھیں اور اپنی داستان جیسی تحریریں اردو ادب کو عطا کریں۔

رضیہ اسماعیل سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اصلاً ان کا ذکر یادوں کی اس قسط میں ہونا چاہیئے تھا جس میں اَن دیکھے احباب کا ذکر ہے، لیکن شومئی قسمت کہ اس قسط میں ان کا ذکر کرنا بھول گیا۔ ان سے رابطے اور تعلق کی ایسی صورت ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر یادوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے خواتین سے متعلق اس قسط میں ہی ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ یوں بھی ہمارا باہمی رابطہ اتنا زیادہ رہا ہے کہ اسے براہِ راست ملنے جیسا ربط بھی کہا

جا سکتا ہے۔رضیہ اسماعیل انگلینڈ کی ان معدودے چند خواتین میں شمار ہوتی ہیں جو بیک وقت شعر بھی کہتی ہیں اور نثر بھی لکھتی ہیں۔طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھتی ہیں تو انہیں اسی حیثیت میں پیش کرتی ہیں،انشائیہ یا کوئی اور اس طرح کا لیبل نہیں لگاتیں۔غزل سے لے کر نثری نظم تک میں طبع آزمائی کر چکی ہیں اور ان سب کے الگ الگ مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔خواتین کی ادبی وثقافتی تنظیم آگہی کی سربراہ ہیں اور اس کے لیے متحرک بھی رہتی ہیں۔میرے لیے دو حوالوں سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ ہونے سے پہلے ماہیا نگاری شروع کر رکھی تھی اور مجھ سے تب رابطہ ہوا جب ان کا مجموعہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ان کے ماہیے اپنے ذائقے اور مزاج کے لحاظ سے مغربی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے دل کی آواز ہیں،شاید ایسی آواز جسے سب اپنے اندر سنتے ہیں لیکن سب ہی دوسروں سے چھپاتے ہیں۔صرف دو مثالوں سے ہی میری بات کو جانچا جا سکتا ہے۔

کڑوے ہیں سکھ ماہیا
کلچر کا رونا ہے

کس کو سنائیں اب
آ کے ولایت میں

انگلینڈ کے دُکھ ماہیا
اب کچھ تو کھونا ہے

رضیہ اسماعیل نے ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ بی بی سی ایشیا کے ذریعے اردو ماہیا کو متعارف کرایا۔نہ صرف ماہیا کو متعارف کرایا بلکہ میرا بھی وہاں سے ایک انٹرویو کرا دیا۔یہ انٹرویو بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی درمیانی شب کافی دیر تک جاری رہا۔اور دونوں صدیوں کا نکتۂ اتصال اس میں شامل رہا۔میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی اور یہ صرف رضیہ اسماعیل کے ذریعے ہو پایا تھا۔بعد میں بی بی سی ایشیا کے منتظمین مجھے فون کر کے مختلف شاعروں کے نام اور فون نمبرز مانگتے رہے۔یوں میں نے پاکستان اور انڈیا میں مقیم اپنے بہت سارے دوستوں کے بی بی سی ایشیا ریڈیو کے ذریعے براہِ راست انٹرویوز کرا دیئے۔جن دوستوں کے انٹرویوز نشر ہوئے انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا تاہم انٹرویوز کے ہونے کو اپنے عظیم ادیب ہونے کا ثبوت نہیں بنایا۔صرف انڈیا سے دو دوستوں نے ایسا کیا اور ان کے ایسا کرنے پر مجھے شرمندگی ہوتی رہی جب وہ لکھ رہے تھے اور چھاپ رہے تھے کہ انڈیا سے صرف ہمارا براہِ راست انٹرویو ہوا ہے جبکہ اس دوران اور ان سے پہلے بھی کئی پاکستانی اور انڈین اردو شاعروں،شاعرات کے انٹرویوز ہو چکے تھے اور میرے ہی ذریعے ہو چکے تھے۔میری شرمندگی دہری تھی کہ ان کے فخریہ اعلان چھپنے کے بعد میں انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا دعویٰ غلط ہے اور دوسری طرف جن دوستوں نے مجھے بتایا کہ ایسا دعویٰ کیا جا رہا ہے میں ان کے سامنے بھی سوائے شرمندگی کے اظہار کے اور کچھ نہ کر سکا۔جبکہ صرف ترنم ریاض کا دوبار انٹرویو ہو چکا تھا۔بہرحال اس سارے اچھے کام کے عقب میں بنیادی کردار رضیہ اسماعیل کا تھا۔پی ایچ ڈی کرنے کے بعد رضیہ اسماعیل اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بن چکی ہیں،تاہم میں انہیں لیڈی ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کہتا ہوں۔

فرزانہ خان نیناں انگلینڈ کے شہر نوٹنگھم میں رہتی ہیں۔ایک بار جرمنی کے کسی مشاعرے میں شرکت

کے لئے آئیں تو میرے ہاں بھی آئیں۔ان کے شوہر اختر خان بھی ساتھ تھے۔پھر جب ایک بار میں انگلینڈ کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گیا تو دونوں میاں بیوی لندن آئے،مجھے اپنے شہر لے گئے،وہاں ایک چھوٹی سی تقریب برپا کر ڈالی اور پھر کانفرنس میں بھی شرکت کر کے ساتھ رہے۔میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ نام میں سے نیناں کو حذف کر دیں لیکن انہوں نے میرا مشورہ قبول نہیں کیا۔اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔شاید میرا مشورہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ایک بار انہوں نے اپنی پسند کے گانوں کی ایک کیسٹ خود ریکارڈ کر کے مجھے تحفتاً بھیجی۔ان گانوں میں ایک گانا موسیقار روی کی اپنی آواز میں تھا جسے میں ایک عرصہ سے تلاش کر رہا تھا۔وہ کیسٹ میں نے ابھی تک سنبھال رکھی ہے۔کچھ عرصہ سے ان کی شاعری میں ان کے معمول سے زیادہ پختگی آنے لگی ہے جو ظاہر ہے ان کی شعر و ادب سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔کچھ عرصہ ایک ٹی وی چینل سے بھی وابستہ رہیں۔ایک ادبی پروگرام کرتی تھیں جس میں کئی کال کرنے والے مزے سے بے وزن اشعار بھی سناتے۔لیکن بے وزن شعر سنانے والے تو ہر چینل پر کال کرتے سنائی دیتے ہیں۔شاید فرزانہ خان کے پروگرام میں ان کا تناسب نسبتاً کم ہی رہا۔

پروین شیر کینیڈا میں ایک طویل عرصہ سے مقیم ہیں۔(اس طویل عرصہ سے ان کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کریں۔ملاقات پر سارے اندازے غلط ثابت ہوں گے)ان سے چند برسوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ تھا۔ستیہ پال آنند نے بھی ان کی تعریف کی تھی۔شاعرہ ہونے کے ساتھ مصورہ بھی ہیں اور موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔انہیں شاعرہ،مصورہ اور موسیقار کہا جا سکتا ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''کرچیاں'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ڈاکٹر کرسٹینا نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اس کتاب کی تقریب کی۔تقریب کے بعد پروین شیر اور ان کے شوہر وارث شیر میرے گھر آئے،دو تین دن ہمارے ہاں رہے۔ان کی کتاب دیکھی تو دیکھتے ہی رہ گئے۔سائز کے بارے میں پروین بتا رہی تھیں کہ اسے ''کافی ٹیبل بک'' کہتے ہیں۔میں نے کہا کہ یہ تو کافی ٹیبل سے بھی کافی بڑے سائز کی بک لگ رہی ہے۔بہرحال اس کتاب میں ان کی اردو شاعری کے ساتھ انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے اور ہر نظم یا غزل کے ساتھ موضوعاتی اعتبار سے میل کرتی ہوئی ان کی اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ دی گئی ہے۔یوں یہ کتاب اردو اور انگریزی کے قارئین کے ساتھ مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ بھی حاصل کرتی ہے اور اپنی پیش کش کے لحاظ سے واقعتاً ایک منفرد تجربہ ہے۔پروین شیر کی کامیابیوں کے پیچھے ان کے شوہر پروفیسر وارث شیر کی حوصلہ افزائی کا بڑا عمل دخل ہے۔پروین شیر کا خاندانی پس منظر بھی علم و ادب سے منور ہے۔شکیلہ اختر اور اختر اورینوی دو بڑے حوالے ہیں جو ان کے خالہ،خالو تھے۔

اور اب کچھ ذکر فرحت نواز کا۔خانپور میں جدید ادب کے سات آٹھ برس ہم نے مل کر رسالہ نکالا تھا۔فرحت کی شاعری میں ایک انوکھی چمک تھی۔میرا خیال ہے شعر کہنے کے لئے جس انسپائریشن کی ضرورت ہوتی ہے،ہم ایک دوسرے کے لئے ویسی انسپائریشن رہے ہیں۔اس کا اندازہ پہلی بار تب ہوا جب ملتان یونیورسٹی کے شعبہ اردو

نے ہم دونوں کے ساتھ ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ہمیں باری باری بلایا جا رہا تھا۔میں کچھ غزلیں سنا کر جاتا، پھر فرحت سے کچھ سنا جاتا۔دو تین بار ایسا ہوا تو لگا کچھ سوال جواب جیسی صورت خوامخواہ بن رہی ہے۔رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب فرحت نے میرے بعد آتے ہی اپنی نظم شروع کر دی ''مجھ کو اوورٹیک نہ کرنا''۔اور ان کی نظم کے بعد ڈاکٹر انوار احمد نے کچھ دلچسپ سے جملے کہہ دیئے۔فرحت کے ساتھ تب تک رابطہ رہا جب تک جدید ادب جاری رہا اور میں خانپور میں رہا۔جب رسالہ بند ہوا تو میں خانپور شہر کو چھوڑ کر گوجرانوالہ، ربوہ، لاہور اور ایبٹ آباد تک بھٹکتا پھرا۔اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔تب تک وہ ایم اے اکنامکس اور ایم اے انگریزی کرنے کے بعد انگریزی کی لیکچرر ہوگئی تھیں۔پھر ایک بار پتہ چلا کہ انہوں نے شادی کر لی ہے اور اپنی شادی کی تصویریں میرے لئے بھیجی ہیں۔افسوس میں ان کی انڈونیشین نژاد سہیلی ایڈا (سعیدہ) تک دیر سے پہنچا۔وہ کافی انتظار کے بعد فرحت کو ان کی وہ البم واپس بھیج چکی تھیں جو میرے لئے بھیجی گئی تھی۔اس کے بعد وہ اپنی لیکچررشپ اور ازدواجی زندگی میں مصروف ہوگئیں اور ادب پس پشت چلا گیا۔کبھی کبھار ادھر اُدھر سے خبر مل جاتی کہ اب وہ دو بچوں کی ماں بن چکی ہیں۔

اسی دوران جب بہاولپور یونیورسٹی میں میرے بارے میں تحقیقی کام شروع کیا گیا تو مقالہ نگار بچی نے میرے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے سوالنامہ تیار کیا، جو کہیں فرحت کو بھی پہنچایا گیا۔تیرہ دوستوں اور عزیزوں میں سے فرحت کے جواب سب سے پہلے مقالہ نگار کو موصول ہوئے۔فرحت نے نہ صرف بڑے خلوص کے ساتھ سوالات کے جواب دیئے بلکہ میری حیثیت سے کہیں زیادہ مجھے عزت دی۔یوں ہمارا رابطہ پھر سے بحال ہو گیا۔میرا بڑا بیٹا شعیب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان گیا تو فرحت کے گھر بھی گیا اور ان کی ساری فیملی سے مل کر آیا۔پھر طارق پاکستان گیا تو وہ بھی ان سب سے مل کر آیا۔میری خواہش تھی کہ فرحت پھر سے تخلیقی طور پر متحرک ہوں، وہ بھی ایسا چاہنے لگی تھیں لیکن غالباً گھریلو اور تدریسی مصروفیات انہیں مہلت نہیں دے رہیں۔فرحت کے ساتھ میرے روابط میں لاگ اور لگاؤ دونوں تھے لیکن ان کے ساتھ سب سے اہم چیز ہمارا ایک دوسرے پر گہرا اعتماد اور رشتوں کے تقدس کا احترام تھا۔مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں نے اپنے رشتوں کی پاکیزگی کو کبھی بھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ان کے ساتھ رابطہ رہے یا نہ رہے لیکن ایک انسپائریشن اور ایک اعتماد کبھی کم نہیں ہوئے۔

فرحت نواز، پروین عزیز اور ثمینہ راجہ تینوں میرے آبائی علاقہ کی شاعرات تھیں۔فرحت کو جتنے مواقع میسر آئے انہوں نے عمدہ ادبی کام کیا۔پروین کے ساتھ کچھ میں نے اور کچھ قسمت نے اچھا نہیں کیا اور یوں ایک بہت اچھی شاعرہ سامنے نہ آسکیں۔ثمینہ کے حالات بھی کچھ ایسے موافق نہ تھے لیکن انہوں نے اپنے حالات سے خود ٹکر لی، قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور اب بہرحال وہ اردو کی ایک اچھی بلکہ بہت اچھی شاعرہ شمار کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

حیدر قریشی (جرمنی)

کھٹی میٹھی یادیں

چند پرانی اور نئی یادیں

سال ۲۰۰۸ء شروع ہوتے ہی مجھے یادوں کے حوالے سے ایک خوشی یہ ملی کہ میرے بچپن کے ہم جماعت اے کے ماجد کا اچانک ٹیلی فون آ گیا۔اے کے ماجد کا تھوڑا سا ذکر ''میری محبتیں'' کے ''پرانے ادبی دوست'' میں موجود ہے۔عبدالخالق ماجد کو اے کے ماجد بنانے میں میرا مشورہ بھی شامل تھا۔ہم چھٹی جماعت سے ایک ساتھ ہوئے اور خانپور میں قیام تک ہمارا باہمی ملنا جلنا رہا۔سکول کے زمانے میں ان کی کھیتی باڑی والی زمین اور ان کا گھر خانپور کی شہری حد کے ساتھ ملحق تھا۔اب تو وہ سارا علاقہ بھی خانپور کی شہری حد میں آ چکا ہے۔شہر سے جڑے ہوئے اُس گاؤں میں ہم دونوں درختوں کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرتے۔اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم ذہنوں سے سوچی ہوئی باتیں کرتے۔ہمارے کوئی لمبے چوڑے خواب نہیں تھے۔زندگی جیسے گزر رہی تھی ہم دونوں اسی میں خوش تھے۔اے کے ماجد کے والد اور والدہ دیہاتی مزاج کے شفقت اور محبت بھرے کردار تھے۔پھر ان کے والد اور والدہ کا انتقال ہوا تو حالات میں تبدیلی آئی۔اے کے ماجد نے قومی بچت کے مرکز میں جاب کر لی تھی۔وہ جاب اب بھی قائم ہے۔اے کے ماجد نے ماڈل ٹاؤن کے قریب کی نئی آبادی میں پلاٹ لے لیے تھے۔وہاں گھر بنا لیا تھا اور گھر بسا بھی لیا تھا۔اے کے ماجد کے دیہات والے گھر میں ہم لسی پیا کرتے تھے تو ماڈل ٹاؤن کی حد سے جڑے ہوئے گھر میں ہم کافی پیا کرتے تھے۔دودھ پتی کی طرز پر ہم دودھ کافی بناتے تھے اور اسے پی کر دونوں ہی خود کو کسی حد تک نئے زمانے کا فرد سمجھتے تھے۔حالانکہ ہم دونوں ایک حد تک دیہاتی اور ایک حد تک شہری تھے۔اب سوچ رہا ہوں کہ اے کے ماجد ہمیشہ شہر اور ماڈل ٹاؤن سے الگ لیکن قریب کیوں رہا ہے؟۔۔۔وہ خود شہر یا ماڈل ٹاؤن کا حصہ نہیں بنا بلکہ اس کے کنارے پر آباد ہو کر پھر اُسے اپنے اندر جذب کر لیا۔شاید اس کی یہی خوبی ہماری دوستی کا لاشعوری سبب بنی رہی اور یہی رویہ میرے اندر پروان چڑھتا رہا جو اب خود میرے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔بہرحال اے کے ماجد کا فون آیا تو پہلی بار عدؔم کا یہ شعر روح کی گہرائی تک مزہ دے گیا۔

اے دوست کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اے کے ماجد کے فون کے ساتھ ایک اور فون بھی اچانک آ گیا۔ یہ تھے خانپور کے ظفر اقبال ماچے توڑ۔ضیاع الحقی دور کے حوالے سے ''آئین سے انحراف'' جیسی کتاب لکھنے والے ظفر اقبال ماچے توڑ کے ساتھ ایک دو بار پہلے بھی ٹیلی فون پر رابطہ ہو چکا تھا تاہم اس بار طویل عرصہ کے بعد ان کا فون آیا تو اچھا لگا۔مزید کمال یہ ہوا کہ سعید شباب کی ہمت کے نتیجہ میں جمیل محسن کے ساتھ بھی رابطہ ہو گیا۔جمیل محسن ہمیشہ جیسا خوش مزاج تھا۔ ڈاکٹر نذر خلیق،سعید شباب اور ارشد خالد کے ساتھ تو ویسے بھی ٹیلی فون پر مستقل رابطہ رہتا تھا۔البتہ آجکل ارشد خالد کے ساتھ رابطہ زیادہ رہتا ہے۔اب خانپور سے جمیل محسن کے فون کے بعد میرے ابتدائی دوستوں سے رابطہ کا ایک دور مکمل ہو گیا ہے۔

ایک بار کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے مجھے لگا کہ ابھی باتھ روم میں جا کر پیشاب کر کے آتا ہوں۔لیکن میرے اُٹھنے سے پہلے ہی خانپور سے نذر خلیق کا فون آ گیا۔میرا خیال تھا بات جلد مکمل ہو جائے گی لیکن نذر خلیق لمبی بات کرنے کے موڈ میں تھے۔میں نے تار کے بغیر والا فون اُٹھایا ہوا تھا،اسے دائیں کندھے اور کان سے ٹکا کر میں باتھ روم میں چلا گیا۔گھر پر عام طور پر سلوار قمیص پہنتا ہوں۔سوکموڈ کی وجہ سے سلوار اتار کر ہی بیٹھتا ہوں۔میں نے سلوار اتارنے،پیشاب کرنے،طہارت کرنے،پھر سے سلوار پہننے اور ہاتھ دھونے تک سارے مرحلے آسانی سے طے کر لیے۔۔۔اس دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔لیکن سلوار کا ازار بند ''آزارِ جاں'' بن گیا۔اب یہ مضحکہ خیز صورتحال تھی کہ میں ایک ہاتھ سے ٹیلی فون تھامے نذر خلیق کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے سلوار کے ازار بند کو تھامے باتھ روم سے باہر نکلا۔مبارکہ کو اشاروں میں کہا کہ میرا ازار بند باندھ دیں۔مبارکہ نے اس ناگہانی اور تماشہ صورتحال پر بڑبڑاتے ہوئے ازار بند باندھ دیا لیکن ان کی بڑبڑاہٹ اتنی بلند آہنگ تھی کہ نذر خلیق نے فون پر ہی پوچھ لیا: کیا بات ہے لگتا ہے بھابی کسی بات پر غصہ کر رہی ہیں؟
میں نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر انہیں ساری بات بتا دی،نتیجتاً ان کے ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔اسی ہنسی کے دوران ہی انہوں نے کہا کہ جب چار پانچ سال کے بچوں والے کام کرائیں گے تو اس عمر کے بچوں کو جیسی ڈانٹ پڑتی ہے ویسی ڈانٹ تو لازماً پڑے گی۔

تار کے بغیر والے ٹیلی فون کے فوائد کے ساتھ اب اپنے کمپیوٹر کے ''بغیر تار والے'' کی بورڈ اور ماؤس کا بھی کچھ ذکر ہو جائے۔یہ کمپیوٹر ابھی نیا لیا ہے۔میرے چھوٹے داماد عادل نے اس کی ساری انسٹالیشن مکمل کر کے مجھے اس کی سہولیات کے بارے میں جب یہ بتایا کہ میں کی بورڈ اور ماؤس کو لے کر کمپیوٹر والی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے کے صوفہ پر آرام دہ طریقہ سے بیٹھ کر اور کی بورڈ کو گود میں لے کر بھی سارا کام کر سکتا ہوں تو مجھے اس سہولت نے بڑا خوش کیا۔میں نے ایک بار صوفہ پر بیٹھ کر اردو میں لکھنے کا تجربہ کیا۔دوسری بار صوفہ پر اُلٹا لیٹ کر اور کی بورڈ اور ماؤس کو سامنے رکھ کر اردو لکھنے کا کام کیا۔دونوں تجربے پھر مبارکہ کے سامنے دہرائے۔وہ جو

میرے کمپیوٹر والے کمرہ کو ویسے ہی سوتن کا کمرہ کہتی ہیں،ان تجربوں پر صرف مسکرا کر رہ گئیں۔دراصل یہ نیا کمپیوٹر مجھے میری ۵۶ویں سالگرہ پر مبارکہ نے ہی تحفہ کے طور پر لے کر دیا ہے۔

''بغیر تار والے'' کی بورڈ اور ماؤس کی سہولت اس وقت میری دسترس میں ہے تو اپنا تجربہ لکھ دیا ہے،وگرنہ لیپ ٹاپ میں یہ سہولت اس سے بھی زیادہ مزے کے ساتھ میسر ہے۔لیکن مجھے ابھی تک لیپ ٹاپ لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔موبائل ٹیلی فونز میں اب ایسی سہولت بھی آ گئی ہے کہ موبائل آپ کی جیب میں پڑا ہے اور آپ تنہا،راہ چلتے،ہاتھ اپنی جیب میں ڈالے،کسی کے ساتھ گپ شپ کرتے چلے جا رہے ہیں۔چند برس پہلے کوئی عام دیکھنے والا یہ منظر دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ شاید کوئی نیم خبطی ہے جو خود کلامی کرتا جا رہا ہے۔اب کوئی نیم خبطی بھی اس انداز میں جاتا دکھائی دے تو یہی خیال آئے گا کہ کوئی موبائل پر کسی کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

چند روز قبل جرمنی کے دو شاعر دوست ظفر اللہ محمود اور طاہر عدیم مجھے کہہ رہے تھے کہ برلن میں ایک مشاعرہ ہے،اس میں شرکت کے لیے چلیں۔میں نے مشاعرہ بازی سے پرہیز کی اپنی مجبوریاں بتائیں۔پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے وضاحت کی کہ بھائی!ان مشاعروں سے اردو کی جو بین الاقوامیت بنی ہے سو بنی ہے،مجھے تو اب عالمی کانفرنسوں اور سیمینارز کے حقیقی نتائج پر بہت سے تحفظات ہیں۔نشستند،خوردند،برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ سامنے آیا ہو تو بتایا جائے۔پھر مجھے وہ کانفرنسیں اور سیمینارز یاد آنے لگے جن میں مجھے مدعو کیا گیا لیکن میں نے شرکت سے معذرت کر لی۔سجاد ظہیر صدی کی تقریبات کے حوالے سے ان کی صاحبزادی نور ظہیر نے بذاتِ خود مدعو کیا،ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو ہند کی صد سالہ تقریب کے ضمن میں مدعو کیا،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اردو کی نئی بستیاں کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں مدعو کیا،ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے استنبول یونیورسٹی کے سیمینار میں مدعو کیا،لندن کی میلینئم کانفرنس کے منتظمین نے اس کانفرنس کے بعد کی کانفرنس میں مدعو کیا۔۔۔میں نے ان سب سے معذرت کی تھی۔وجہ؟۔۔۔تمام دعوت ناموں میں قیام و طعام وغیرہ امور کی ذمہ داری لی جاتی تھی لیکن ہوائی جہاز کا ٹکٹ ''بین الاقوامی ادیبوں'' کو اپنی جیب سے خریدنا تھا۔میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس لیے ادب کے ساتھ شرکت سے معذرت کر لیتا ہوں۔اور اس لیے قلبِ یورپ میں بیٹھ کر بھی پورے کا پورا مقامی شاعر اور ادیب ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ میں معروف معنوں میں ''بین الاقوامی ادیب'' نہیں ہوں۔

زندگی میں جن چند کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں ان کانفرنسوں میں بھی میری ترجیحات سادہ سی رہی ہیں۔ ماریشس کی کانفرنس کے الوداعی ڈنر(جو ملک کے نائب صدر کی جانب سے تھا)میں شرکت کی بجائے میں نے ماریشس کی ایک بچی کو اس کے گھر پر اردو ای میل بھیجنے کا طریقہ سکھانے پر وقت صرف کر دیا۔جبکہ دوسری طرف

الوداعی ڈنر میں ملک کے وزیراعظم اور نائب صدر شریک ہو رہے تھے۔اب بھی میں یہاں جرمنی کے کسی مشاعرہ میں شرکت کرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ کسی بچے کو اردو پروگرام کا شوق پیدا ہو جائے۔سو برلن کے مشاعرہ کی بجائے ایک دوست سجاد ساجن کی دو بیٹیوں عروج اور علینہ کو میں نے اردو پروگرام سے متعارف کرادیا ہے۔عروج کو تو اردو سیکھنے کا ویسے ہی بہت شوق تھا،چنانچہ اردو پروگرام کو سمجھنے کے بعد اسی وقت ایک گھنٹے کے اندر اس بچی نے ایک غزل ٹائپ کر کے پیش کر دی۔تاہم علینہ نے اس لحاظ سے بہت حیران کیا کہ اردو میں زیادہ دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود اسی وقت بہن سے کچھ سمجھا اور پھر اسی وقت اس نے بھی ایک غزل ٹائپ کر کے شاباش حاصل کر لی۔مجھے ایسے بچوں کی اردو سے دلچسپی یہاں کی روایتی مشاعرہ بازی سے بہت زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے۔

بہت زیادہ پُر امید نہ ہونے کے باوجود اپنی اگلی نسلوں کے ساتھ ذہنی فاصلہ کم کرنے کے لیے میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہلکی پھلکی کوشش کرتا رہتا ہوں۔پوتوں،پوتیوں اور نواسوں کو ایک ساتھ بٹھا کر ان کے والدین کے بچپن کے حوالے سے اپنی لکھی تحریروں کے اقتباس سناتا ہوں تو بچے بہت خوش ہوتے ہیں پھر اپنے ماں باپ سے پوچھتے ہیں: آپ نے سچ مچ ایسا کیا تھا؟ بات کی تصدیق ہونے پر پہلے سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ایک بار اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو ایک بچے نے کہا کہ آپ نے ہمارے بارے میں بھی ایسا کچھ لکھا ہے؟

میں نے ذہن پر زور دیا تو اپنے نواسے رُومی (مشہود) کا ٹی وی والا واقعہ یاد آ گیا جو یادوں کے باب ''گراموفون سے سی ڈی تک'' میں شامل ہے۔بچوں کو وہ واقعہ سنایا تو سب نہ صرف ہنسنے لگے بلکہ رُومی کو چھیڑنے بھی لگے۔دوسرے نواسے جگنو (مسرور) نے کہا کہ آپ نے رُومی کا ذکر کیا ہے،ہم باقی بچوں کا بھی ذکر کریں۔میں نے اسے بتایا کہ یادوں کے ایک باب ''رہے نام اللہ کا!'' میں اس کے اور پوتے شہریار کے ختمِ قرآن کا ذکر کیا ہوا ہے۔جب بچوں کو وہ حصہ پڑھ کر سنایا تو جگنو نے کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے،پر جیسا رومی کا واقعہ لکھا ہے ویسا ہونا چاہئے تھا۔جگنو کی معصومیت میں چھپی شوخی نے مجھے کافی مزہ دیا۔

میں موجودہ پاپولر میوزک سے بہت بور ہوتا ہوں،لیکن بچوں کو یہی زیادہ پسند ہے۔میں نے سوچا انہیں تھوڑا بہت پرانے گانوں کا بھی ذوق دیا جائے۔سو میں نے بچوں کے نک ناموں کی مناسبت سے چند گانے ڈھونڈ لیے۔مثلاً: پوتے شہری (شہریار) کے لیے۔۔

کوئی شہری بابو دل لہری بابو ہائے رے پگ باندھ گیا گھنگرو
میں چھم چھم نچدی پھراں۔

نواسے رُومی (مشہود) کے لیے۔۔ نار دانہ،انار دانہ۔۔
اساں رُومی ٹوپی والے نال جانا

شہری پہلے تو گانے پر غصہ کرتا تھا،پھر شرمانے لگا اور اب اس کا عادی ہو گیا ہے۔رُومی والا گانا سب نے پسند

کیا۔میرے سب سے چھوٹے نواسے شام (احتشام) کو یہ گانا زیادہ ہی پسند آ گیا۔اپنی توتلی زبان میں وہ گانا گنگنانے لگا تو رُومی کے نک نام کی بجائے اس کے اصل نام کو گانے میں فٹ کر دیا۔

''ناردانہ،انار دانہ۔۔۔مشہود ٹوپی والے نال جانا''۔

شام نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ یہ گانا اس کے بھائی رُومی (مشہود) کے لیے ہے،اس لیے اس کا کوئی بھی نام لیا جا سکتا ہے۔اب بچوں کو کیا پتہ کہ رُومی ٹوپی کس تہذیب کی علامت تھی۔شآم کے لیے میں نے ایک فلمی بھجن کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ سنا دیا۔

شآم! تیری بنسی کو بجنے سے کام
پاپا کا بھی شآم ہے تو ماما کا بھی شآم

جگنو کے لیے عالم لوہار کی جگنی سے کام چلانا پڑا اور سونو کے لیے سونی والا گانا تلاش کرنا پڑا۔لڑکے تو سارے خوش ہو گئے۔اب میری پوتی ماہ نور (ماہا) نے کہا کہ میرا گانا بھی لائیں۔اس پر لڑکوں نے مذاق میں ماہی لفظ والے بعض گانے بیان کرنا شروع کر دیئے۔لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں نے ماہا کے بارے میں خود ایک ماہیا لکھا ہے۔پھر وہ ماہیا اسے ماہیے کی لَے میں گنگنا کر سنایا:

مآہا مِری پوتی ہے
روتے ہوئے ہنستی
ہنستے ہوئے روتی ہے

اس پر چار سال کی مآہا بڑی خوش ہوئی اور سب کو اس ماہیے کی تشریح کر کے بتاتی پھرے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ایسا کرتی تھی اور دادا ابو نے یہ بات لکھی ہے۔علیشا اور ماہم ابھی بہت چھوٹی ہیں،وقت آنے پر وہ بھی اپنے حصہ کے ماہیے سن لیں گی۔

بچوں کے لیے مذکورہ گانوں کی تلاش میں مجھے انٹرنیٹ پر یوٹیوب میں جا کر وہاں سے پرانے پاکستانی اور انڈین فلمی گیتوں کے حصہ میں جانا پڑا۔وہاں ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ لنک ملتا گیا۔بچوں کے کام سے نمٹ کر میں خود بچہ بن گیا اور کئی نایاب اور بھولے بسرے گیتوں کو اپنی دسترس میں پا کر دیر تک ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔یوں ان گیتوں کے زمانوں سے جڑی ہوئی کئی ذاتی یادیں ذہن میں آتی رہیں،دل میں جگمگاتی رہیں اور آنکھوں میں جھلملاتی رہیں۔

مجھے پہلی دفعہ بڑی سطح پر تجربہ ہوا کہ ایسی یادیں کس طرح ہمارا کتھارسس کر دیتی ہیں۔

☆☆☆

امین خیال کے ماہیے

نئے کپڑے بدلتے ہیں
چادر سوکھ گئی
میلے کو چلتے ہیں

اب آئی ہولی ہے
تیری سہیلی تو
میری ہم جولی ہے

پانی کی کہانی ہے
خشکی اک حصہ
تِن حصے پانی ہے

کیا دیپک جگتے ہیں
میلے ولیوں کی
قبروں پر لگتے ہیں

کوئی آٹا چھنتا ہے
مال ہو پلے تو
پھر میلہ بنتا ہے

پانی اک نعمت ہے
جتنا زیادہ ہے
اتنی ہی ضرورت ہے

ارمان نکالیں گے
دن ہے بساکھی کا
ہم بھنگڑا ڈالیں گے

افکار میں کھو جائے
میلے میں جیسے
کوئی بچہ کھو جائے

بادل سے جھڑا پانی
رحمت بن بن کے
کھیتوں میں پڑا پانی

وہ ڈھول لگا بجنے
آئی بساکھی تو
گندم بھی لگی کٹنے

کیا بات نرالی ہے
فلک مزّین کی
ہر شب دیوالی ہے

پانی کی لو بوندیں
عیبوں کو دھودیں
اشکوں کی دو بوندیں

پھولا نہ سمایا ہے
دن شب قدر کا ہے
ساجن گھر آیا ہے

شب قدر کی راتاں ہیں
دل میں اندھیرا ہے
گھر بھر میں چراغاں ہے

کب دیتا نشانی ہے
وعدہ ساجن کا
بہتا ہوا پانی ہے

اس بار کی ہولی میں
مجھ کو چھو لینا
تم آنکھ مچولی میں

اس بار کی ہولی میں
وہ چلی جائے گی
ساجن کی ڈولی میں

تالاب کا پانی ہے
آج انسانوں کے
خوں کی ارزانی ہے

امین خیال کے ماہیے

پانی کی روانی ہے
جو چاہو کر لو
زوروں پہ جوانی ہے

ہر شے کو بہاتا ہے
شور مچاتا ہے
اور بہتا جاتا ہے

اس پانی گدلے کا
تم ہی کہو لوگو
کب موسم بدلے گا

دریاؤں میں پانی ہے
دکھ کی جہاں بھر میں
بس ایک کہانی ہے

جلوے ہیں بہاروں کے
کچھ تو محبت کے
کچھ ان کے نظاروں کے

رُت میں شادابی ہے
خوشیوں کا موسم
پھر بھی بے تابی ہے

دے پانی باغوں کو
چہروں سے دھو دے
موسم کے داغوں کو

طوفان کا ٹل جانا
سب کو مبارک ہو
موسم کا بدل جانا

کر بات بہاروں کی
چاندنی راتوں کی
اور جھلمل تاروں کی

چھانے ہیں پانی کو
سنتا نہیں کوئی
مری درد کہانی کو

سب پر چھا جاؤ گے
موسم بدلے گا
جب تم آ جاؤ گے

پروائی ہے پروائی
دھوپ کا بَل ٹوٹا
بجلی کی انگڑائی

حق سچ کی روانی ہے
جھوٹ وسیلہ تو
ٹھہرا ہوا پانی ہے

رستے گلزاروں میں
اپنی محبت کے
چرچے ہیں بہاروں میں

نیرنگیٔ عالم ہے
خوشیوں میں پنہاں
اک اور بھی موسم ہے

سبزہ اُگ آتا ہے
فلک سے جب پانی
مولا برساتا ہے

نشہ ہے گھٹاؤں میں
مستی بھرے بادل
چھائے ہیں فضاؤں میں

بچپن ہے، جوانی ہے
زندگی تو جیسے
بہتا ہوا پانی ہے

امین خیال کے ماہیے

تتلی کے رنگ ماہیا
موسم مستی کا
چل میرے سنگ ماہیا

پھولوں میں خاروں میں
فرق نہیں کوئی
پت جھڑ میں، بہاروں میں

موسم سج اُٹھتے ہیں
جب تم ہنستی ہو
چھینے بج اُٹھتے ہیں

سب ا، چڑی بچڑی ہے
موسم سرما کا
موٹھوں کی کھچڑی ہے

جلووں کے، نظاروں کے
مات ترے آگے
سب رنگ بہاروں کے

پھولوں کے کھلنے کا
موسم آیا ہے
ساجن ترے ملنے کا

رنگ بکھرے بہاروں کے
مست پھہاروں میں
گُل نکھرے بہاروں کے

بادل ہیں فضاؤں میں
تتلی بن کر جو
اُڑتے ہیں ہواؤں میں

چھاؤں ہے شیشم کی
جھولا تب جھولوں
جب پینگھ ہو پتیم کی

شیشم کی لکڑی ہے
وقت اُڑا دے گا
گردن، جو اکڑی ہے

آری پر آری ہے
پیڑ اور انساں کی
ازلوں سے یاری ہے

اشجار جلاؤ نہیں
یہ انسان نہیں
ان کو تو گراؤ نہیں

کوئی شجر ہرا ہوگا
فیض وہ پائے گا
جو دل کا کھرا ہوگا

پتے ہیں چناروں کے
تم بن بیتے دن
رنگین بہاروں کے

برگد کی چھاؤں میں
جھانجر بن جاؤں
پہنو جو پاؤں میں

کھلتا نہیں صحرا میں
برگد کا سایہ
ملتا نہیں صحرا میں

پیپل کی چھاؤں میں
جھانجر بول پڑی
گوری کے پاؤں میں

کلیوں کی سگائی ہے
خوشبو کی ڈولی
پتوں نے اُٹھائی ہے

امین خیال کے ماہیے

سنسار بلاؤں کا
شجر نپترے کو
ڈر کیسا ہواؤں کا

گندم کی بالی ہے
جاٹ کی محنت میں
سب کی خوشحالی ہے

گندم کی بالی ہے
گھر محنت کش کا
آٹے سے خالی ہے

کوئی کھیت ہے نرما کا
پھول ہوں صحرا کا
میں چاند ہوں سرما کا

کھیتوں پہ جوانی ہے
فصلوں کو دیکھو
رنگ دھانی دھانی ہے

فصلوں کی کٹائی ہے
کب مل پائیں گے
جاں پر بن آئی ہے

کھیتوں میں اٹ سِٹ ہے
میری اور اس کی
آپس میں گٹ مٹ ہے

باغوں میں مَینا ہے
پھول پریشاں ہیں
بلبل بے چینا ہے

ترا گجرا نت مہکے
باغِ محبت میں
تو پھولے، پھلے، چہکے

باغوں میں جھولے ہیں
خار جو اُبھرے ہیں
پودے بھی تو پھولے ہیں

بھٹی بھی تپاتے تھے
بابے جانی سے
دانے بھنواتے تھے

باغوں میں بچے ہیں
رنگ، خوشبو، غنچے
ہوتے ہی سچے ہیں

آ باغ میں آجانی
کب سے تڑپتا ہوں
صورت تو دکھا جانی

بلبل کے ترانے ہیں
بکھرے گلستاں میں
خوشیوں کے خزانے ہیں

گلزار میں آنا ہے
جانِ جگر تجھ سے
ملنے کا بہانہ ہے

آ چھت پر آ ماہیا
دل میں خوشیوں کا
اک باغ اُگا ماہیا

چل باغ میں چلتے ہیں
بھنورے ہرجائی
پروانے جلتے ہیں

ہے کھیت چقندر کا
مارہی ڈالے گا
احساس یہ اندر کا

امین خیال کے ماہیے

کچھ زخم سے رِستے ہیں
کوئی نہیں اپنا
مطلب کے رشتے ہیں

مٹ جائے گی بے تابی
پھر سے عطا کر دے
اس باغ کو شادابی

ہنڈیا میں لونگ بھلے
جھوٹ سیاست کا
کب تک یہ ڈھونگ چلے

اک کھاری پھولوں کی
تاب نہ لائے گی
ہے زد میں بگولوں کی

کوئی داغ قمر میں ہے
قوم کی ناؤ تو
اب بیچ بھنور میں ہے

باتیں ہی باتیں ہیں
اہلِ سیاست کی
گھاتیں ہی گھاتیں ہیں

گلشن سے نکلی ہے
ایسے رنگ اس کے
جیسے کوئی تتلی ہے

کر دارو روگوں کے
بے بس اہلِ وطن
آگے چند لوگوں کے

کیسے رکھوالے ہیں
لوٹ کھسوٹ کے بھی
سب عزت والے ہیں

دو پھول گلابوں کے
ٹال دے یا مولا
اب دن یہ عذابوں کے

کوئی بات نہیں ڈھنگ کی
دیس مرا ہر دَم
حالت میں ہے جنگ کی

جانے پہچانے ہیں
ظلم کا مرکز تو
اس ملک کے تھانے ہیں

ہمراز ہیں انساں کے
شجر سدا سے ہی
دَمساز ہیں انساں کے

کب تک تڑپائی گی
کب اس آنگن میں
ہریالی آئے گی

کیسی بیدردی ہے
قتل، اغوا، ڈاکے
اور دہشت گردی ہے

کچھ پھول کھلے بن میں
خوشبو بھر گئی ہے
اس دل کے دامن میں

دنیا میں ابھریں گے
جب امریکہ کے
ہم اثر سے نکلیں گے

کیا شان ہماری ہے
دہشت گردی اب
پہچان ہماری ہے

ماہیے: نذیر فتح پوری (پونہ)

یہ تاج ہے، یہ دل ہے
چاہے جسے چن لے
یہ سہل، یہ مشکل ہے

چوپال کا برگد ہے
کاٹ نہ اس کو تو
یہ پیار کی سرحد ہے

کیا درد جگاتا ہے
دور کوئی ماہی
'الغوزہ' بجاتا ہے

جو دھوپ میں گزرے گا
شہرِ نگاراں میں
وہ زلف تو ڈھونڈے گا

یہ تیج کا میلا ہے
بھیڑ قیامت کی
دل پھر بھی اکیلا ہے

دل ایسا مجیرا ہے
درد کے ہاتھوں سے
تنہائی میں بجتا ہے

کیا دیکھنا، کیا لینا
ٹوٹی محرابیں
اور چیختا مینارہ

سسرال چلی سجنی
میکے کی سب باتیں
اب بھول گئی سجنی

کیا جھونکے ہوا کے ہیں
بانس کے جنگل میں
سنگیت بجاتے ہیں

تختے پہ جو لیٹا تھا
تیری عنایت سے
وہ تخت پہ بیٹھا تھا

کھوٹے ہیں کہ سچے ہیں
ماں کے لیے بیٹے
سب ایک ہی جیسے ہیں

تو درد جگاتا چل
ماہیے چاہت کے
'دل تارے' پہ گاتا چل

جو رکھتے نہیں شانے
بوجھ اُٹھائیں گے
کیا یاری کا دیوانے

تنہا نہیں آیا ہوں
گاؤں کی یادوں کو
میں شہر میں لایا ہوں

کچھ میری سنو بھائی
گھر میں محبت سے
مل جل کے رہو بھائی

ذروں کے جہاں میں تھے
خواب میں کل یارو
ہم ریگِ رواں میں تھے

پربت سے اتر ماہی
گود زمیں کی اب
تخلیق سے بھر ماہی

چاہت کی نشانی ہے
عمر کے بستے میں
اک یاد پرانی ہے

ماہیے: نذیر فتح پوری

یہ پریم کے بوٹے ہیں
کوئی بھی موسم ہو
بس کھلتے ہی رہتے ہیں

الفاظ میں ڈھالیں گے
تیری جدائی کو
ہم گیت بنالیں گے

کس درد کا پھیرا ہے
گھر میں دیئے روشن
اور دل میں اندھیرا ہے

عادت ہے عجیب اس کی
وار بھی کرتا ہے
کرتا ہے حفاظت بھی

مجھ کو تو یہ الجھن ہے
جاں کا محافظ ہی
اب جان کا دشمن ہے

طاقوں میں سجا لینا
چہرۂ ہستی کو
آئینہ بنا لینا

وہ آئے ہیں پھیروں پر
چاند چمکتا ہے
کھیتوں کی منڈیروں پر

وہ آئیں گے ٹیلوں پر
گیت محبت کے
ہم گائیں گے ٹیلوں پر

اس سال تو آئیں گے
تیج کے میلے میں
ہم ڈھول بجائیں گے

خوشبو ہے نہ پایل ہے
رات کٹے کیسے
تنہائی کا جنگل ہے

نغمہ ہے نہ جگنو ہے
خواب کی وادی میں
تنہائی کا آہو ہے

جھنڈے یونہی گاڑیں گے
جاکے اکھاڑے میں
دشمن کو پچھاڑیں گے

ماہیے

احمد حسین مجاہد

(بالاکوٹ)

ہلچل ہے سپیروں میں
سانپ نے جاں دیدی
اک لڑکی کے پیروں میں

☆

وُہ رات کنواری تھی
اوندھی کشتی تلے
جو ہم نے گزاری تھی

☆

اک خوف تھا گاؤں میں
باندھ لیے گھنگھرو
پھر میں نے پاؤں میں

☆

کچھ بھی ہو سکتا ہے
میرا دل میرے
ہاتھوں میں دھڑکتا ہے

☆

لوگوں کو ہنساتا ہُوں
گیلی لکڑی سے
میں آگ جلاتا ہُوں

ماہیے فراغ روہوی

(کولکتا)

معبود نہیں کوئی
تیرے سوا مولا!
مسجود نہیں کوئی

کب ڈھونڈتا ہے تجھ کو
آنکھ جسے دی ہے
وہ دیکھتا ہے تجھ کو

پہلے تُو مٹائے گا
بعدِ اجل ہم کو
پھر تُو ہی جلائے گا

اک اہلِ بقا تُو ہے
سارے خداؤں کا
دراصل خدا تو ہے

گُن تیرے ہی گاتے ہیں
تیرے ہی آگے سب
سر اپنا جھکاتے ہیں

دی تو نے یہ صف ہم کو
سب کے خلیفہ ہیں
حاصل ہے شرف ہم کو

کب بس میں نہیں تیرے
فرشی و عرشی کیا
سب زیرِ نگیں تیرے

ہر حال میں یارا ہے
تیری مشیّت پر
ایمان ہمارا ہے

کیا فن یہ خدایا! ہے
حمد لکھیں کیسے
یہ تو نے سکھایا ہے

اظہارِ کمال، اللہ
حُسن کا منبع ہے
تیرا ہی جمال اللہ

مجھ جیسا گدا گر بھی
تیرا ہی ٹھہرا ہے
محتاج، سکندر بھی

تو صاحبِ قدرت ہے
تیری بدولت ہی
ہر پھول میں نکہت ہے

حیرت کا مقام اللہ
کیسے چلاتا ہے
خود سارا نظام اللہ

ذرّوں کو ستاروں میں
کون بدلتا ہے
شبنم کو شراروں میں

ہر بوند میں دریا ہے
پیاس کے ماروں نے
اس راز کو سمجھا ہے

کب دُور رہا ہے تو
اپنے ہی بندوں کی
رگ رگ میں بسا ہے تو

کیا چاند ستاروں میں
تو ہی منور ہے
پُر نور نظاروں میں

گرتے ہیں، سنبھلتے ہیں
اہلِ جنوں لیکن
ہر حال میں چلتے ہیں

ماہیے فراغ روہوی

میں خود سے پشیماں تھا
راہِ تمنّا میں
کب چاک گریباں تھا

خود زہر یہ پیتے ہیں
حوصلہ دیکھو تو
کس دور میں جیتے ہیں

آنکھوں میں تلاطم ہے
کیوں یہ دکھاوے کا
ہونٹوں پہ تبسم ہے

سپنا وہ سلونا تھا
خون مِرے دل کا
ہر حال میں ہونا تھا

یاد آ کے ستاتے ہیں
بیتے ہوئے لمحے
بس جی کو جلاتے ہیں

اُمید جگاتا ہے
کوئی بھی موسم ہو
پھر لَوٹ کے آتا ہے

کیا بات تھی منظر میں
موج تڑپ اُٹھی
آنکھوں کے سمندر میں

مشکل کو بڑھا دیں گے
لوگ تو شعلوں کو
کچھ اور ہوا دیں گے

کیا خوب ڈھٹائی سے
جھوٹ بھی کہتا ہے
تو کتنی صفائی سے

کانوں میں صدا گونجی
بن کے سوا اکثر
میری ہی نوا گونجی

اربابِ سیاست کا
امن پرستوں پر
الزام ہے ''دہشت'' کا

پھر حکم ہو ساون کو
آ کے بھگو ڈالے
احساس کے دامن کو

ہر عیش کا ساماں ہے
حبس مگر کیوں ہے
جب فصلِ بہاراں ہے

ہے کوئی خفا مجھ سے
پچھلے دنوں سے جو
روٹھا ہے خدا مجھ سے

مت پوچھ کہ کیسا ہے
حال مِرے دل کا
اب میؔر کے جیسا ہے

مرنے میں ہے کیا رکھا
ہم نے تو جیتے جی
مرنے کا مزہ چکھا

جو دشت پہ چھائے ہیں
ٹکڑے یہ بادل کے
ترسانے کو آئے ہیں

کس تیر کا گھائل ہے
من کا مِرے پنچھی
اک عمر سے بے کل ہے

ماہیے فراغ روہوی

کیوں فصلِ بہاراں میں
درد چمک اُٹھا
اس دل کے شبستاں میں

لمحات کے زنداں میں
قید ہیں یوں جیسے
ہیں گورِ غریباں میں

آنکھوں میں دھواں سا ہے
صبح کا منظر بھی
اب بارِ گراں سا ہے

یادوں کی وہ بستی ہے
آخرِ شب مجھ کو
بِن تیرے جو ڈستی ہے

ہر غم سے پرے ہوتے
کاش! اگر ہم بھی
پتھر کے بنے ہوتے

کیا خواب تھا آنکھوں میں
خواب سے جاگے تو
سیلاب تھا آنکھوں میں

احوال مرے جی کا
تم نہ سمجھ پائے
مفہوم خموشی کا

تھی رُت ہی تباہی کی
ہم نے سزا کاٹی
ناکردہ گناہی کی

سودا تھا مِرے سر میں
اس نے ہی پہنچایا
اس شہرِ ستم گر میں

آ، تجھ کو صدا دی ہے
بیچ کی پھر ہم نے
دیوار گرا دی ہے

جس سمت سے گزرے تھے
نقشِ قدم اپنے
کس شان سے اُبھرے تھے

معتوب ہوا ہوں میں
جسم کے زنداں کا
دکھ جھیل رہا ہوں میں

منہ زور ہواؤں میں
محوِ سفر ہیں ہم
کس طرح خلاؤں میں

لمحوں کو منانے میں
عمر مری گزری
ناز اُن کے اُٹھانے میں

یوں روند دیا مجھ کو
حرفِ مکرر سا
کیوں سمجھا گیا مجھ کو

کیا غم ہے خدا جانے
آنکھ مری آخر
کیوں نم ہے خدا جانے

سہنا ہے ستم ہم کو
عشق کے مسلک کا
رکھنا ہے بھرم ہم کو

مت پوچھ کہاں ہوں میں
میرا ٹھکانا کیا
دریا ہوں، رواں ہوں میں

ماہیے

فراغ روہوی

جذبات کے آنگن میں
آگ بھڑکتی ہے
کچھ اور ہی ساون میں

ہر راز چھپا کھلتا
گل کا ہواؤں سے
جب بندِ قبا کھلتا

کس غم میں پگھلتی ہے
برف کے سینے میں
اک آگ سلگتی ہے

دیدار کا طالب تھا
جاگنا راتوں کو
دیوانے پہ واجب تھا

شعلوں کو ہوا دینا
ہاتھ ملاتے ہی
بس ہاتھ دبا دینا

آ دل کی اٹریا میں
ہونے لگے ہلچل
احساس کے دریا میں

عید ماہیے: امین بابر (رحیمیار خاں)

پھر عید نہیں ہوگی
چاند سے مکھڑے کی
جب دید نہیں ہوگی

کیا خوب سماں ہوگا
عید کے موقعے پر
جب تو بھی یہاں ہوگا

روئے گا، رُلائے گا
مفلس بیچارا
کیا عید منائے گا

اُک آہ و زاری ہے
تیرے بنا ساجن
کیا عید ہماری ہے

اپنے سے جدا کر کے
عید نہیں ہوگی
ساجن کو خفا کر کے

یادوں کے ریلے میں
عید گزاریں گے
سپنوں کے میلے میں

ساون ماہیے

ساون کا مہینہ ہے
یادوں کی زد میں
بابرؔ کا سینہ ہے

کیا خوب نظارا ہے
موسم ساون کا
اچھا ہے، پیارا ہے

ملنے کو ترستا ہے
یاد کا ساون جب
اس دل پہ برستا ہے

حالات کا ہالہ ہے
خود کو ساون میں
مشکل سے سنبھالا ہے

ساون کی بہاریں ہیں
دل میں بابر کے
یادوں کی پھواریں ہیں

ماہیے: سعید رحمانی

(کٹک۔اڑیسہ)

شاداب بسیرا ہے
شہر کٹک اپنا
اردو کا جزیرہ ہے

کس بات کا جھگڑا ہے
ہر شے فانی ہے
کچھ تیرا نہ میرا ہے

جلتا ہے مصیبت میں
نیتا مگن لیکن
کرسی کی سیاست میں

میں ہوں مرا سایہ ہے
آج کی دنیا میں
اپنا بھی پرایا ہے

اک حشر کا منظر ہے
جس سمت بھی دیکھو
ہر ہاتھ میں خنجر ہے

گو دھوپ کا صحرا ہے
ماں کی دعاؤں سے
سر پر مرے سایہ ہے

دوری کو مٹائیں ہم
ہاتھ ملاتے ہیں
اب دل بھی ملائیں ہم

دھوکے بھی کھاتا ہوں
اپنی وفاؤں کی
خوشبو بھی لٹاتا ہوں

یہ وقت ہی بھاری ہے
طوفاں کی زد میں
اب کشتی ہماری ہے

مفہوم کے ہیں گہنے
دل میں اتر جائیں
اشعار سعیدؔ اپنے

ماہیے

اشرف علی اشرف

(بھوج پور، بہار)

تو دین کی خدمت کر
عشقِ الٰہی میں
دنیا کی نہ چاہت کر

اک دیپ جلانے پر
ہوتے ہو برہم کیوں
آئنہ دکھانے پر

حاضر ہے تو ناظر ہے
دیکھنے سے لیکن
انسان یہ قاصر ہے

مخلوق کی خدمت میں
وقت گزار و تم
طاعت میں، عبادت میں

اس دہر کی الجھن سے
مجھ کو بچا، یارب
اسلام کے دشمن سے

ماہیا کہانی

غار کا پتھر

وسیم عالم
(گوجرانوالہ)

اللہ کے بندوں کی
بات سناتا ہوں
اک پچھلے وقتوں کی
☆
آپس میں سفران کا
اک دن یکجا ہی
ہوتا ہے گذران کا
☆
ان مشکل راہوں سے
ریگستانوں سے
جنگل سے پہاڑوں سے
☆
طوفانی آندھی تھی
بارش تھی اس دن
بوچھاڑ تھی اولوں کی
☆
ان کو نہ کچھ سوجھا
ایسے میں آخر
اک غار وہاں دیکھا
☆
تینوں سہمے سہمے
جان بچانے کو
اس میں ہی جا بیٹھے
☆
طوفانی آندھی سے
ایک گرا پتھر
اتنے میں چھوٹی سے
☆
منہ غار کا جو وا تھا
پتھر گرنے سے
یکسر وہ بند ہوا
☆
چارے تھے بہت لائے
پتھر وہ لیکن
پھر بھی نہ ہٹا پائے
☆
کر کر چارے تینوں
بیٹھ گئے نیچے
مایوس ہوئے تینوں
☆
اک بولا مانو گر
ایسا کرتے ہیں
ہم تینوں ہی مل کر
☆
ان اپنے کاموں کو
آؤ یاد کریں
ہم اچھے کاموں کو
☆
چھٹکارا مل جائے
شاید اللہ پھر
بچھڑوں سے ملوائے
☆
پھر ہاتھ اٹھا کر وہ
پہلا بولا یوں
آواز سنا کر وہ
☆
ہے کون جو نہ مانے
تیری قدرت ہے
تو سب کچھ ہی جانے
☆
جو رزق حلال آیا
خود بھی کھایا اور
بچوں نے بھی تھا کھایا
☆
تو ہے رحمان خدا
آج مصیبت سے
ہم سب کی جان بچا
☆

پیچھے کو یوں سرکا
ایک بڑا بھاری
پتھر وہ تھوڑا سا
☆
پھر ہاتھ اٹھا کر وہ
دوجا بولا یوں
آواز سنا کر وہ
☆
یا رب محتاجوں کے
کام آیا ہر پل
میں مفلس لوگوں کے
☆
گر تجھ کو لگا اچھا
آج مصیبت سے
ہم سب کی جان بچا
☆
کچھ اور تھا وہ سرکا
ایسے میں پتھر
پیچھے اور تھوڑا سا
☆
اب ہاتھ اٹھا کر وہ
تیسرا بولا یوں
آواز سنا کر وہ
☆
بھیڑیں میں چراتا ہوں
دودھ میں دوہتا ہوں
جب شام کو آتا ہوں
☆
پھر بعد میں دوجوں کی
خدمت کرتا ہوں
میں اپنے بزرگوں کی
☆
یہ فرض نبھاتا ہوں
سب سے پہلے میں
دودھ ان کو پلاتا ہوں
☆
بس شام سویرے ہیں
ماں اور باپ سدا
مجھ سے خوش میرے ہیں
☆
اس نے کی ختم دُعا
پتھر لڑھکا وہ
جا نیچے دور گرا
☆
طوفانی آندھی بھی
رک گئی اتنے میں
بوچھاڑ بھی اولوں کی
☆
سب نے کیا شکر ادا
اور اپنی اپنی
منزل کا رستہ لیا
☆
بات اس میں ہے یہ پائی
ہر اک کے اپنی
نیکی ہی کام آئی
☆

کتاب گھر

کتاب میلہ　تعارف: حیدر قریشی

منشا یاد کے منتخب افسانے　مرتب: ڈاکٹر اقبال آفاقی

صفحات:208　**قیمت**: 150 **روپے**　**ناشر**: مثال پبلشرز۔رحیم سنٹر پریس مارکیٹ، فیصل آباد

منشا یاد اردو کے معروف وممتاز افسانہ نگار ہیں۔ڈاکٹر اقبال آفاقی ایک اہم نقاد اور ادبی تجزیہ نگار ہیں۔میں ان کی ناقدانہ نگاہ اور تجزیاتی انداز کا ایک عرصہ سے خاموش مداح ہوں۔اب انہوں نے منشا یاد کے افسانوں میں سے اپنی پسند کے ۲۱ افسانے منتخب کیے ہیں۔اس انتخاب کے شروع میں انہوں نے ایک طویل مقدمہ ''کہانی اور منشا یاد'' تحریر کیا ہے۔اس مقدمہ میں انہوں نے عمدگی کے ساتھ منشا یاد کی کہانیوں سے ملاقات کرائی ہے۔منشا یاد کا اپنا مرتب کردہ انتخاب ''شہرِ فسانہ'' زیادہ بھرپور انتخاب تھا تو یہ انتخاب بھی اپنے اندر جامعیت کی خوبی لیے ہوئے ہے۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کے طویل مقدمہ کا ایک اقتباس ان کے مجموعی اندازِ نظر کی بہترین ترجمانی کرتا ہے:

''منشا یاد کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان گرے پڑے لوگوں کو ایک ایسی نظر سے دیکھا ہے کہ تحیر زا بصیرت کا ایک باب کھل جاتا ہے۔ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا ردِعمل کی یہ صورتیں بھی ممکن ہو سکتی ہیں۔کیا انسانی جبلّتیں اس طرح کے کھیل بھی کھیل سکتی ہیں۔یہ بھوک کے عذاب، موت کے خوف، تنہائی اور بے بسی کے مارے اور زمانے کے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں، جیسے تھور زدہ زمین، جیسے اونٹ کٹارے، جیسے صحرا کی کبڑی جھاڑیاں، جیسے ویران بستیوں کے کتے، گیدڑ یا بھوت پریت۔منشا یاد بڑا جادوگر ہے۔وہ کتوں اور گیدڑوں کو انسان بنا دیتا ہے۔وہ صحرا کی کبڑی جھاڑیوں کو قد آور درختوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس کی جادو کی چھڑی سے اونٹ کٹارے گلاب کی خوشبو دینے لگتے ہیں اور تھور زمین گل وگلزار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔یہ جادوگری نہیں تو اور کیا ہے! مُردوں کو زندہ کرنا مسیحائی ہے۔وہ مسیحا ہے، گرے پڑے بدبودار لوگوں کا مسیحا۔جن کا شرفِ انسانیت وہ بحال کر دیتا ہے''

اس انتخاب میں ان ۲۱ افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔تیرھواں کھمبا، راستے بند ہیں، کچی پکی قبریں، پانی میں گھرا ہوا پانی، ماس اور مٹی، بوکا، تماشا، جیکو پچھے، دامِ شنیدن (ڈنگر بولی)، دنیا کا آخری بھوکا آدمی، وقت سمندر، سارنگی، بیتال کتھا، زوال سے پہلے، شجرِ بے سایہ، پنج کلیان، چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں، ایک تھی فاختہ، ساجھے کا کھیت، بحران اور کہانی کی رات۔

خیال کی مسافت (تنقید)　مصنف: شمیم حنفی

صفحات236　**قیمت**: 300 **روپے**　**ناشر**: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر۔دہلی

شمیم حنفی اردو ادب کی ایک اہم اور معتبر علمی شخصیت ہیں۔خیال کی مسافت ان کے تنقیدی مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔پریم چند، علامہ اقبال، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، میرا جی، ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، علی سردار جعفری، اختر الایمان کے فن یا فکر کی مختلف جہات کے حوالے سے انہوں نے عمدہ مضامین تحریر کیے ہیں۔''اردو ادب کی صورتحال'' سے لے کر ''اکیسویں صدی کا ادب، کچھ سوال'' تک انہوں نے بدلتے ہوئے عالمی تناظر میں ادب اور اردو ادب کی مجموعی صورتحال کو گہری نظر سے دیکھا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے مایوس کن صورتحال کے باوجود امید کا چراغ جلایا ہوا ہے۔جدیدیت اور اردو شاعری، ادب میں نئی حسیت کا مفہوم، کل کی کہانی، غزل کا سوالیہ نشان، طویل نظم سنہ ساٹھ کے بعد اور نئی تنقید کا المیہ، مضامین شمیم حنفی کی تنقیدی بصیرت کا اظہار ہیں۔مشرق و مغرب کی آویزش میں انہوں نے انگریزی کے ادبی رسالہ ''ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' کی ہزار سالہ غلط بخشی کا علمی تجزیہ کیا ہے۔مذکورہ رسالہ نے ۱۹۹۹ء میں ایک ہزار برس کی سب سے اہم کتابوں کی نشان دہی کا کام کیا، جس میں ابنِ خلدون کو چھوڑ کر باقی سب کے سب مغربی مصنفین کو شامل کیا گیا۔ اس سے تمام تر روشن خیالی کے باوجود اہلِ مغرب کی علمی وادبی تنگ نظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔کسی غم وغصہ کے بغیر نہایت سنجیدگی اور متانت سے لکھا گیا یہ مضمون انگریزی میں ترجمہ ہو کر اہلِ مغرب تک پہنچنا چاہیے۔

ہمارے ہر اچھے سے اچھے لکھنے والے کا بھی ایک مخصوص حلقۂ احباب ہوتا ہے اور اپنے تمام تر تجزیوں اور تبصروں میں بڑی حد تک غیر جانبدار رہتے ہوئے بھی ہم اپنے حلقۂ احباب کی نگارشات پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔شمیم حنفی کے ہاں بھی یہ رویہ صاف دکھائی دیتا ہے اور کسی قسم کا انقباض پیدا نہیں کرتا، تاہم ایک دو مقامات پر ان کے رویے سے ہلکی سی حیرت ہوئی۔مثلاً اپنے مضمون ''طویل نظم سنہ ساٹھ کے بعد'' میں انہوں نے کیسے کیسے نظم نگاروں کے سامنے وزیر آغا کی شاہکار نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کو اتنا سرسری لیا ہے کہ میں حیران رہ گیا۔اس مضمون میں مذکور ساری نظموں میں سب سے اعلیٰ ترین نظم وزیر آغا کی آدھی صدی کے بعد تھی اور اسی کو نظر انداز کر دیا گیا۔''اردو ادب کی موجودہ صورتحال'' میں انہوں نے بڑا متوازن انداز اختیار کیا ہے۔ایٹمی جنگ کے خطرہ کا احساس کرتے ہوئے میں نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء کے دوران تین مختلف کہانیاں لکھی تھیں۔انڈو پاک کے ایٹمی دھماکوں کے معاً بعد میں نے وہ تینوں کہانیاں اپنے پیش لفظ کے ساتھ ''ایٹمی جنگ'' کے نام کے ساتھ اردو اور ہندی اسکرپٹ میں شائع کرائی تھیں۔ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے شمیم حنفی نے جو حوالے شاملِ مضمون کیے ہیں۔میری 'ایٹمی جنگ' ان کی نظر سے گزری ہوتی تو شاید وہ اسے بھی پذیرائی بخشتے۔مجموعی طور پر 'خیال کی مسافت' شمیم حنفی کی تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے، جو بڑی حد تک متوازن اندازِ نظر کی حامل ہے۔

خواب،ہوا اور خوشبو (نظمیں) **شاعر: جمیل الرحمٰن**

صفحات: 278 **قیمت:** 300 **روپے** **ناشر:** اکادمی بازیافت۔کراچی

جمیل الرحمٰن کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن تینوں مجموعے ایک خاص فکری پس منظر کے باعث ادبی دنیا میں سامنے نہیں آ سکے۔حالانکہ پہلا مجموعہ ''زمیں جب آنکھ کھولے گی'' اپنے مخصوص پس منظر کے باوجود ادبی دنیا میں لایا جانا چاہئے تھا۔بہر حال اب ''خواب، ہوا اور خوشبو'' کے نام سے جمیل الرحمٰن کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا ہے اور اسے وہ پورے اعتماد کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔مغربی ممالک میں جدید نظم کو سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں اور جدید نظم کہنے والے تو اور بھی کم ہیں۔ایسے گھٹے ہوئے شعری ماحول میں جمیل الرحمٰن کی نظموں کا یہ خوبصورت مجموعہ خوشگواریت کا احساس دلاتا ہے۔ابرار احمد نے کتاب کے پیش لفظ میں حقِ ادب اور حقِ دوستی دونوں کو ادا کر دیا ہے اور بین السطور حق بات بھی کہہ دی ہے۔احمد ہمیش، احمد جاوید، سلیم کوثر، اصغر ندیم سید، احمد صغیر صدیقی، محمد حمید شاہد اور فرخ راجہ جیسے جدید نظم فہم سینیئرز کے ساتھ معراج جامی، رومانہ رومی، نثار ترابی اور ندیم ہاشمی جیسے جدید نظم کے نئے قارئین کی آراء سے بھی کتاب کو سجایا گیا ہے۔جمیل الرحمٰن نے اپنے خصوصی نوٹ میں لفظ کی ناگزیریت کو عروض پر فوقیت دینے کی بات کی ہے۔اگلے زمانوں میں جسے عجزِ اظہار کہا جاتا تھا، وہ جدید نظم میں اپنے جواز کے لیے ایک حد تک گنجائش بنا چکی ہے۔تاہم اتنی گنجائش کے باوجود جمیل الرحمٰن کو نظموں کے ساتھ چند نثری نظمیں کیوں لکھنا پڑیں؟ یہ بات واضح نہیں ہوئی۔تاہم یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جمیل الرحمٰن نے اپنی نثری نظموں کو بے وزن نہیں ہونے دیا، یعنی شعری ردھم میں نہیں آنے دیا۔اس لحاظ سے یقیناً اس نے کامیاب نثری نظمیں لکھی ہیں۔نثری نظموں سے قطع نظر ہالینڈ میں مقیم جمیل الرحمٰن کی نظموں کا یہ مجموعہ ادبی دنیا میں عمومی طور پر اور جدید نظم کے حلقہ میں خصوصی طور پر سراہا جائے گا۔

کلامِ نسّاخ (افسانے) **مقدمہ و مرتبہ: شہناز نبی**

صفحات: 192 **قیمت:** 250 **روپے** **ملنے کا پتہ:** 88-H-2,Elliot Road,Kolkata-16

انیسویں صدی میں بنگال میں ایک ادبی شخصیت عبدالغفور نسّاخ کا جنم ہوا۔وہ نامساعد حالات کے باوجود ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ تک پہنچے۔سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ انہوں نے اپنا علمی و ادبی سفر بھی جاری رکھا۔شہناز نبی نے نسّاخ پر اب تک ہونے والے کام کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی حیات و تصانیف کو بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ان کی ادبی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔نساخ کے سفر نامچے، مختصر خاکے، بے ترتیب خود نوشت، کا جائزہ لیا ہے، ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''ارمغان'' کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔مجموعی طور پر شہناز نبی نے تحقیقی محنت اور تنقیدی دیانت سے کام لیتے ہوئے بنگال کے انیسویں صدی کے ایسے شاعر اور ادیب کی ادبی خدمات کو اجاگر کیا ہے، جسے ادبی دنیا ایک طرح سے بھول چکی تھی۔شہناز نبی کی اس تحقیق و تنقید کو علمی و تحقیقی حلقوں میں یقیناً سراہا جائے گا۔

ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں (تجزیاتی مطالعہ) **مرتّب: بلراج کومل**

صفحات: 256 **قیمت:** 180 **روپے** **ناشر:** پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی

جدید نظموں کے مطالعہ کا رواج جدید تنقید کے زیرِ اثر شروع ہوا تھا۔قارئین کو نظم کی سمجھ نہیں آتی تھی سو اس مطالعاتی سلسلہ نے قاری کے لیے کچھ سہولت پیدا کر دی اور نکتہ آفرینی کی صورت بھی بن گئی۔مابعد جدیدیت نے اس نکتہ آفرینی کو رومال یا ٹوپی میں سے کبوتر نکال کر دکھانے کا کھیل بنا دیا۔اب مابعد جدیدیت کا گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں جو انجام ہو چکا وہ علمی سطح پر عبرت کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔(مجلسی سطح پر نارنگ صاحب جتنا چاہے اپنا جی بہلا لیں، پر جتنا ہو چکا، بڑا عبرتناک ہے) میرا جی اور راشد کے زمانے کے بعد سے اب تک جدید نظم فہمی کا سلسلہ اتنا ہو جانا چاہیے تھا کہ نظم کا قاری خود اس سے لطف اندوز ہو سکے۔لیکن نظم کے تجزیاتی مطالعہ کے نام پر مضامین کا جو سلسلہ جاری ہے اس سے ایسا لگتا ہے جیسے نظم کے ساتھ 'ترکیب استعمال' کا پرچہ لف کیا جا رہا ہو۔میں نے ستیہ پال آنند کی تیس نظموں کو پڑھ کر زیادہ لطف اُٹھایا ہے اور یہ نظمیں ایسی ہیں کہ نظم کے قاری کے لیے غیر ضروری مشکل پیدا نہیں کرتیں۔جن دوستوں نے نظموں کا تجزیہ/مطالعہ کیا ہے ان کا ستیہ پال آنند کے تئیں اخلاص برحق ہے لیکن شاید یہ دوسرے قارئین کی آزادا قرأت میں روک بھی پیدا کرتے ہیں۔بہر حال جو کام خلوص سے کیا جائے اس کی قدر کی جانی چاہیے، بس اس بنیاد پر ایسے تجزیاتی مطالعات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔توقع کی جانی چاہئے کہ یہ کتاب ستیہ پال آنند کی نظموں کی تفہیم میں عام قارئین کے لیے کسی نہ کسی طور ممد و معاون ثابت ہو گی۔

خیال موسم (غزلیں) **شاعر: جاوید ندیم**

صفحات: 172 **قیمت:** 150 **روپے** **ناشر:** تکمیل پبلی کیشنز ممبئ

جاوید ندیم ہندوستان میں اردو کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔'خیال موسم' ان کی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔کتاب کے شروع میں نشتر خانقاہی نے جو ابتدائیہ لکھا ہے اس میں غزل کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہے وہ غزل کے اچھے تخلیق کاروں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث بنے گی۔انہوں نے بلاشبہ بعض نہایت عمدہ نکات ابھارے ہیں۔جاوید ندیم کی غزل کے حوالے سے بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک بجا ہے۔ان کے چند اشعار سے ان کی غزل کے تیور دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہو رہے ہیں زندگی کے نِت نئے اظہار گم — منچ سے ہو جائیں گے کل سب کے سب کردار گم

گزرا ہے وقت گر تو گزر کر کدھر گیا — ساکن اگر رہا تو کہاں پر سفر گیا؟

ہر ربط، ضرورت کی ہے ڈوری سے بندھا اب — تھا دل سے کبھی دل کو جو رشتہ وہ کہاں ہے

صرف ایقان ہی ایمان رہا ہے اپنا — ہم نے پہلے بھی خدا کو بھلا دیکھا کب تھا

کاغذ سیاہ تم نے عبث ہی کیے ندیمؔ — حل شاعری سے کوئی بھی کیا مسئلہ ہوا؟

اردو غزل کے سنجیدہ قارئین کے لیے جاوید ندیم کا یہ شعری مجموعہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

منشا یاد (اسلام آباد)

مندروالی گلی

''مندروالی گلی''،ڈاکٹر انور زاہدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔

اس سے پہلے ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''عذاب شہر پناہ'' (1991) اور ''موسم جنگ کا کہانی محبت کی'' (1996) شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی خاصی حاصل کر چکے ہیں۔انور زاہدی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور ان کا تعلق ایک علمی اور ادبی گھرانے سے ہے۔ان کے والد مقصود زاہدی ایک بہت اچھے شاعر تھے۔رباعی ان کی انفرادیت تھی۔وہ ایک کامیاب ہومیو پیتھک معالج بھی تھے۔انور زاہدی کی ہمشیرہ ماہ طلعت زاہدی جدید لہجے کی معروف شاعرہ ہیں۔بہنوئی ڈاکٹر اسداریب ادبی اور علمی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ان کے چھوٹے صاحب زادے خرم زاہدی فوٹو گرافی کا خاص شوق رکھتے ہیں۔اس کتاب کا خوب صورت سرورق انہوں نے ہی بنایا ہے۔بڑے صاحب زادے شعیب حسن کا تعلق کمپیوٹر اور ماس میڈیا کی دنیا سے ہے۔مگر انہوں نے ایک آدھ افسانہ بھی لکھا ہے۔ان کی بیٹی لیلیٰ علی گرافک ڈیزائنر اور داماد علی عارف آرکیٹکٹ اور ٹی وی کے مشہور آرٹسٹ ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا گھرانہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی صحیح مثال ہے۔یوں تو نوجوانی کے سنہری دنوں میں سبھی حسین اور شاعر ہوتے ہیں لیکن انور زاہدی نے اپنے سنہری دنوں میں باقاعدہ اور خوب صورت شاعری بھی کی۔ان کی نظموں کا مجموعہ ''سنہرے دنوں کی شاعری'' (1984) افسانوی مجموعوں سے بھی پہلے شائع ہوا تھا۔

انور زاہدی مختلف الجہات تخلیق کار ہیں۔ان کا عالمی ادب کا مطالعہ خاصا وسیع ہے اور انہوں نے تحقیق' خاکہ نگاری اور سفرنامہ کے علاوہ عالمی ادب سے بہت سے تراجم بھی کئے ہیں۔جن میں جدید ایرانی شعراء' ہرمن ہیسے' پابلو نرودا کی خودنوشت' یونگ کی کتاب ''لاشعور تک رسائی'' کرغستان کی رزمیہ شاعری' پرتگال کے قومی شاعر فرنینڈو پیسوا کی نظموں اور دنیائے ادب کے دس بڑے شاعروں پر تحقیقی مقالوں کے ساتھ نظموں کے تراجم شامل ہیں۔2005ء میں ''دنیا کہیں جسے'' کے عنوان سے ان کا امریکہ' کینیڈا' لندن اور دوبئی کا دلچسپ اور معلومات افزاء سفرنامہ بھی شائع ہوا تھا۔

اس قدر بھرپور علمی اور ادبی کام کرنے کے باوجود وہ اپنے طبابت کے پیشے سے بھی پورا انصاف کرتے ہیں جس کا ثبوت میں خود ہوں۔مجھے اپنے سرکاری ہسپتال میں علاج کی ساری سہولتیں میسر ہیں مگر میں

صحت کے ہر مسئلہ پر ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

''مندروالی گلی'' میں پندرہ کہانیاں شامل ہیں۔ان کو پڑھتے ہوئے اسلوب کی خوبصورتی' موضوعات کا تنوع' انسانی نفسیات کا عمیق مطالعہ اور افسانوی تحیر پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔جدید انسان کے گوناگوں سماجی' ذہنی اور نفسیاتی معاملات اور ان کی بھرپور عکاسی ان کے فن کی خاص خوبی ہے انہوں نے اپنی کہانیوں کا مواد اپنے ذاتی مشاہدے' تجربے اور اپنے پیشے میں پیش آنے والے عجیب' پراسرار اور تحیر زا واقعات سے لیا ہے۔صداقت اور واقعیت ان کہانیوں کو وقیع بناتی ہے مگر تمام تر سچائی اور حقیقت نگاری کے باوجود انہوں نے افسانونیت کے اثر کو کہیں بھی کم نہیں پڑنے دیا۔اپنے تجربے اور مشاہدے میں آنے والے واقعات کو وہ خوابوں اور موسموں کی وساطت سے بیان کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جابجا خوابوں کے دھندلکے ہیں۔بدلتے موسموں کے ذائقے ہیں اور راتوں کے اسرار ہیں۔زوال پذیر نظام اور اقدار کو وہ نہایت بلیغ علامتوں جیسے کم یا زیادہ روشنی' اندھیرا' رات' بلیک آؤٹ' خشک سالی' جنگل اور جنگل کے کٹنے وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔خود مندروالی گلی ایک استعارہ ہے۔بچپن کی ایک ان مٹ یاد کا۔وہ الگ بات ہے کہ یادوں کے اس سفر میں وہ چاہ مراد اور مندروالی گلی میں ہی گھومتے رہتے ہیں اور ساری کہانی میں بے چاری فوزیہ' جس کی آنکھیں اداس اور گہری ہوتی ہوئی شام جیسی تھیں' اور جس کے لیے یہ کہانی لکھی گئی صرف تین جملوں کی حقدار ٹھہری۔شریف اور شرما کل عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔

انور زاہدی کامیاب میڈیکل پریکٹیشنر ہیں۔دوسرے زوال یافتہ شعبوں کی طرح اب اس مقدس پیشے میں بھی کمرشل ازم بہت درآیا ہے۔لیکن انور زاہدی جیسا اچھا معالج منفعت کی بجائے خدمت پر یقین رکھتا اور زندگی کا محافظ ہوتا ہے۔وہ ہمہ وقت زندگی کو موت کی پرچھائیوں سے بچانے میں لگا رہتا ہے۔انور زاہدی بھی زندگی بھر موت وحیات کی لکن میٹی کو قریب سے دیکھتے رہے ہیں۔اس لئے موت سے متعلق موضوعات ان کی تحریروں میں آنا قدرتی بات تھی۔نئے مجموعے میں بھی ایسی بہت سی کہانیاں ہیں جن میں موت کا حوالہ یا ذکر ہے لیکن اب وہ بہت حد تک اس رجحان سے نکل آئے ہیں۔اب ان کی کہانیوں میں زندگی کے بھید' مابعد الطبیعات اور نامعلوم مخلوق کا ذکر ڈومینیٹنگ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی جدید زندگی کے معاملات اور مسائل سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔شفٹنگ' ایک ایکسٹرا کی کہانی اور پرمانینٹ فیٹل ایرر جس کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔''جنگل کٹنے والا ہے'' ان کے ملکی اور عالمی سیاسی بصیرت کے علاوہ تاریخ عالم سے گہری شناسائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اسلوب کی سطح پر بھی ''مندروالی گلی'' میں فنی ارتقاء اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔زبان وبیان بہت معیاری اور عمدہ ہے۔اور ہاں اس خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ شاعر ہیں مگر نثر میں شاعری کا پیوند لگا کر دونوں کو داغ دار اور بے توقیر کرنے کے مرتکب نہیں ہوتے اور شعریت کے بغیر بھی نثری آہنگ کو خوب صورتی سے نبھاتے ہیں۔میری دعا ہے کہ اللہ انہیں ایسی ہی تخلیقی توانائی دیئے رکھے۔

ڈاکٹر عبدالرشید (دہلی)

اردو لغت (تاریخی اصول پر)

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری

بیسویں صدی میں اردو لغت نگاری کا اہم کارنامہ 'اردو لغت (تاریخی اصول پر)' ہے۔ اس لغت میں اردو کی قدیم ترین لغات سے لے کر جدید ترین فرہنگوں تک کے تمام الفاظ و محاورات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہزار ہا الفاظ، تراکیب اور محاورات مع امثال ایسے بھی درج ہیں جو متداول لغات میں موجود نہیں تھے۔ یہ بلاشبہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ لغت نگاری ایک مشکل فن ہے اور اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ لغت تمام اغلاط سے پاک ہو لیکن ایسا لگتا ہے کہ پیش نظر 'اردو لغت' میں کتابت کی غلطیوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی۔

اردو لغت میں بعض مقامات پر سنسکرت، پراکرت اور ہندی نژاد الفاظ کا املا بھی غور طلب ہے۔ اس سلسلے میں اربابِ لغت نے 'تعارف' میں اپنی مجبوری کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''جہاں تک ہندی نژاد الفاظ کی اشتقاق نگاری کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ ایسے
> اشخاص جنھیں سنسکرت کا منتہی کہا جا سکے ہمارے یہاں تقریباً ناپید ہیں۔''

اردو لغت میں جس وسیع پیمانے پر کام ہو رہا تھا اور جس معیار کی لغت تیار ہو رہی تھی ایسی صورت میں سنسکرت وغیرہ الفاظ کی اشتقاق نگاری میں پڑوسی ملک کے ماہرین سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہاں ان زبانوں کے ماہرین 'تقریباً ناپید' تھے مگر 'اردو لغت' میں انگریزی الفاظ کی املا میں غلطیوں کا کیا جواز ہے؟ اردو لغت (جلد سیزدہم) میں مندرج انگریزی الفاظ ملاحظہ فرمائیں (یاد رہے کہ یہاں صرف لفظ 'علم' کے ذیل میں درج انگریزی الفاظ کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں):

علم العلاج	:	THERAPEVTICS
علم اللغات بالمقابلہ	:	COMPERATIVE PHILOLOGY
علم المعاشرت	:	SOCIOLOGGY
علم النفس	:	PHYCHOLOGY
علم آثار قدیمہ	:	ARCHACOLOGY

علم موسم	:	MELEROLOGY
علم نقشہ گری	:	CARTOGGRAPHY

'اردو لغت' میں ہر لفظ کی سند میں اساتذہ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی درج ہیں جن میں زبان و بیان محلِ نظر ہے، مثلاً لفظ 'شاخ' کے ذیل میں درج جدید تر مثال:

شاخ: ایک چڑیا او پر درخت کی شاخ سے اڑ کر اُس کے اوپر بیٹھ گئی۔ **۱۹۸۳ء ساتواں چراغ (جلد دوازدہم)**

اس طرح کی مثالوں سے بہر حال چشم پوشی ہی کرنی چاہیے کیوں کہ اس سلسلے میں اربابِ لغت نے اپنی مجبوری کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''لفظوں کے استعمال کی مثالوں کے جو تیرہ چودہ لاکھ کارڈ مرتّب کرائے گئے تھے وہ علی العموم ایسی سطح کے لوگوں نے لکھے تھے جنھوں نے املا کی بے شمار غلطیاں کی تھیں اور اقتباسات کی عبارتیں جوں کی توں نقل کرنے کے بجائے جس طرح ان کا جی چاہا نقل کر دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ از سرِ نو پریس کاپی تیار کی جانے کی قلیل مدت میں مثالوں کے ہزار ہا کارڈوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ ممکن نہ تھا۔ بایں ہمہ اسی کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ مثالیں ان کے مآخذ سے مقابلہ کر کے درج لغت کی گئیں، جس کے بعد یہ تو اطمینان ہو گیا ہے کہ کوئی مثال غلط درج نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مقام پر الفاظ ادھر سے اُدھر ہو گئے ہوں۔''

گویا مثالوں میں لفظوں کا 'اِدھر سے اُدھر ہو جانا' کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اس طرح کے بیانات سے اردو لغت کا علمی وقار کم ہوتا ہے۔ یہ تو محض ضمنی اشارے تھے جن کی طرف خصوصی توجہ ضروری تھی۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد اردو لغت کی اہم ترین خصوصیت یعنی 'تاریخی اصول' پر چند معروضات پیش کرنا ہے۔ تاریخی اصول سے اصلاً کیا مراد ہے اس کے بارے میں 'اردو لغت' سے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''لفظ کے مفہوم کی ہر شق کے ساتھ اس کے استعمال کی مثالیں ہر دور کے مصنّفین کی تصانیف سے یا اخبارات اور رسائل کے مضامین سے اقتباس کر کے درج کی گئی ہیں... مثالوں کے اندراج میں عموماً قدیم تر اور جدید تر مثالوں کو ترجیح دی گئی ہے تا کہ لفظ کی تاریخ متعین ہو سکے؛ لیکن بعض مقامات پر ابہام سے بچنے کے لیے یا اور کسی مقصد سے اس کے خلاف بھی عمل کیا گیا ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اس لغت میں تیرہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے ذخیرۂ ادب سے مثالیں درج کی گئی ہیں، اس طرح یہ لغت اردو میں الفاظ کے تقریباً سات سو پچاس (یا اس سے بھی زیادہ) برس کی تاریخ مرتّب کرتا ہے۔''

... جہاں تک ممکن ہوا ہے ہم نے اس لغت میں اس کا اہتمام کیا ہے کہ جہاں قدیم ترین یا اولین شہادت، سند یا حوالہ دستیاب نہیں ہوا وہاں جہاں تک رسائی ممکن ہوئی ہے مثالیں فراہم کی گئی ہیں۔ عام طور پر تین مثالوں کو شامل کیا گیا ہے۔ قدیم مثالوں میں قدیم تر اور جدید میں جدید تر مثالوں کو ترجیح دی گئی ہے...

سب سے پہلے تاریخی اعتبار سے اردو ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ تین دور اس لیے کافی سمجھے گئے کہ

اردو کوئی کہنہ سال زبان نہیں ہے۔ پہلا دور جسے عمومی طور پر دکنی اردو کا دور کہنا چاہیے، ولی اورنگ آبادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور غالبؔ اور تیسرے دور میں غالبؔ اور اس کے ہم عصروں کے بعد سے لے کر آج تک کے مصنّفین شامل ہیں۔ اس بات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو برصغیر کے ہر علاقے کی اردو تصانیف سے استفادہ کیا جائے۔ تقسیم ادوار کے لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ ہر لفظ کے ہر معنی کی ہر دور سے کم از کم ایک سند یعنی کل تین سندیں درج کی جائیں اور جہاں تک استعمال میں قدرے تنوع ہو وہاں تین سے زیادہ بھی۔ چناں چہ ممکن حد تک اس کی پابندی کی گئی۔"

درج بالا اقتباسات قدرے طویل سہی لیکن ان سے 'اردو لغت' میں 'تاریخی اصول پر' مبنی اصول وضوابط کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ کسی لفظ، ترکیب یا محاورے کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ لفظ، ترکیب یا محاورہ اردو کے کسی ایک دور سے مخصوص ہے، نہایت مشکل ہے جب کہ امکان یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ لفظ یا محاورہ مستعمل رہا ہو۔ میں پچھلے دس بارہ سال سے فارسی میں اردو محاورات کے تراجم پر مواد اکٹھا کر رہا ہوں اور اس دوران اچھے خاصے محاورات جمع ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے کام کے آغاز میں اردو کے کلاسیکی متون سے محاورات تلاش کیے اور بعد میں اردو کی معروف اور کم معروف لغات سے مقابلہ کیا تو ان میں سے بیشتر ان فرہنگوں میں موجود تھے لیکن بعض محاورے ایسے بھی تھے جو کسی لغت میں درج نہیں تھے۔ آخر میں 'اردو لغت' (تاریخی اصول پر) کے مطالعے کا موقع ملا اور میں نے اپنے مطالعے میں 'اردو لغت' سے بھرپور استفادہ کیا۔ اگر 'اردو لغت' کا مطالعہ نہ کرتا تو شاید بعض محاوروں تک رسائی بھی ناممکن ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'اردو لغت' میں ہزاروں کتابوں سے محاورات اخذ کیے گئے ہیں ان میں بہت سے نادر مخطوطات اور کتابیں ایسی ہیں جن کے نام بھی پہلی بار 'اردو لغت' کے وسیلے سے معلوم ہوئے جب کہ میں نے تو چند کتابوں کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا تھا اور میرے پاس 'اردو لغت' کے مقابلے میں مٹھی بھر کارڈ ہیں۔

لیکن جب 'اردو لغت' سے محاوروں کو نقل کرنا شروع کیا تو حیرت ہوئی کہ بعض محاورے 'اردو لغت' میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں اور چند ایسے محاورے بھی تھے جو 'اردو لغت' میں مندرج مثالوں سے قدیم تر تھے۔ اس تبصرے میں ایسے ہی بعض محاورات کی قدیم تر مثالیں پیش کی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود ان مثالوں کو حتمی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق کی راہیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں اور اس میں حرفِ آخر نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں اردو لغت سے بطور نمونہ ایک مثال پیش کی جا رہی ہے اور اس نمونے کے بعد ایسی قدیم تر مثال بھی درج ہے جو میرے مطالعے میں آئی۔ مضمون میں طوالت سے بچنے کے لیے 'اردو لغت' میں درج محاورہ اور مندرج مثال کے شاعر یا ادیب کا نام اور بریکٹ میں سن دیا جا رہا ہے اور اس کے بعد قدیم تر مثال دی جا رہی ہے جس میں سنین 'اردو لغت' سے اخذ کیے گئے ہیں:

اردو لغت (جلد دوم): آنکھ دکھانا: ف مر؛ محاورہ = آنکھیں دکھانا۔

۱۔ معالج سے آنکھ کا معائنہ کرانا، آنکھ اس غرض سے سامنے کرنا کہ مخاطب اسے دیکھے، آنکھ کی نمائش کرنا:

باغ میں اس کو بہت دھیان ہے خوش چشمی کا — آنکھ نرگس کو ذرا اپنی دکھاتے جانا

۱۸۶۱ء: کلیاتِ اختر، واجد علی شاہ

آنکھ اس ادا سے اس نے دکھائی کہ ہم نے شوقؔ — چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا

۱۹۲۵ء: شوق قدوائی

۲۔ چشم نمائی کرنا، غصہ کرنا، ڈرانے دھمکانے کے لیے گھورنا، کڑی نگاہ ڈالنا:

فرشتے آنکھ دکھا کر کسے ڈراتے ہیں — قتیل چشم ہیں، مارے ہوئے نظر کے ہیں

۱۸۳۶ء: ریاض البحر

لیکن جب آ کے آنکھ دکھاتا ہے قرض خواہ — حیلے بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

۱۹۴۴ء: عرش وفرش

۳۔ رُکھائی یا بے مروّتی برتنا:

جب لے چکے دل کو تم تو دکھلائی وہ آنکھ — جس آنکھ نے کیفیت سجھائی کیا کیا **۱۸۰۹ء: جرأتؔ**

لطف کی پہلے تو امید دلائی اے حر — جب پڑا وقت تو اب آنکھ دکھائی اے حر

۱۹۶۳ء: مرثیۂ منظور رائے پوری

۴۔ منع کرنا:

گلشن میں گل سے کر رہی ہے شوخ چشمیاں — نرگس کو چل کے آنکھ دکھائیں حضور آپ

۱۸۳۲ء: دیوانِ رندؔ

ساقیا دل میں جو توبہ کا خیال آتا ہے — دور سے آنکھ دکھاتا ہے ترا جام مجھے **۱۹۱۵ء: جانِ سخن**

۵۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کرنا، آنکھ کے اشارے سے بات سمجھانا:

منہ پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی **۱۸۳۸ء: گلزارِ نسیم**

۶۔ مقابلے میں شکست دینا، زیر کرنا:

راہیِ قمر در نجف تھا جو سفر کو — ہر ذرّۂ رہ آنکھ دکھاتا تھا گہر کو **۱۸۹۱ء: مرثیۂ شمیم**

'دم خم جوانی کو شرمندہ کرتے تھے بڑھاپے کو آنکھ دکھاتے تھے چہرہ بارعب تھا۔' **۱۹۱۲ء: یاسمین**

بہ طور جمع:

حضرت دل کیا کرتے ہو شکوہ آنکھیں دکھانے کا ان سے — کچھ نہ کہو تقدیر میں جو دیکھنا ہے سو دیکھو تم

۱۸۵۶ء: کلیاتِ ظفر

شوق سے آنکھیں دکھاؤ مجھے کچھ رنج نہیں   شعبدہ یہ بھی تو اک گردشِ ایام کا ہے

۱۹۲۱ء: اکبؔر

درج بالا مثالوں میں 'آنکھ دکھانا' کے ذیل میں قدیم ترین مثال جرأؔت (۱۸۰۹ء) کی دی گئی ہے حالاں کہ اس سے پیشتر بھی یہ محاورہ مستعمل رہا ہے۔ درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

حاتؔم (۱۷۷۴ء)

اگر تو آنکھ دکھادے چمن میں نرگس کو   تو ایک آن میں یک دست یک قلم نہ رہے

سجّاؔد (۱۷۹۲ء)

کیوں دکھاتا ہے آنکھ نرگس کو   اور کیا مر گئے ہیں سب بیمار

حسرؔت جعفر علی (۱۷۸۵ء)

جوں ہی رونے لگا میں دیکھ اس کو   بس وُہیں شوخ نے دکھائی آنکھ

اور بہ طور جمع یعنی 'آنکھیں دکھانا' کی قدیم ترین مثال **'کلیاتِ ظفر'(۱۸۵۶ء)** سے اخذ کی گئی ہے جب کہ اس سے پہلے بھی اس محاورے کی مثالیں موجود ہیں:

شاہ قاسم (سراؔج [۱۷۳۹ء] کا ہم عصر):

ہمارا طفل دل کرتا ہے شوخی   سجن اس کو ذرا آنکھیں دکھانا

حاتؔم (۱۷۷۴ء) دیوان زادہ:

رہے نئیں ہوش ان میں بات کہنے کا ترے آگے   دکھادے جا کے میخانے میں مستوں کو اگر آنکھیں

میؔر (۱۸۱۰ء):

دل کھول کے مل چلیے جو میؔر سے ملنا ہے   آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منہ بھی چھپاتے ہو

ذوؔق (۱۸۵۴ء):

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا   کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

بہر حال اس طرح کی فروگزاشتوں سے 'اردو لغت' جیسی ضخیم اور غیر معمولی لغت کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی، خاص طور پر اس لیے کہ جب بھی ہم برصغیر کی سطح پر اردو کے کسی موضوع پر کام کرنے کا منصوبہ بنائیں گے تو تمام ممکنہ مآخذ کی فراہمی ہمارے سامنے ہمیشہ ایک بڑا مسئلہ بنی رہے گی۔ پاکستان میں کام کرنے والوں کے لیے ہندوستانی مآخذ اور ہندوستان میں کام کرنے والوں کے لیے پاکستانی مآخذ تک رسائی اکثر انتہائی دشوار اور کبھی کبھی لاینحل مسئلہ بن سکتی ہے اور بنتی ہے جہاں پھر اچھے سے اچھے کام میں اس طرح کی فروگزاشتوں کا در آنا ایک فطری سی بات ہے۔

جاوید انور (وارانسی)

فرشتے کے آنسو

(ڈاکٹر بلندا قبال ۔ نئے افسانے ، نئی جہات)

صدیق الرحمان قدوائی نے افسانے کی تیکنک کے تعلق سے فرمایا ہے:

''کہانی میں تیکنک کا معاملہ بھی غور طلب ہے۔ تیکنک کے سارے انداز اگر احساس کی کسی نئی کروٹ کو راس نہ آئیں تو کہانی خود اپنے ساتھ کوئی نئی تیکنک لے کر آتی ہے جو نئی بھی ہو سکتی ہے، پرانی بھی اور نئے اور پرانے کے درمیان کوئی اختراع بھی۔ ہمارے مصنفوں نے تیکنک اور کہانی کی تلاش میں عالمی ادب کو خاصا کھنگالا، اُس سے تھوڑا بہت حاصل ہوا مگر خود اپنے ملک کی لوک کتھا اور علاقائی زبانوں کے ادب کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی دی جا سکتی تھی۔'' **(نیا افسانہ۔ مسائل اور میلانات، مرتبہ قمر رئیس۔ ص، ۱۰۴)**

بلند اقبال کے افسانوں کے مطالعے کے بعد میں ایسا کوئی دعوی تو نہیں کرتا کہ انھوں نے اپنے ملک کی لوک کتھا اور علاقائی زبانوں کے ادب کی طرف جتنی توجہ دی جانی چاہیے، دی ہے لیکن اُس کے اوپر صدیق الرحمان قدوائی نے افسانوں کی تیکنک کے تعلق سے جو کچھ بھی فرمایا ہے وہ بلند اقبال کے افسانوں میں موجود ہے (آگے اس پر تفصیل سے کلام کرونگا)۔ اس سے بھی میں انکار نہیں کرتا کہ غیر ملک میں رہ کر وہاں کی تہذیب و معاشرت کو اپنے اوپر حاوی نہ کرتے ہوئے وہاں کے کھوٹے کھرے کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد اور پورے ملک میں سکوت پزیر دوسرے ہم وطنوں کے آداب و اطوار کے آئینے میں پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہم وطنوں کے مزاج اور ماحول کا اپنی اصلی مٹی کے آئینے میں تجزیہ اُن کے افسانوں کے موضوعات میں اختصاص کے حامل ہیں۔ علاوہ بریں اپنی اصلی مٹی میں بھی فروغ پا رہے نت نئے تہذیبی، معاشرتی، ذہنی اور روحانی مسائل اُن کی افسانوی تخلیق کا محور ہیں۔ اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بلند اقبال نے جن اسلوبیات کا استعمال کیا ہے اُن میں واقعہ در واقعہ مکالمہ اور عمل کا امتزاج بہت نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اپنے مختلف افسانوں میں کچھ مختلف اسلوب اور افسانوی طریقہ کار سے کام لیا ہے مثلاً اُن کے افسانے ''یا بی بی سیدہ'' میں ایک ادرش ماں کے کردار کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ یہ اُن کی حقیقی ماں کا ایک پرتو ہے یا کلی طور پر اپنی ماں کے کردار کی حقیقت بیانی اُنہوں نے کی ہے۔ افسانہ اور حقیقت کا یہ اشتباہ اور افسانے کا برجستہ اختتام حیرت اور ماں سے جدائی کے کرب میں مبتلا کر دینے والا ہے۔

بلند اقبال نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے جن پہلوؤں کی نمائندگی کی ہے وہ اگر نئے نہیں تو انوکھے ضرور ہیں۔ الفاظ کا انتخاب کبھی کبھار اُنہیں تجریدی افسانوں مثلاً بلراج مین را، سریندر پرکاش اور

انور سجاد بالخصوص بلراج مین را کے افسانوں کی جھلک دکھا جاتا ہے لیکن موضوع اور مواد کے اعتبار سے افسانے پر مجموعی طور غور کیا جائے تو انکشاف ہوتا ہے کہ یہ تخلیق بلند اقبال ہی کی ہے۔ اُن کے بعض افسانوں میں مرکزی خیال قصہ پن کے زیرِ سایہ اس قدر پردے میں چلا جاتا ہے کہ تجسس کی پرت در پرت کھنگالتے ہوئے آخری پیراگراف اور بعض میں آخری ایک، دو یا تین سطروں میں کھلتا ہے (شکوہ)۔ اس افسانے میں واقعہ در واقعہ کے اس اسلوبیاتی عنصر کا استعمال کیا گیا ہے جیسے آغاز+ انجام اور پھر واپس انجام+ آغاز سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے وہی سے پھر اُس کی ابتدا ہوتی ہے۔ افسانے کا مرکزی موضوع آفاقی سوال (Universal Question) کی جو صورت اختیار کر گیا ہے، بلند اقبال کی اختراعی تیکنک کا مرہون منت اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ بہر حال مرکزی واقعہ درمیان سے شروع ہوتا ہے اور اس سے پہلے بھی تجسس کا ایک سلسہ جو ضمنی واقعہ میں ہے وہ بھی مرکزی واقعہ ہونے کا شبہ پیدا کرتا ہے۔ اس افسانے میں علت اور معلول (Cause and Effect) کا اصول بھی واضع ہے۔ لیکن بلند اقبال کے یہاں ایسے افسانے بھی مل جائیں گے جن میں علت اور معلول کے اصول نسبتاً کم اہمیت رکھتے ہیں یا نہ کے برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ درست کے علت اور معلول کے اصول بیانیہ (مکالماتی یا تجریدی) کے لیے ایک زمانے میں ناگزیز تھے۔ ارسطو نے بھی بیانیہ کے بنیادی اصولوں میں آغاز، وسط اور انجام کی ترتیب کو مقدم جانا ہے اور اس طرح علت اور معلول کا رشتہ بھی ناگزیز ہے۔ لیکن جدید افسانہ نگاروں نے علت اور معلول کے ان اصولوں کی بہت زیادہ پرواہ نہیں کی اور بعض افسانوں میں تو اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اس کی جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہ کہ زندگی کے معاملات جدید دور میں اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں جن کی مثال پچھلے زمانوں میں نہیں ملتی۔ اس لیے فکشن بالخصوص افسانے میں اظہار کے طریقے کو کسی ایک خانے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے متعدد کھلی راہیں درکار ہیں۔ ممتاز شیریں نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے بہت عمدہ کہی کہ: ’’کسی بھی تیکنک کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں تیکنک بہتر ہے۔۔ ہر موضوع اور مواد کے لیے الگ الگ تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے‘‘۔۔۔ بلند اقبال کے بعض افسانے جدید دور کے رجحان کی پیروی کرتے ہوئے زمان و مکان کی قیود کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض افسانوں میں تسلسل اور ربط کو کم اہمیت دی ہے اور شعور کی رو کو کافی حد تک اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ ان کا افسانہ ’’فرشتے کے آنسو‘‘ اپنے موضوع، مواد اور ہیت کے انوکھے طریقہ کار کی بنا پر بہت کامیاب افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں علت اور معلول کا اصول بھی ہے اور پلاٹ بہت پیچیدہ نہیں لیکن غائب راوی والے اس افسانے میں فرشتے کے مرکزی کردار سے جو بات پیدا کی گئی ہے وہ اظہار کے انوکھے اسلوب کے ساتھ ساتھ مکالمہ اور منظر کو ایک ڈرامائی کیفیت عطا کرتی ہے۔ اپنے اس افسانے میں موضوع بھی بلند اقبال نے بالکل نیا نہیں تو جدید اور انوکھا ضرور چُنا ہے۔

بلند اقبال کے افسانوں میں منظر نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بعض افسانوں میں منظر نگاری کی ضمن میں ہی انسانی زندگی کی کشمکش اور تصادم کی عکاسی ہوتی ہے۔ منظر کشی کے نئے مواد کی فراہمی اور اس کی فنی تراکیب ایسی ہوتی ہیں کہ وہ افسانوی بھی ہیں اور حقیقت بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منظر نگاری کے ان

اجزا اور منظر نگاری ہی کیا تمام افسانے اہم اجزا سے منسلک الفاظ کا انتخاب افسانہ نگار کے مزاج اُس کی علمی اور فکری رسائی، تخیلی صلاحیت اور میلان طبع پر منحصر ہوتا ہے۔ بلند اقبال نے منظر کشی کے زریعہ اپنے بعض افسانوں میں زندگی، سماج اور تہذیب کا جو مشاہدہ پیش کیا ہے وہ پلاٹ کے استحکام میں موثر صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ منظر نگاری کے ضمن میں جو واقعہ اُن کے افسانوں میں بیان ہوتا ہے اُس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افسانے سے منسلک ہو کر اپنی قدر و قیمت کا تعین تو کرواتا ہی ہے۔ اگر محض تحریری بیانیہ کے ایک ٹکڑے کو علیحدہ مفہوم و معنی کے تناظر میں بھی دیکھا جائے تو اس کے بطن سے دوسرے قوتمند افسانے کے جنم لینے کی صلاحیت اور اسی قبیل کے کسی دوسرے افسانے میں منظر نگاری کے طور پر شمولیت کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ سلیم اختر نے افسانے کی تکنیکی تنوع میں اس کے تمام اہم اجزا کے تعلق سے جو بات کہی ہے وہ کم و بیش بلند اقبال کے منظر نگاری کے فن پر بھی صادق آتی ہے۔ سلیم اختر فرماتے ہیں: ’’افسانوی عناصر واقعہ، کردار، منظر نگاری، مکالمے اور جذبات نگاری میں کمی بیشی کر کے تکنیکی تنوع پیدا کرنا جدید افسانہ نگارروں کا کارنامہ ہے‘‘ **(سلیم اختر۔ داستان سے افسانے تک ص ۵۴)**

بلند اقبال کے افسانے ’خدا کا بُت‘، ’اکیسویں صدی کی موت‘ ’انتظار‘ اور ’نروان‘ اُس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ژرار ژنیت نے جو خال ظاہر کیا ہے اس کا اطلاق بھی قاری اور سامع پر ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر قاری اور سامع اپنے اپنے علم اور بصری کینوس کے مطابق افسانے کو اپنے شعور میں جگہ دیتا ہے، اپنے وجدان کا حصہ بناتا ہے۔ لہذا قارئین اور سامعین کے نقطہ نظر سے معنی اور مفہوم میں تھوڑا بہت فرق تو لازمی ہے لیکن فنکاری یہ ہے کہ افسانہ اپنے اختتام پر اس قدر چست، پر اثر اور اگر ممکن ہو تو انجام اس قدر غیر متوقع ہو کہ اس آخری نکتے پر آ کر افسانہ نگار اور قاری یا سننے والے کا ذہن اگر مکمل نہیں تو قریب قریب ہم اہنگ ہو جائیں۔ یعنی افسانہ نگار جو پیغام دینا چاہتا ہے، جو بات کرنا چاہتا ہے وہ قاری اور سننے والے تک تھوڑا بہت تبدیل ہوتی ہوئی صورت میں ہی سہی، پہنچ جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فن کار پر ترسیل کی نارساء کا الزام ناگزیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ افسانہ نگار نے جو بات کہی ہے قاری اور سامع کا ذہن وہی تک پہنچ کر ختم ہو جائے یا وہی مقید رہ جائے بلکہ معاملہ دراصل یہ ہے کہ وہ بات یا پیغام جس کا اظہار افسانے نگار نے افسانے میں کیا ہے اس کے علاوہ بھی معنی و مفہوم کی جو پرتیں افسانے میں موجود ہیں اس کے لیے بھی راستہ بالکل کھلا اور ہموار ہو۔ بات پہنچا دینے یا پیغام پہنچا دینے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ افسانہ نگار نے اپنی سوچ قاری اور سامع پر مسلط کر دی اور اب اس کی آنکھ سے افسانے کو دیکھنا اور سمجھنا ہو گا بلکہ فنکار کا عندیہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی تخلیق کا اختتام اس جگہ کرے جہاں اُس کا تخلیقی مقصد بھی پورا ہو اور قاری اور سامع کو اپنے اپنے طور پر معنی و مفہوم اخذ کرنے کی مکمل آزادی بھی ہو۔ بلند اقبال اپنے افسانوں میں کافی حد تک اس دشوار مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں (نہیں، اندھا فرشتہ، فورتھ ڈائمنشن، ستیہ کے بکھرے ہوئے بال)۔۔۔۔ بلند اقبال نے اپنے افسانوں کے لیے جب موضوعات کا انتخاب کیا ہے اُن میں سے بیشتر ایسے تجربے ہیں جو اس سے قبل بہت کم کیے گئے ہیں۔ اور جس سے جدو جہد کرتے ہوئے نیا فنکار اپنے دور میں اُنھیں سر کرنے کی تلاش میں سرگرم ہے۔ ان نئے مسائل کا انسلاک ذہنی، علاقائی، سیاسی، نفسیاتی اور بنی

نوع انسان کے شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری مسائل سے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی فردیت کے عجیب و غریب الجھتے ہوئے تصورات سے بھی ہے (نروان) ان نئے مسائل کا خوف نئے ذہن کی تازہ اور نو حیاتیاتی قوتوں کی برانگیخت کرتے ہوئے جہاں سرعت، شدت اور تندی اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے وہی اپنی مٹی کی طرف جو کہ اس کی پرانی پناہ گاہ ہے، کی طرف بھی کبھی کبھار پلٹ کر دیکھنے کو مجبور کرتا ہے لیکن یہاں بھی ذہنی غیر آہنگی اور اک طرح کے ردعمل اور کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔''فورتھ ڈائمینشن'' بھی اپنی نوعیت کا ایک انوکھا افسانہ ہے۔جس کا پلاٹ بعض اوقات ایک فلسفے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پُرسراریت کو متن کی توسیع نے کوئی نیا معنی تو نہیں دیا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس افسانے پر ضمیمہ نگاری کی تکنیک کے چند اصول پوری طرح صادق آتے ہیں اور بلند اقبال کو نئے عہد کے ایک معتبر تخلیق کار کی صورت میں مستحکم کرتے ہیں۔ یہاں ضمیمہ نگاری کی تکنیک کے چند اصولوں پر بلند اقبال کا افسانہ پورا اترتا ہے کا بیان بھی ناگزیز ہے۔اول تو یہ کہ کسی پرانے موضوع یا متن کی اپنے عہد کے سیاق میں ازسرنو دریافت کی جائے اور اسے ترمیم واضافے کے عمل سے گزارے کے بعد نئے سماجی، سیاسی اور معاشرتی ڈسکورس پر اس کے معنی کے اطلاق کی راہیں متعین کی جائیں یا راہیں تلاش کر کے ان کی نئی ادبی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی جائے۔دوئم یہ کہ پرانے مواد کو نئے اسلوب میں پیش کر کے ان معنی کی نئی جہات کو کھنگالا جائے۔

''فورتھ ڈائمینشن''میں جو موضوع اور مواد پیش کیا گیا ہے وہ اردو کی داستانوی تاریخ سے لیکر پریم چند کے افسانوی عہد اور اسکے بعد آج تک اپنی مختلف صورتوں میں منکشف ہوتا رہا ہے یا اُسے برتا جاتا رہا ہے۔ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک میں اُس کی نوعیت بھی مختلف رہی ہے۔ بلند اقبال کا کمال یہی ہے کہ اُنہوں نے متن کی توسیع کا استعمال کرتے ہوئے اس کو الگ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ واقعہ در واقعہ کی تکنیک کے انسلاک نے اس کے اختیار اور معنویت میں اضافہ کیا ہے۔اس طرح بلند اقبال کا ایک افسانہ''خدا کا بُت'' ہے جو اپنی ڈرامائی کیفیت اور موضوع کی انفرادیت کے سبب بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بلند اقبال نے اپنے افسانوں میں مکالمے کو بہت کم جگہ دی ہے۔زیادہ تر افسانے غائب راوی کے ذریعہ بیان ہوتے ہیں اور مرکزی کردار کے احساسات کو حاضر راوی، غائب راوی اور کبھی منظر کشی کے توسط سے خود کلامی کی صورت میں ابھارا گیا ہے۔ دراصل جدید عہد میں جدید نفسیات جس کی اساس شعور اور لاشعور میں پیوست کبھی ظاہری طور پر سماج اور معاشرے کی عطا کردہ اور کبھی باطنی طور پر ذات اور روحانی کرب کی عطا کردہ ذہنی گتھیوں کی نشاندہی اور اُس کی تفہیم و تشریح پر منحصر ہے، نئے افسانے میں بہت قوت اور علاماتی ذرائع کے طور پر سامنے آئی ہے۔سلیم اختر کا کہنا غلط نہیں ہے کہ

''افسانے پر لکھنے والے بیشتر ناقدین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جدید افسانے کی تکنیک میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہ نفسیات کی مرہون منت ہے۔'' **(سلیم اختر،نفسیاتی تنقید،ص ۲۷۰)**

بلند اقبال کے افسانوں کے اس مختصر جائزے سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم سے افسانوی ادب کی بہترین خدمت کی توقع کی جاسکتی ہے۔

عبدالرب استاد (گلبرگہ)

شاعرِ خوش نوا، طائرِ بلند پرواز،

خالق ''بام بقاء'' : طاہر عدیم

طاہرؔ عدیم کا مجموعہ بام بقاء میرے ہاتھوں میں ہے۔کلام اور کلیم دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے سے یہ عقدہ کھلا کہ دونوں ہی علیم و عدیم ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ کسی بھی شخص کے ہوگا، تبھی اس کے متعلق کبھی کہا جاسکتا ہے۔اب میری مجبوری یہ ہے کہ میں طاہر عدیم قطعی واقف نہیں ہوں۔اور نہ مجھے وہ جانتا ہے۔اب صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔کہ اس کے کلام سے اس تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ناچیز ایک ادنیٰ طالب علم اور طاہر عدیم ٹھہرا شاعر اور فنکار، بہر حال بساط بھر کوشش کے ساتھ اس بام پر قدم رکھنے کی سعی کر رہا ہوں۔ ویسے حضرت غالبؔ کو بھی انتخاب شعر نے رسوا کر دیا تھا۔خیر اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد مجھے یک گونہ خوشی اور انبساط حاصل ہوا کہ چلو جتنا یہ بندہ خوبصورت ہے (تصویر کے دیکھنے سے) کتاب بھی کچھ اسی طرح خوبصورت ہے۔اور یہ سب خیال کی پاکیزگی، کلام کی روانی، بیان کی شستگی سے چھلک رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ طاہرؔ عدیم کچھ نیا کر دکھانے کی کوشش اور لگن میں مست ہے۔

عموماً مجموعوں کی ابتداء حمد و نعت ہی سے ہوتی ہے۔ بام بقاء بھی اسی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔البتہ اس روایت میں جدت ملتی ہے اور وہ یہ کہ حمد و نعت غزل کے پیرایہ میں ہے۔حمد کیلئے جو انکساری اور عجز بیان ہونا چاہئے۔وہ انکے یہاں بدرجہ اتم ہے اور نعت کیلئے جس محبت اور خلوص عشق کی ضرورت ہے وہ عمدگی سے بیان ہوئی ہے۔حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں،

یہ میں کہ ابجد سے ناشناسا وہ تو کہ سوچوں سے ماورا ہے
تیری محبت کی روشنی سے چراغ آنکھوں میں جل رہا ہے
میں خوش نصیبی کی انتہا پر یہ تیری بخشش کی ابتداء ہے

یقیناً وہ خوش نصیب ہے کہ عنفوان شباب میں ہی فن پورے شباب پر نظر آتا ہے، اس کوشش و کاوش کو پھلنا اور پھولنا چاہئے۔نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپؐ کا قرب، آپؐ کا دیدار میرے ہر زخم کی دوا ہوتا
پھول بن کر عدو کے کانٹوں پر آپؐ کی راہ میں بچھا ہوتا

کلام کے متعلق شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہؓ کا قول ہے کہ

''انسان زبان کے پردے میں چھپا ہوتا ہے، کلام کروتا کہ پہچانے جاؤ''

کلام ہی سے شخصیت کی پہچان ہوتی ہے، کلام ہی ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس سے اس کو پرکھا جاسکتا ہے۔ گلبرگہ (کرناٹک) کے معروف شاعر سلیمان خطیب نے ایک نظم میں کہا کہ ؎

بات ہیرا ہے بات موتی ہے — بات لاکھوں کی لاج کھوتی ہے
بات ہر بات کو نہیں کہتے — بات مشکل سے بات ہوتی ہے
بات بولے کلیم ہو جائے — سننے والا ندیم ہو جائے

بلاشبہ عدیمؔ کے کلام کو پڑھنے والا ندیم ہو ہی جاتا ہے۔ کیونکہ طاہر عدیم جواں سال شاعر تو ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری اور کلام کی جولانی قاری کو اپنے حصار میں کر لینے کا ہنر رکھتی ہے۔ اس وقت ادب میں ایسے نوجوان شعراء کی کمی محسوس ہوتی ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کا اظہار کھل کر شعر و ادب کے حوالے سے کر سکیں۔ بشرؔ نواز نے ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ آج ادب میں جو بھی نیا شاعر آ رہا ہے اتفاق سے وہ چالیس سال کی عمر سے تجاوز کیا ہوا ہی نظر آتا ہے۔ بیس سے تیس سال کا نوجوان مجھے نظر نہیں آ رہا ہے، ایسے نئے شعراء کو ادب میں آنا چاہئے، انھیں لکھنا اور ادب کی آبیاری میں جت جانا چاہئے۔ طاہر عدیم کے کلام کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے اور خوشی بھی ہوتی ہے کہ آج بھی ایسے نوجوان ہماری اردو دنیا میں معدودے چند ہی سہی موجود ہیں۔ طاہر عدیم جس نے عمر کی تین دہائیاں گذاریں اور چوتھی سے گذر رہے ہیں۔ اس میں مجموعہ کلام کا چھپنا قابلِ تعریف ہے۔

''بامِ بقاء جس میں ۱۰۱ غزلیں، ۱۰ نظمیں اور آدھا درجن قطعات شامل ہیں۔ غزل جس نے کئی ادوار دیکھے، نشیب و فراز سے گذری، معتوب کم اور مقبول زیادہ رہی، جو حسن و عشق کے پردے میں مسئلہ ذات کے ساتھ ساتھ مسائل حیات و کائنات کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہوئے اپنی زندگی کا ثبوت دیتی رہی، جس نے چراغ سے چراغ جلانے کا کام سرانجام دیا، استاد شعراء کی بصیرانہ روشنی سے نئے شعراء کیلئے راہوں کو منور کرتی رہی، اور نئے شعراء بھی نئی لفظیات، نئی تراکیب اور نئی علائم سے غزل کو سنوارتے جا رہے ہیں جن میں طاہر عدیمؔ ایک ایسا نام ہے جو اساتذہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی ایک الگ راہ بنانے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ مشرق مزاج یہ مشرقی شاعر زندگی تو مغرب میں گذار رہا ہے لیکن پھر بھی مشرقی صنفِ سخن میں طبع آزمائی میں لگا ہوا ہے۔

بامِ بقاء کی غزلوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طاہر عدیم نے اپنے مجموعہ میں جہاں سہلِ ممتنع اور سادگی میں اشعار کہے ہیں وہیں ہجر کے لمحات کو بھی پیش کیا ہے۔ اساتذہ کے رنگ میں جدت طرازی کا ثبوت دیتے ہوئے معاشرہ میں ہونے والی اتھل متھل کو پیش کیا۔ مولانا حالیؔ نے شعر کی خوبیوں میں سے ایک خوبی

سادگی (شرط) بتائی تھی۔ رود کیا تھا''......خیال ایسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو، اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحاور اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں''۔ طاہر عدیمؔ کے یہاں خیال کی بلندی بڑی سبک روی کے ساتھ ملتی ہے۔ اور وہ محاورہ اور روزمرہ کا استعمال بھی فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

؎ گفتگو میں اس قدر مالک ہے وہ تاثیر کا — اس زمیں پر چلتا پھرتا جیسے مصرعہ میرؔ کا
؎ ایک دنیا مری آباد تری ذات سے تھی — ہو سکا میں نہ کسی کا جو تمہارا نہ ہوا
؎ جب نظر میں برہنگی ناچے — لاکھ پردہ، حجاب کیونکر ہو

ظالم و مظلوم کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں، ہاں ہر عہد کا اپنا انداز رہا ہے۔ آج باوجود سائنسی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی و انٹرنیٹ کی ترقیات کے انسان، انسان کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا ہے۔ مفاد آج کے انسان کا مسلک بن گیا ہے۔ اسی مفاد کی خاطر وہ کچھ بھی کر گذرنے کو تیار ہے۔ مظلوم، انصاف کی دہائی دے رہا ہے مگر اس کی کوئی سننے کو تیار نہیں ہے۔ رشوت ستانی عام ہے بھلا ایسے میں کہاں انصاف، حکومتیں بھی وعدے کرتی ہیں، کمیشن بٹھاتی ہیں، جانچ کروانے کا تیقن دیتی ہیں، مگر ہائے رے انصاف دیکھئے طاہر عدیمؔ نے کیا کہا ہے۔

یوں تو کیا کیا نہ پڑاؤ مری بستی میں پڑے — ایک انصاف کے خیمے تھے کہ ڈالے نہ گئے

اس دور کو عموماً تشکیک، بے یقینی اور بے زمینی سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ ایک سیدھے سادے آدمی کو زندگی گذارنا بڑا دشوار ہے کیونکہ چالا کیا اور عیاریاں اس قدر ہو گئی ہیں کہ بقول محمود سروش ؎

بدلا ہے مذاق اس طرح ابنائے زمانہ — معیوب کو معیوب بتانا بھی برا ہے

مگر طاہر عدیم اسی تشکیک سے دوچار نظر آتے ہیں۔

؎ فلک کو دیکھوں تو ڈر ہے زمیں کے چھننے کا — زمیں کو دیکھوں تو ڈرتا ہوں آسماں نہ رہے

طاہر عدیم نے اساتذہ سخن سے استفادہ کیا ہے مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ان کے یہاں جدت طرازی نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے کے بعد ذہن معاً اساتذہ کے کلام کیطرف جاتا ہے۔ جیسے ؎

طاہر عدیم: اس بھری دنیا میں طاہرؔ ان گنت شہکار ہیں — شہر میں چلتے ہوئے ہر آدمی پر غور کر
میرؔ: سرسری ہم جہان سے گذرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
طاہر عدیم: اس کو سوچوں تو یہ دیکھوں وہ قیامت ہے عدیمؔ
اس کو دیکھوں تو یہ سوچوں کہ قیامت کیا ہے؟
فانیؔ: ذکر جب بھی چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک

قافیہ غزل کی جان اور مرکز ہوتا ہے مگر ردیف اس کو چمکانے والی ہوتی ہے۔ اور لکھنو کے شعراء میں انشاء، مصحفیؔ، شاہ نصیر وغیرہ کی ردیف، کہیں انوکھی تو کہیں لمبی لمبی ہوا کرتی تھیں جیسے، الٹا لکھی، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں وغیرہ، یہاں طاہر عدیم کے ہاں بھی اس میں کچھ نیا پن محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مختلف ردیفیں

استعمال کی ہیں۔ جیسے، آگ، مٹی، پانی، ہوا، چراغ، دائرے، آنکھیں، خواب، گفتگو، بارش، کافی، شکار وغیرہ وغیرہ، اس کے ساتھ ہی ان کی غزل میں نئی لفظیات اور تراکیب بھی ملیں گے جیسے، دعا کے جگنو، سوچوں کے چراغ، دشت، افکار، کشتِ سخن، اناؤں کے بھرم، روزن چشم، خئیمہ جسم ناتواں، ارتعاش لمس، کشت رمز ہنر، طبیب عشق بتاں، یدوضع ستم، دریدہ جسم، بریدہ خواب وغیرہ، اور ہندی لفظیات کا استعمال بھی ملتا ہے، جیسے، آکاش، دھنک، گھائل سخن، بےانت، اور، پرایا دیس، پرم پرائیں، وغیرہ وغیرہ۔

بام بقاء کی صدفی صد غزلوں میں دس فی صد نظمیں اپنے تنوع اور موضوع کے اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں، غزلوں پر سبقت لے گئی ہیں۔ ان کا تسلسل، ان کی لے، بندشیں اور لفظیات واقعی دل موہ لیتے ہیں۔ نظم وہ ''جو خواب تھا'' ایک سماں باندھ دیتی ہے۔ دریا کی سی روانی اس میں ملتی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ذہن افتخار عارف کی نظم گیارھواں کھلاڑی کیطرف چلا جاتا ہے۔ اور نظم ''بچھڑ کے اس سے میں کیا کروں گا''۔ ایک ایسی شخصیت کے وصال پر لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس میں لفظوں کے ارتباط نے ایک لے پیدا کر دی اور وہ لے ہر کسی کی حس کو بیدار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی دوری کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ ایک بیٹا اپنے باپ یا ماں کے فراق کو جھیل نہیں پا رہا ہے یا ایک غلام اپنے آقا کی جدائی کو سہہ نہیں پا رہا ہے۔ انتہائی جذباتی انداز میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ اسی طرح ''تم کبھی بے وفا نہ کہنا، خواب سے حقیقت تک، نشان صورت منزل کہاں ہے۔ محبت ہی محبت، نظمیں بہت عمدہ ہیں۔

بلا شبہ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ طاہر عدیم نئی سوچ اور فکر رکھنے والا شاعر ہے، جس نے اپنے چمن شعر (بام بقاء) کو سنوارنے، اس کی تہذیب و تدوین میں بڑی محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اس چمن شاعری کا ایسا مالی ہے جس نے بام بقاء کو سادگی اور سہل ممتنع کے پانی سے سیراب کیا، اس میں نئی لفظیات کی سبزہ زاری کی، ہندی لفظیات کی گلکاری کی، اور نئی لفظیات، تراکیب کی گل افشانی و نیز قطعات کے بیل بوٹوں سے اسے مزین و آراستہ کیا۔ ہاں کہیں کہیں کوئی پھول مرجھایا سا لگتا ہے، شاید اس پر دھیان نہیں دیا گیا۔ منجملہ کامیاب اور اچھی کوشش ہے۔ میں اس کوشش اور جرائت کے لئے انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور دعا گو ہوں کہ یہ سعی سخن گوئی آنے والی کوششوں کا پیش خیمہ ہو اور ہر کوئی یہ کہے کہ ؂

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

آخر میں وہ اشعار جو مجھے پسند آئے:

مرے لفظوں پہ وہ رکھتا تھا دعا کے جگنو کتنے روشن مرے اشعار کیا کرتا تھا
وہ جلاتا تھا لہو سے مری سوچوں کے چراغ دشت افکار کو گلزار کیا کرتا تھا
آج بھی اس کی دید کی طاؔہر پڑی نہ کچھ خیرات آج بھی خالی رہ گئے میری آنکھوں کے کشکول
انہی کو وجہ عروج شعور کہتا ہوں میں جن کو پیار سے طاؔہر حضور کہتا ہوں

اس بھری دنیا میں طاؔہر ان گنت شہکار ہیں شہر میں چلتے ہوئے ہر آدمی پر غور کر
ہم اہل عشق کا یارو! یہی تو شیوہ ہے لہو زمیں کیلئے ہے تو سر سناں کیلئے
آنکھوں میں ہے سات سمندر گہرائی ابرو میں آکاش خمیدہ لگتا ہے
دیار یار سے ہم کو نکالنے والو اب اپنی آنکھ سے دیکھو کہ چار سو ہم ہیں
شام ہوتے ہی جانے کیوں طاؔہر دل مرا سوئے ''شام'' ہوتا ہے
زندگی میں تو خیر کیا کرتا زندگی نے مجھے گذارا ہے

طاہر عدیم کی شاعری چھوٹ جانے والی سرزمینوں کی طلب اور ان کی جانب مراجعت کی خواہش کی شاعری ہے۔ اس کی شاعری میں موجود زمانے کے دکھوں، سکھوں کا احساس تو ملتا ہی ہے، ایک ہجر کی کسک اور واہمے کا سایہ بھی نظر کی روشنی کو کاٹتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ احساس ان شاعروں کی شاعری میں گہرا نظر آتا ہے جنہیں تلاشِ معاش یا کسی اور سبب سے جلا وطن ہونا پڑا۔ طاہر کے ساتھ بھی مسئلہ یہی ہے۔ وہ عرصے سے جرمنی میں مقیم ہے اور پاکستان کی جانب سے چلنے والی ہواؤں کا منتظر رہتا ہے۔ انتظار کا یہی منظر نامہ ہی دراصل اس کی شاعری کا ظہور ہے۔

منیر نیازی (بامِ بقا کے فلیپ سے)

اس مجموعے (بامِ بقاء) میں شامل ایک سو دو غزلوں میں بہت ساری شعری ساما گری دلپذیری کے رنگ رکھتی ہے کہ نگاہ و دل ٹھہرتے ہیں، دماغ سوچتا ہے اور پھر طاہر، قاری کے یادبسیروں میں خوشبو کی طرح بس جاتے ہیں۔۔۔'بامِ بقاء' کا تمام تر شعری لوازمہ 'عشق دل' کے وہ نغمے ہیں، جنہیں ہر اک دل گنگنانا پسند کرتا ہے۔ پورا مجموعہ ہی ایسا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنے مترنم لحن سے تمام شاعری آپ کی سرگمی سماعتوں میں سمو دوں۔

افتخار امام صدیقی

(اقتباس از **طاہر عدیم۔۔۔ نئے شعری ذائقے کا شاعر**۔ مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی ص ۴۸)

بامِ بقا کا مطالعہ ایک ایسے معاشرے کا مطالعہ بھی ہے جو سچ، جھوٹ، تہمتوں، بدنامیوں، اُمّیدوں اور ناکامیوں وغیرہ جیسی سب وارداتوں سے بھرا نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ طاؔہر عدیم سے بہت سی توقعات وابستہ کی جاچکی ہیں کیونکہ فطرت نے بھی اسے اپنے میدان میں ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس کر رکھّا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اپنے فن کو کمال کی بلندیاں عطا کرنے کی سنجیدہ کوشش کب کرے گا۔ ایسی کوشش جس میں سسکتی اِنسانیت، اِرد گرد موجود بِگاڑ اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی وارننگ ہوگی۔

ظفراللہ محمود

(مضمون ''دہلیزِ محبت پر آنکھ کھولنے والا شاعر'' سے اقتباس۔ بحوالہ **عکاس** اسلام آباد شمارہ ۷، جون ۲۰۰۸ء)

ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر)

فکرِ عظیم

ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش کے مضامین کا پہلا مجموعہ " فکرِ عظیم " کے زیرِ عنوان نومبر ۲۰۰۷ء میں اکرم پبلی کیشن' حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کو آپ کے فرزندِ دلبند محمد علیم الدین بخش نے مرتب کیا ہے۔ یہ تصنیف' دراصل ایک دلِ دردمند کی پرسوز صدا ہے۔ جس کے ہر صفحے سے حق گوئی و بے باکی اور راستبازی کا برملا اظہار ہوتا ہے تو ہر سطر سے مصنّف کی سیاسی وسماجی' بین الاقوامی وقومی' مذہبی ومعاشرتی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصنیفِ ہذا کی اشاعت میں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا تعاون بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش تقریباً (۵۰) برسوں تک شعبۂ ویٹرنیری وشعبۂ پولٹری سے وابستہ رہے اور اس سلسلے میں آپ کو مختلف ملکی وغیر ملکی کمپنیوں کی ملازمت بھی کرنی پڑی۔ بزنس کو فروغ دینے کی غرض سے زندگی کا بڑا حصہ خلیجی اور یوروپی ممالک میں بسر ہوا۔ مقامِ حیرت ہے کہ شدید مصروفیت کے باوجود آپ کو لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ راقم السطور کو بلا مبالغہ یہ اعتراف ہے کہ آپ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے' ان کو پوری وضاحت اور تفہیم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثالوں اور دلائل سے تحریر میں تقریر کا حسن پیدا ہوا ہے اور اس بات کی نفی ہوئی ہے کہ مذہب اور ادب' جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے' صرف انہی ہنرمندوں اور دانشوروں کا قلم گلکاریاں پیش کرتا ہے۔ علم وحکمت کو کسی ایک مخصوص قوم یا فرقے کی امانت نہیں کہا جا سکتا۔ جو بھی یقین محکم اور عمل پیہم کا مظاہرہ حصولِ علم وحکمت کے ضمن میں کرتا ہے' علم وحکمت کا چراغ اسی ذہن میں روشن ہوتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف کی ایک خاصیت یہ ہوا کرتی تھی کہ ان کے سبھی کردار اسمِ بامسمّٰی ہوتے تھے۔ یعنی کردار کے نام سے ہی قاری کو کردار کے ظاہر وباطن سے واقفیت فراہم ہو جاتی تھی۔ مثلاً اکبری (بڑی بہن) اصغری (چھوٹی بہن) مرزا ظاہر دار بیگ (بظاہر دولت مند اور اشراف طبقے سے تعلق جوڑنے والا) ہریالی (طوائف) وغیرہ۔ یہی مثال ہمیں ڈاکٹر عظیم الدین بخش کے ہاں بھی ملتی ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف کے ذریعے' نو (۹) ابواب کے تحت جملہ بیس (۲۰) مضامین' ایک ناولٹ کی دو اقساط اور ایک تبصرے کی پیش کشی اس طرح کی ہے کہ ہر باب کا عنوان قاری کو خود ہی بتاتا ہے کہ مضمون کا موضوع کیا ہے۔

مضمون "بوند! بوند!" کا مطالعہ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ علّامہ ابنِ خلدون

کا مقولہ ہے کہ "اسباب وعلل کا قانون ہر جگہ کام کرتا ہے۔ 'بوند! بوند!' اسباب وعلل کے قانون کی حقیقی مثال پیش ہے۔ 'بنتِ حوّا' میں ساس اور بہو کے معاملات اور واقعات کے پسِ پردہ ایک اہم پیغام یہ ملتا ہے کہ بیشتر گھرانوں میں عورت کو مرد کے مقابلے میں بے قیمت اور گھٹیا شئے کی طرح دھتکارا جاتا ہے۔۔۔۔ حالانکہ وہ بیوی بن کر ایک خاندان کی بنیاد رکھتی ہے۔ ماں بن کر بچوں کی کردار سازی کرتی ہے اور بہو بن کر ساس' سسر دیور اور نندوں کی ذمہ داریاں اٹھاتی ہے۔ اگر اسے گھر میں مرد کے برابر مساوی حقوق ملیں تو وہ اپنی بہوؤں سے بیٹیوں جیسا سلوک کر کے گھر کی چار دیواری کو مانندِ جنّت بنا سکتی ہے لیکن' بارہا وہ مردوں کی انانیت کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ "ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں" کی تفسیر وتصویر کشی کا ہنر مضمون "آؤ! آؤ! آؤ!!' میں ملتا ہے۔ جس میں ایک کبوتری کو سمبل بنا کر ڈاکٹر صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خلوص ومحبت کا برتاؤ' نہ صرف انسانوں کو بلکہ جانوروں پرندوں کو بھی رام کر لیتا ہے۔ اس مضمون کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ پرندوں اور پالتو جانوروں سے یہ سیکھا جا سکتا ہے کہ وہ جس گھر میں رہتے ہیں وہاں اگر کھانے کے لیے کبھی کچھ کم بھی پڑ جاتا ہے تو وہ دوسرے گھر کی لالچ میں اپنا گھر نہیں چھوڑتے' جبکہ آج کا انسان سویلائیزڈ اور کلچرڈ ہو کر بھی بے زبان پرندوں اور جانوروں سے بھی گیا گزرا ہو گیا ہے' جس کی بھوک کہیں بھی اور کسی سے بھی مٹتی نظر نہیں آتی۔

راقم السطور کو ڈاکٹر عظیم الدین بخش کی بہت ساری تحریریں' جن میں سفرنامۂ کینڈا/امریکہ' سفرنامۂ قبرص/سائپرس' تبصرے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا موقع ملا ہے' جن کے حسن وانداز کا اعتراف نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔ آپ کی بیشتر تحریروں کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ افسانوی انداز کے حامل ہیں۔ جس طرح افسانوی ٹیکنیک قاری کو باندھے رکھتی ہے ' اسی طرح آپ کے کئی ایک مضامین بھی اپنے اختتام تک ڈرامائی انداز سے آگے بڑھتے ہیں۔" فکرِ عظیم "میں ایک مضمون "معمارِ قوم " بھی ہے' جو' سلوا کیہ' کے صدر مقام 'براتسلا واء' کی ایک شام کی داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہ مضمون بزنس ٹرپ پر مشتمل خوبصورت سفرنامہ بھی ہے اور ایک شاندار افسانہ بھی۔ 'براتسلا واء' کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات (۴۰) سال کی لگ بھگ عمر والی خوش پوشاک خاتون سے ہوتی ہے' جو انگلینڈ کی تعلیم یافتہ ہے اور بہترین انگلش جانتی ہے۔ شام کا وقت' اجنبی ماحول' آخری فلائٹ ہونے سے کرنسی بنک بھی بند ہو چکی ہے۔ بارش کی ہلکی بوندا باندی میں موزوں ہوٹل کی تلاش کا مسئلہ بھی دامن گیر ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے بیگ کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہے اور ان کے ساتھ مزید چار وزنی آئیٹم بھی ہیں۔ ایسے میں وہی خوش پوش خاتون اپنی کار کے نہ آنے سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دو بسوں کو بدل کر سفر کرتی ہے اور برق رفتاری کے ساتھ ان کا سامان اتارنے' چڑھانے میں بھی ان کی مدد کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور خوش پوشاک خاتون کے دورانِ سفر' قاری کو U S S R کے زوال اور ۱۹۹۴ء کے پراگ (Prague)' چیک (Czek) بڈھاپسٹ (Buda-pest)' ہنگیری (Hungery)' کے سماجی وتہذیبی' اقتصادی وسیاسی حالات

سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے اور پولینڈ‘ یوکرین‘ اور آسٹریا کی علاقائی کشمکش کا مختصر حال بھی قاری پر کھلتا ہے۔ بس کے سفر میں اس ہمدرد خاتون کو ڈاکٹر صاحب اپنا کاروباری تعارف پیش کرتے ہوئے سلواک ریپبلک میں اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے‘ ڈاکٹر صاحب کے دورانِ قیام آئندہ بھی مدد کا وعدہ کرتی ہے اور اپنا شناختی کارڈ دیتے ہوئے اگلے اسٹاپ ‘Skolska’ پر اتر جاتی ہے۔ کارڈ پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر صاحب کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے۔ اس خاتون کی سادگی‘ سچائی‘ اور مقام و مرتبے کا موازنہ ہندوستان میں اس کے ہم رتبہ لوگوں سے کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ وہ خاتون "Madam Gabriela kaliska" ‘براتسلاواء‘ کی ایم۔ پی‘ ہونے کے علاوہ نیشنل کونسل کی ممبر اور پلاننگ کمیشن و انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کی ممبر تھی۔

فکرِ عظیم "ٹائپنگ کی چند ایک غلطیوں سے صرفِ نظر صالح اور صحت مند واقعات کے اظہار پر مبنی ڈاکٹر صاحب کی دیدہ زیب تصنیف ہے۔ جس میں ’چہرہ‘ ’ہماری جمہوریت میں الیکشن کے جلوے‘ ’کاروانِ حیات کی حقیقت‘ ’فطرتِ انسانی اور قانونِ قدرت‘ ’حیاتِ عبدالقادر جیلانیؒ‘ ’معمارِ قوم‘ ’ڈر‘ ’پرانی تہذیب‘ ’کیا ابھی وقت نہیں آیا‘ ’انا پرستی ایک نفسیاتی بیماری‘ ’ہاتھوں کی کمائی‘ قابلِ ذکر مضامین ہیں۔ جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کا پہلو بھی شامل ہے اور غیرت و عبرت کا احساس بھی۔ مذکورہ مضامین کے کچھ اقتباسات بطورِ ثبوت ملاحظہ ہوں:

’’خونِ جگر پلا پلا کر اور پھر عمر میں آنے پر لڑکے والوں کی منڈی میں سجائے رکھنا کہ لو دیکھو یہ مال برائے فروخت نہیں‘ بلکہ تحفہ میں مع تمام اسبابِ زندگی کے مفت میں پیشِ خدمت ہے۔ ساتھ میں زندگی بھر کی غلامی کی سند کے ساتھ !!‘‘ **(بنتِ حوا۔ ص ۱۵)**

’’اوہ ! شٹ !! سیما ڈارلنگ‘ میں نے تو اس کی فیشیل فیچرس ہی دیکھے ہیں فیزیکل فیچرس نہیں دیکھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم تو جانتی ہو کہ وہاں امریکہ میں ہم لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو ’’اچھی طرح‘‘ دیکھنے کے بعد ہی شادی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اور یہاں ممّی پپّا نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ لڑکی ہینڈسم اور اچھی ہے۔ اس لیے جلدی میں یہ بے وقوفی کر بیٹھا۔‘‘ **(پرانی تہذیب۔ ۱۰۹)**

"وہ ملک ملک گھوم کر ڈالر اور پونڈ اور ریال کمانے کو ہی اپنی کامیابی سمجھتا رہا۔ مگر اس کی غیر موجودگی میں یہ دینار و درہم‘ وطن میں کیا گل کھلاتے رہے وہ سمجھ ہی نہ سکا اور سمجھنے تک دیر ہو چکی تھی۔ بچوں کے نزدیک دوستوں کے مقابلے میں ماں باپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بیوی کے مشاغل کچھ اور ہی ہو گئے تھے۔‘‘ **(’بے چارہ‘۔ ص ۴۳)**

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سپوت و شاعر‘ ضیا قادری صاحب نے ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش کی مذکورہ تصنیف پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بجا طور پر اور فی البدیہہ کہا تھا:

فکرِ عظیم‘ اصل میں فکرِ عظیم ہے اہلِ دکن کو ناز ہے اردو کلیم ہے

آپ کے خطوط، ای میلز، تاثرات

جدید ادب ۱۱ کے لیے شکر گزار ہوں۔ مجھے حسن عباس رضا کے گوشے اور عمران شاہد بھنڈر کی تحریروں سے بہت روشنی ملی۔ نثر و نظم کے انتخاب میں اگر یہ معیار قائم رہ سکا تو آپ کا رسالہ عام رسالوں سے مختلف اور بہت بہتر ہو جائے گا۔ اردو میں زیادہ تر پڑھنے اور لکھنے والوں کو افکار سے زیادہ دلچسپی اشخاص میں ہوتی ہے۔ یہی روش گھٹیا ادب کے فروغ کا سبب بنتی ہے۔ **شمیم حنفی** (دہلی)

آپ کے موقر جریدے کا تازہ شمارہ موصول ہوا، آپ کے افسانوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتاب ہمراہ پائی۔ ہر دو عنایات پر میں آپ کا احسان مند ہوں۔ آپ مغربی دنیا میں سانس لیتے ہوئے مشرقی ادب و فن کی آبیاری کا گراں قدر فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اس پر بھی میں آپ کا احسان مند ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست و توانا رکھے اور آپ اسی طرح سے علم، ادب اور تہذیب کی آبیاری میں مصروف رہیں۔

فتح محمد ملک۔ صدر نشین مقتدرہ۔ اسلام آباد

افتخار عارف کی طرف سے رسید بنام ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دھلی

Educational Publishing House,Delhi - India.

Dear Sir,

I thankfully acknowledge receipt a copy of the following each book, published by the Educational Publishing House, Delhi:-

1. And I Wait - Haider Qureshi 2. Jadeed Adab - Issue 11

I am personally grateful for your kind gesture. These publication will certainly be a good addition in my present collection of books.

With profound regards, Sincerely, (IFTIKHAR ARIF).

جدید ادب جرمنی کا شمارہ نمبر ۱۱ شائع ہو گیا

حیدر قریشی کی ادارت میں جرمنی سے شائع ہونے والے ادبی جریدہ جدید ادب کا شمارہ نمبر ۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء) شائع ہو گیا ہے۔ ۲۶۸ صفحات پر مشتمل اس شمارہ میں جدید ادب کے معمول کے مندرجات شامل ہیں۔ حمد و نعت کے سیکشن میں صبا اکبر آبادی، جمیل الرحمٰن اور کلیم شہزاد کی نگارشات ہیں۔ مضامین کے حصہ میں ڈاکٹر

قمر رئیس (عبدالرحیم نشتر کی غزل میں شام کا استعارہ)،عبدالرب استاد (کرناٹک میں اردو غزل)،مبشر احمد میر (یوسفیات ۔۔ایک مطالعہ)،شبانہ یوسف (سارتر کا فلسفۂ وجودیت) اور عمران شاہد بھنڈر کا طویل مکتوب شامل ہیں۔اس بار امریکہ کے نوجوان شاعر حسن عباس رضا کا گوشہ شائع کیا گیا ہے۔اس گوشہ میں فیض احمد فیض ،احمد ندیم قاسمی،احمد فراز،گلزار،کشور ناہید،افتخار عارف کے تاثرات،ڈاکٹر اعجاز راہی،اشرف قریشی،حمیرہ رحمٰن کے مضامین،حسن عباس رضا کا اپنا لکھا ہوا ''من آنم کہ من دانم''، ان کی دس غزلیں اور چار نظمیں شامل ہیں۔اس گوشہ سے حسن عباس رضا کے فن کے بارے میں ایک واضح تاثر قائم ہوتا ہے۔

غزلوں کے حصہ میں صبا اکبرآبادی،انور سدید،نصرت ظہیر،تاجدار عادل،جمیل الرحمٰن،احمد صغیر صدیقی،غلام مرتضٰی راہی،قاضی اعجاز محور،منظور ندیم،کاوش عباسی،جان عالم،ارشد کمال،رئیس الدین رئیس،طاہر عدیم،یعقوب تصور،عدیل شاکر،فیصل عظیم،ظفراللہ محمود،شفیق مراد،مبشر سعید اور متعدد دیگر شعراء شامل ہیں۔غزلوں کے خصوصی مطالعہ میں مظفر حنفی،اکبر حمیدی،عبداللہ جاوید،صادق باجوہ اور کلیم شہزاد کی چار سے چھ تک غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

افسانوں کے سیکشن میں سلطان جمیل نسیم (موسم کی پہلی بارش)،سلیم آغا قزلباش (کھارے پانی کا کنواں)، شفیق انجم (میں + میں)،اقبال حسن آزاد (رونے والے)،محمد حامد سراج (چوبدار)،ڈاکٹر بلند اقبال (بُو)، جان عالم (ارشد جان کیوں نہیں آتا) اور سید علی محسن (فنکار) شامل ہیں۔جبکہ نظموں کے حصہ میں انور سدید، نیر جہاں،نصرت ظہیر،کاوش عباسی، پروین شیر، پرویز مظفر، قاضی اعجاز محور، اکمل شاکر شبانہ یوسف اور عمران ہاشمی کی نظموں کے ساتھ ستیہ پال آنند اور فیصل عظیم کی چار چار نظمیں دی گئی ہیں۔

خصوصی مطالعہ کے تحت احمد ہمیش کی تین نثری نظمیں،عمران شاہد بھنڈر کا ایک طویل مضمون اور ڈاکٹر روبی شبانہ کا مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح نگاری کا سرسری جائزہ شامل ہیں۔ماہیوں کے سیکشن میں امین خیال اور امین بابر کے ڈھیروں ڈھیر ماہیوں کے ساتھ گوہر مسعود، جاوید خلجی،سعید شباب،اختر شاہ جالندھری،ریحانہ احمد،رفیق شاہین اور مبشر سعید کے ماہیے شامل ہیں۔کتاب گھر میں شفیق انجم،عدیل شاکر،غضنفر اقبال،غلام مرتضی راہی اور عشرت ظفر کی تازہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جبکہ حمیدہ معین رضوی،مریم رڈلی اور ہرمن ہیسے کی کتابوں پر تفصیلی مطالعہ دیا گیا ہے۔

خطوط اور ای میلز کے سیکشن میں پروفیسر شمیم حنفی،ڈاکٹر مظفر حنفی،شبانہ یوسف،سہیل احمد صدیقی،شفیق انجم، یونس خان،اشہر ہاشمی،رئیس احمد رئیس،سعید شباب،عتیق احمد عتیق،سلطان جمیل نسیم،روزنامہ انقلاب بمبئی، اقبال حسن آزاد،اقبال نوید،منظور ندیم،رفیق شاہین،ڈاکٹر انور سدید،سلیم آغا قزلباش اور کاوش عباسی کے تاثرات شامل ہیں۔جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۰ کی اشاعت کے وقت خطوط کا سیکشن چھپنے سے رہ گیا تھا۔سواس بار وہ مِس

ہو جانے والی فائل بھی نوٹ کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے۔اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی،افتخار عارف،عبداللہ جاوید،ڈاکٹر ستیہ پال آنند،دانش غنی،سعید شباب،ہانی السعید،کاوش پرتا پگڈھی،طاہر نقوی،ڈاکٹر مقبول احمد مقبول،شہپر رسول،فیصل عظیم،رئیس الدین رئیس،سلطانہ مہر،سید مزمل الدین،افتخار امام صدیقی،رفیق شاہین،نعیم الرحمٰن،ڈاکٹر انور سدید،ابصار عبدالعلی،اسلم رسولپوری اور عبداللہ جاوید کے تاثرات شامل ہیں۔

مجموعی طور پر جدید ادب کا یہ شمارہ اپنے سابقہ شماروں کے شاندار معیار کو قائم رکھتے ہوئے،اس سے مزید آگے کا سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ارشد خالد (اسلام آباد)

(یہ خبر انٹرنیٹ اردو فورم urdu_writers@yahoogroups.com سے ۸رجون ۲۰۰۸ء کو ریلیز کی گئی)

جدید ادب کا شمارہ نمبر ۱۱ نظر نواز ہوا۔تازہ شمارے کے مشمولات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو ادب کی متعدد اصناف نظم و نثر کو مذکورہ شمارے میں جگہ دی گئی ہے تاہم انشائیہ کی عدم موجودگی نے تشنگی کا احساس دلایا۔آپ خود بھی معیاری انشائیے باقاعدگی سے لکھتے رہے ہیں،اس حوالے سے انشائیے کو ''جدید ادب'' کے ہر تازہ شمارے میں جگہ ملنی چاہئے۔

آپ کے ''سدھارتھ'' پر تحریر کردہ تجزیاتی مطالعے نے بعض ایسے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جو کم از کم میرے لیے بالکل نئے ہیں۔اس قدر عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

سلیم آغا قِزلباش (وزیرکوٹ۔سرگودھا)

حاصلِ مطالعہ،اِدھر اُدھر سے، And I Wait اور جدید ادب شمارہ ۱۱ ملنے کی رسید

I have received 4 books from Delhi. Thank you very much. You are a brave, hardworking and wonderful man.

مقصود الٰہی شیخ (بریڈفورڈ،انگلستان)

تازہ شمارہ جدید ادب کا ابھی نہیں ملا ہے لیکن انٹرنیٹ پر دیکھ رہی ہوں۔ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھ پائی ہوں لیکن جو پڑھا اُن میں شفیق انجم کا 'میں + میں'،حسن عباس رضا کی نظم 'اپنے لیے ایک نظم' اور عبدالرب استاد کا مضمون ''کرناٹک میں اردو غزل'' بہت پسند آئے۔جدید ادب ہمیشہ کی طرح اعلیٰ اور معیاری ہے۔اللہ آپ کو حوصلے، صحت اور خوشیاں عطا فرمائے اس عظیم لگن کے لیے جو بے لوث ہے۔

پروین شیر۔کینیڈا

جدید ادب کا تازہ شمارہ برادرم افتخار امام صدیقی کے توسط سے پڑھنے کو ملا۔اس سے پہلے بھی کچھ شمارے

جستہ جستہ پڑھنے کے لیے ملتے رہے۔آپ منہمک مطالعے کا کس قدر سامان ایک شمارے میں یک جا کر لیتے ہیں۔تازہ شمارہ میں آپ نے بڑی نکتہ آفریں بحث کی ہے کہ ابھی نوعِ انسانی کا صرف دس فیصد IQ بروئے کار آ سکا ہے اور یہ کہ کئی ماورائی یا مابعدالطبیعاتی علائق ابھی طبیعات کی فہم میں شامل ہونے باقی ہیں۔تکنالوجی نے اس سُرعت کے ساتھ کئی سربستہ ابواب کھولے ہیں اور ادراک کے نئے زاویے فراہم کیے ہیں کہ لگتا ہے تیزی سے وجدانی یا رمزی mystic افکار تک سائنسی و منطقی استدلال رسائی حاصل کر کے مطابقتیں برآمد کرنا چاہتا ہے۔حسن عباس رضا پر گوشہ سیر حاصل ہے۔غزلوں میں مظفر حنفی اور صادق باجوہ کی غزلیں تو توانا ہیں ہی،انور سدیدی اور نصرت ظہیر کی غزلیں بھی خصوصاً پسند آئیں۔اسی طرح نظموں میں نیّر جہاں،نصرت ظہیر اور پروین شیر نے زیادہ متوجہ کیا۔

''کرناٹک میں اردو غزل''(عبدالرب استاد)ایک اچھا احاطہ ہے کہ اس میں جو شعراء شریک ہیں زیادہ تر کرناٹک کی حد تک ہی نہیں بلکہ ہندو پاک کی عصری اردو شاعری میں بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ہرمن ہیسّے کے ناول 'سدھارتھ' پر آپ کا مضمون کچھ نئے اپروچس کے ساتھ اس ناول کو بارِ دگر پڑھنے کا ادّعا پیدا کرتا ہے۔مضمون ناول کو اندر سے کھنگالتے ہوئے ناول سے باہر کی زندگی،تاریخ اور عمرانیات و نفسیات سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کامیاب اور ذہین کوشش ہے۔جوگندر پال صاحب کے اقتباسات بھی شمارے کو معنوی طور پر مزیّن کر رہے ہیں۔ویسے پورا شمارہ ہی آپ کی دقتِ نظر،ادبی وساطت،ذہانت و ریاضت کا غماز ہے۔اس کے لیے دلی مبارکباد۔ **عبدالاحد ساز** (ممبئی)

'جدید ادب' کا شمارہ ۱۱ صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے یہ شمارہ پر کشش ہے۔'گفتگو' کے تحت آپ کی مختصر مگر جامع تحریر پسند آئی۔غلام مرتضٰی راہی کے شعری مجموعہ 'لاشعور' پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ ''یہ اُس اثباتِ حق کا حوالہ بھی ہے جو نفی سے شروع ہو کر اثبات تک پہنچتا ہے۔''میرے خیال میں اس جملے کا اطلاق خود آپ کے اداریے پر بھی ہوتا ہے۔

عمران شاہد کی مفصل اور مدلل تحریر ہر لحاظ سے لائق مطالعہ ہے۔بلاشبہ مصنف کا لہجہ کہیں کہیں پر کچھ زیادہ ہی درشت ہو گیا ہے،تاہم تحریر کی افادیت (بلکہ حقانیت) سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس کی بازگشت اردو دنیا میں دیر اور دور تک سنی جا سکے گی۔حیرت ہے کہ۔۔۔۔جیسا جہاں دیدہ اور زیرک نقاد اس دھوکے میں کیسے آ گیا کہ سرقے کا یہ معاملہ ہمیشہ صیغۂ راز میں ہی رہے گا!ایسا لگتا ہے کہ۔۔۔۔صاحب نے اردو والوں کو کچھ زیادہ ہی Underestimate کر لیا اور دھوکا کھا گئے۔ ایک طرف عمران شاہد بھنڈر کی صریح،واضح اور مدلل تحریر ہے (جس کا تحقیقی اعتراف محترمہ شبانہ یوسف (برمنگھم) نے اپنے مراسلے میں کیا ہے) تو دوسری جانب 'شان استغناءٔ سے

پُرخاموشی،......اب ایسے میں سرقے کی بات کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے!اس سلسلے میں کاوش عباسی کے مراسلے کے ساتھ آپ نے جو ادارتی نوٹ لگایا ہے اس کی برجستگی مجھے بہت پسند آئی۔دراصل آپ نے ہم اردو والوں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا،دو لکھاوٹ،دو ادب' پر اردو عوام الناس نے صدائے احتجاج بلند کیا تو چند ایک کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر ادیبوں نے اس معاملے میں (تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے) ایسی ''پُراسرار خاموشی'' اختیار کر لی کہ اس کی گونج آج تک سنی جا سکتی ہے۔ اور اسکے بنیادی اسباب وہی تھے جن کا ذکر آپ نے اپنے ادارتی نوٹ میں کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری پر ڈاکٹر روبی شبانہ کے مضمون کا ایک جملہ اس طرح ہے: ''ویسے تو عام طور پر مجتبیٰ حسین کی عبارت مستحکم اور مربوط ہوتی ہے لیکن کہیں کہیں غیر فصیح اور متروک الفاظ کا استعمال اور انگریزی لفظوں کے غلط تلفظ عبارت کی روانی میں مخل ہوتے ہیں''

اوّل تو یہ کہ طنز و مزاح میں بسا اوقات متروک اور غیر فصیح الفاظ سے ایسی مطلوبہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے بغیر ممکن نہیں،اس لئے مزاح نگاری میں ایسے الفاظ کا استعمال (موقع اور محل کے حساب سے) معیوب نہیں سمجھا جاتا۔دوئم یہ کہ مذکورہ 'غیر فصیح' اور 'متروک' الفاظ پر مشتمل مجتبیٰ حسین کے چند جملے بطور مثال پیش کئے جاتے تو مجھ جیسے قاری کے لئے کسی نتیجے پر پہنچنا آسان ہوتا!یوں تو سبھی افسانے اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن سلطان جمیل نسیم (موسم کی پہلی بارش)،سلیم آغا قزلباش (کھارے پانی کا کنواں) اور اقبال حسن آزاد (رونے والے) بطور خاص پسند آئے۔شعری حصہ بھی خاصا وقیع ہے۔غزل کے کچھ اشعار جو بطور خاص پسند آئے ؂

اب تجاوز بن گیا معمول،ورنہ مدتوں اپنی اپنی حد میں شہری اور بیابانی رہے

چولہے جلتے رہیں سرسبز درختوں کے طفیل خشک بھی کوئی کوئی ڈال رہنی چاہیے ہے (**غلام مرتضٰی راہی**)

کیوں اتنے چھوٹے خود کو نظر آ رہے ہیں ہم یارب یہ کس مقام پہ پہنچا دیا ہمیں

نہ ایسے سست ہوں بادل کہ فصلیں سرد ہو جائیں نہ موجوں کو سنامی جیسی بے حد تیز گامی دے (**مظفر حنفی**)

تم اپنے عکس میں کیا دیکھتے ہو تمھارا عکس بھی تم سا نہیں ہے (**عبداللہ جاوید**)

ارشد کمال (دہلی)

جدید ادب،جرمنی کا شمارہ نمبر گیارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔اس کو مکمل طور پر پڑھنے میں تو چھ ماہ ہی لگ جائیں گے۔مگر اپنی فوری دلچسپی کی تحریریں میں نے پڑھ لی ہیں اور ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ٹائیٹل پر دیا ہوا ماہیا کسی اندرونی دکھ کا اظہار کرتا ہے شاید کسی پیارے کے بچھڑنے کا نتیجہ ہو۔آپکا اداریہ ایک اہم موضوع کے متعلق ہے۔یہ اہم موضوع صدیوں سے اہل قلم۔فلاسفرز اور صوفیا کے درمیان زیر بحث چلا آ رہا

ہے۔ کہ حقیقت کے عقب میں کوئی اور حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ آپ نے اتنے پیچیدہ خیال کو بہت ہی مختصر تحریر میں یوں سمیٹا ہے۔ کہ نقلی مال کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اصل بھی موجود ہے۔ لیکن میرے لئے دکھ کی بات یہ ہے کہ میں ابھی تک اس مسئلہ پر پوری طرح واضح نہیں ہوں اس لیئے اپنی طرف سے کوئی حتمی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اس پر پھر کبھی سہی۔

مضامین میں ہر ایک مضمون اپنے بارے میں بات کرنے کا تقاضا کرتا ہے لیکن میں سارتر سے اپنی دلچسپی کی وجہ سے اس مضمون کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوا۔ مگر اس پر ایک محترم خاتون کا اسم گرامی دیکھ کر اکتاہٹ پیدا ہوئی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ فلسفہ جیسے ادق موضوع پر ایک خاتون کیا لکھ سکتی ہے۔ دراصل میرے ذہن میں یہ تعصب میرے بیٹے وقار اسلم خان کی وجہ سے پیدا ہوا جو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد ہے اور اپنے مضمون پر کمانڈ بھی رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فلسفے کے میدان میں بہت ہی کم خواتین نے کوئی اہم کام کیا ہے۔ (حالانکہ اس کی کلاس میں لڑکوں کی نسبت لڑکیاں زیادہ داخلہ لیتی ہیں) بہر حال اس مضمون کو میں نے بڑی بے دلی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوتا گیا کہ باوجود غیر ضروری تفصیل کے محترمہ کو فلسفے سے گہری شناسائی ہے۔ سارتر سے میری دلچسپی اس کی الجزائر کی آزادی کے حق میں جدوجہد سے پیدا ہوئی تھی کیونکہ یہ معاملہ ایک بڑی ''میں'' سے تعلق رکھتا تھا۔ جس میں سارتر کی اپنی چھوٹی ''میں'' بڑی ''میں'' میں ضم ہوگئی تھی اور اس کے فلسفے کی سچائی کو ظاہر کر رہی تھی کہ جو اپنا انتخاب ہوتا ہے وہ انسانوں کی بھلائی کا انتخاب بھی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں سارتر کے انتخاب کی بات کسی کار کے انتخاب کی بات نہیں بلکہ زندگی یا کسی مقصد کے انتخاب کی بات ہے جو اپنے ذاتی انتخاب کے ساتھ عالم انسانیت کے انتخاب کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ انتخاب اپنی ذات کے ساتھ جڑا ہوا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ سارتر ایک بڑے مقصد کے ساتھ جڑ گیا۔ میرے خیال میں سارتر کبھی سماجی صورت حال سے الگ ہو کر انتخاب کی بات نہیں کرتا وہ تو سوشلزم کی بات کرتا ہے جس میں ساری بات سماجی اور معاشی ہے۔ اور بڑے ''میں'' کی بات ہے ویسے آخر میں محترمہ نے بڑے دھیمے انداز میں سارتر کے فلسفے میں سماجی شعور کی بات تسلیم بھی کی ہے۔ سارتر کے نزدیک انتخاب کی آزدی کا مسئلہ بڑا تکلیف دہ ہے اور وہ اس لئے ہے کہ کار کے انتخاب کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

میں نے فلسفہ پر عبور کے لئے اس مضمون کے بعد ان کی دوسری تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کی جن میں ان کی نظم پوسٹ ماڈرن ازم بھی شامل ہے۔ اس نظم کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ فلسفے سے ان کا بہر حال ایک تعلق ہے۔ یہ نظم فنی حوالے سے اچھی نظم ہونے کے علاوہ پوسٹ ماڈرن ازم کا اچھے حوالے سے پوسٹ مارٹم بھی کرتی ہے۔ خطوط میں ان کا خط بھی شامل ہے۔ جو ان کے فلسفیانہ رغبت کی تائید کرتا ہے۔ ماشاءاللہ۔ جی چاہتا ہے یہ رسالہ میں اپنے بیٹے کو بھیج دوں۔ ویسے اُسے عمران شاہد بھنڈر کے مضامین میں بھی دلچسپی ہے۔

آپ کے نام عمران شاہد بھنڈر کا خط بڑا تفصیلی ہے۔ اور ذہنوں کے بہت سے گوشوں کو منور کرتا ہے۔ وہ ادب میں پھیلے ہوئے بہت سے گمراہ کن خیالات کی تردید کے لئے سماجی حوالوں سے حقیقت تک رسائی میں بھی مدد کرتا ہے۔ بودلیئر اور میلارمے کی تخلیقات میرے لیے ہمیشہ کئی سوالوں کو جنم دیتی رہی ہیں۔ اس تحریر نے مجھے ان کے سمجھنے میں مدد دی ہے۔

حسن عباس رضا کا گوشہ خوب ہے۔ اپنے حوالے سے ان کا مضمون من آنم کہ من دانم ان کی زندگی کے بعض اذیت ناک گوشوں کو وا کرتا ہے۔ پیارے ملک پاکستان میں کیا کیا لوگ مارشلاؤں کے دوران بھوگ بھگتتے رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ اچھا شاعر ہے۔ اس کی غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ اگرچہ کچھ کلام جدید ادب میں پہلے چھپ چکا ہے۔ مجھے اس شعر نے اس کے قیام پاکستان کی یاد دلائی۔ ممکن ہے شاعر کے نزدیک یہ شعر کی Deconstruction ہو۔ ؎ **آنکھوں سے کوئے یار کا منظر نہیں گیا حالانکہ دس برس سے میں اس گھر نہیں گیا**

شاندار غزلوں کے ساتھ اس کی نظموں میں نئے نینوا کا المیہ اور وزیر خانم پسند آئیں۔ کئی دیگر وجوہات کے ساتھ اس کی شاعری کا سہل ممتنع ہونا بھی عام قارئین میں پسندیدگی کا ایک سبب ہے۔

جناب صادق باجوہ سے پہلے سے متعارف ہوں۔ انہوں نے اپنے مخصوص رنگ کو قائم رکھا ہے۔

خود غرض انسان سے صادق کبھی فیض پانے کی نہ رکھنا آرزو

غزلوں اور نظموں میں میرا ایک پرانا دوست کاوش عباسی بھی نظر آیا۔ ستر کی دہائی میں ہم ڈیرہ غازیخان میں اباسین ہوٹل پر ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ وہ ان دنوں لاہور میں پڑھتے تھے۔ اور پکے مارکسسٹ تھے اور ترقی پسند شاعری کرتے تھے۔ اب بھی جدید رنگ میں مجھے اس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ان دنوں وہ اتنے مصلحت پسند نہیں تھے جتنے اپنے خط میں دکھائی دیئے۔ ان کے خط کی نسبت آپ کا فوری جواب زیادہ زوردار ہے۔ نظر آتا ہے سچائی کے اظہار میں آپ لوگوں کی ناراضگیوں کی فکر نہیں کرتے۔ افسانوں کا حصہ بھی اچھا لگا ہے۔ مگر رونے والے کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ میری بھی ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ میں اپنے مرنے کی بعد کا منظر دیکھوں۔ افسانہ حقیقی زندگی کے عین مطابق ہے۔ دفنانے کے بعد گھر کا منظر بڑا خوفناک ہے۔ اب میں نے یہ منظر دیکھنے کی خواہش ترک کر دی ہے۔ اس لئے یہ افسانہ میرے لئے اچھا ثابت نہ ہوا ہے۔

ایک بار پھر عمران شاہد بھنڈر کا مضمون سرقہ کے بارے میں پڑھنے کو ملا۔ انہوں نے اس مضمون میں اس سرقے کے بارے میں مزید شواہد پیش کئے۔ حالانکہ بات تو پہلے ہی مضمون کے ساتھ واضح ہوگئی تھی۔ اور شاید عمران صاحب کو اس بات کا علم ہوگا کہ پاکستان اور بھارت میں یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ یہاں تو شروع سے یہ کام چلا آ رہا ہے۔ آپ انیس جیلانی اور اس کے باپ کی مبارک اردو لائبریری کو تو جانتے ہیں۔ انیس جیلانی نے اپنے باپ کے نام نوازش نامے کے ساتھ جو خط چھاپے ہیں۔ اس میں نوح ناروی صاحب بھی اپنا ایک دیوان فروخت

کرنے لئے پیشکش لئے بیٹھے ہیں۔اس طرح کی ادبی جعل سازی کے خلاف تو آپ نے ایک لمبی قلمی جدو جہد بھی کی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور زکریا یونیورسٹی ملتان کے کئی پروفیسروں (لیکچرار نہیں) کے پی۔ایچ ڈی کے تھیسیز چوری کے نکلے ہیں۔جوانہوں نے باہر کے ملکوں میں جا کر سرکاری خرچوں پر چوری کئے تھے۔ایسے پروفیسروں میں کئی برطرف ہوگئے ہیں اور کئی کے خلاف کاروائیاں چل رہی ہیں۔میں یہ بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بہت سے پرفیسروں کی کتابیں جن پر ان کے نام چھپے ہیں ان کے ایم۔اے۔ایم۔فل اور پی ایچ ڈی سٹوڈنٹس کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔

اس بار میں نے ماہیوں کو بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ماہیوں کے بارے میں آپ سے زیادہ کون جانتا ہے۔آج کا ماہیا آپ کی جدو جہد سے اس منزل پر پہنچا ہے۔ماہیا ہماری دھرتی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔مگر آج کے ماہیے کے موضوعات پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔آج کا ماہیا سیاسی صورت حال سے بھی منسلک ہو گیا ہے۔اس موضوع پر امین خیال کے ماہیے اچھے لگے۔

سنگل تو نہیں ٹوٹے۔۔۔گوروں سے چھوٹے۔۔۔۔کالوں سے نہیں چھوٹے

رفیق شاہین کا ماہیا گیت بھی اچھا لگا۔تفصیلی مطالعے میں ہرمن ہیسے کے ناول سدھارتھ پر آپ کا تفصیلی مضمون دلچسپی کا سبب بنا۔مجھے آپ کے خیالات سے عام طور پر اتفاق ہے۔اس میں جن تین بنیادی باتوں پر زور دیا گیا ہے اور جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے وہ سوچنا۔انتظار کرنا اور فاقہ کرنا ہے جو ان مراحل کو طے کرنے کے لئے ضروری ہیں۔مگر میرے خیال میں اس میں ایک اور عنصر کا اضافہ کرنا ضروری ہے اور وہ ہے صبر۔

میرے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ سدھارتھ کا گوتم بدھ سے الگ ہو جانے کا مسئلہ ہے آخر وہ اتنی بڑی شخصیت سے کیوں الگ ہو گیا جبکہ ایک دنیا اس کے سحر میں گرفتار تھی۔میرے خیال میں گوتم نروان حاصل کرنے کے دوران جس تجربے سے گزرا وہ دوسروں کو اس تجربے سے نہیں گزار سکتا تھا۔وہ صرف اس کو بیان کر سکتا تھا یا اس کے کے ثمرات بتا سکتا تھا۔سدھارتھ اس بات سے مطمئن نہیں تھا۔وہ اس تجربے سے خود گزرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس نے سب پاپڑ بیلے۔ملاح کا تجربہ اور طرح کا تھا سچائی تک رسائی کا طریقہ صرف ایک نہیں جو گوتم نے اختیار کیا بلکہ سچائی تک رسائی تو دریا کے کنارے بیٹھ کر اس کی خاموشی،شور اور وسعت کا مشاہدہ کر کے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ **اسلم رسول پوری** (جام پور)

اور تحریریں بھی لکھنے کا تقاضا کر رہی ہیں لیکن کچھ باتیں دوستوں کی بھی سننی چاہئیں۔ **اسلم رسول پوری (جام پور)**

آپ پہلے جدید ادب سے نوازتے تھے،اب اس نوازش کا سلسلہ بند ہے۔آخر اس رسالہ سے میرا تعلق بھی رہا ہے۔کل فون پر قمر رئیس صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی،انہوں نے تازہ شمارہ کے بعض مندرجات کی بے حد تعریف

کی،خاص طور پر مابعد جدیدیت کے حوالے سے۔اس لیے ان مضامین کو پڑھنے اور جدید ادب کو پانے کا اشتیاق جاگ اُٹھا ہے۔ **ڈاکٹر علی احمد فاطمی** (الٰہ آباد)

ہمارے زمانے میں اردو کے دو چار ادبی پرچے ایسے ضرور ہیں جو بساط بھر دنیا کے مختلف ممالک میں جا رہے ہیں اور پڑھے جا رہے ہیں لیکن پاکستان سے ایک رسالہ یا کتاب اگر باہر بھیجا جائے تو اس پر ڈیڑھ دو سو روپے خرچ ہوتے ہیں سو پرچے باہر تو جا رہے ہیں مگر بہت محدود تعداد میں حیدر قریشی ایک ذہین تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا منتظم اور وسیع معلومات رکھنے والا انسان ہے اس لیے اس نے ان سب عوارض کا علاج سوچ رکھا ہے''جدید ادب'' جرمنی میں حیدر قریشی کے ہاتھوں مرتب ہوتا ہے، بھارت میں چھپتا ہے اور بھارت سے ہی پاکستان میں آتا ہے اور وہیں سے دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ بقول حیدر قریشی بھارت میں اشاعت پر دنیا بھر کے اخراجات پاکستان کی نسبت بہت کم ہیں یہی وجہ ہے کہ جدید ادب کے صفحات پر دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں کی تخلیقات نظر آئیں گی۔اتنی زیادہ کہ یقیناً پاکستان کے دوسرے کسی ادب رسالے میں اتنے نام نہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ یہ پرچہ اردو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتا ہے اور پڑھا جاتا ہے یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید ادب ایک انٹرنیشنل اردو رسالہ ہے جس میں چھپنا خصوصاً اہمیت رکھتا ہے اور پھر یہ شاید واحد پرچہ ہے جو سرمۂ مفت نظر ہے اور کسی کی چشم خریدار پر احسان کا بوجھ بھی نہیں ڈالتا۔یوں حیدر قریشی کو جتنی بھی داد دی جائے وہ اس کا مستحق ہے۔

ان دنوں جدید ادب کا رواں شمارہ شائع ہو کر آیا ہے جو نہایت اعلیٰ گٹ اپ کے ساتھ تقریباً پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اداریہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اثبات پر ایک محکم دلیل کی حیثیت رکھتا ہے جو بے حد منطقی اور سائنٹفک ہے اور وہ دلیل کائنات اور اس کے روز شب کا سلسلہ ہے جسے سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ادارت کے لیے کسی بڑے علم و فضل کی ضرورت نہیں، یوں یہ اداریہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ پرچہ انٹرنیٹ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جو اسکی رسائی کو اور بھی وسعت عطا کر دیتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر قریشی اردو ادب کی تشہیر و اشاعت کے لیے کس قدر محنت اور اخلاص سے کام کر رہا ہے۔حسن عباس کا گوشہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔حسن عباس رضا ایک خوبصورت انسان اور خوبصورت شاعر ہے۔۔۔۔نثری نظم کے طور پر ایک چھوٹا سا گوشہ احمد ہمیش کے لیے ہے۔ستیہ پال آنند جی کی چار نظمیں ہیں۔مظفر حنفی۔اکبر حمیدی۔عبداللہ جاوید،صادق باجوہ،کلیم شہزاد کی دس، چار، چار، چھ، چھ غزلیں بھی ایک طرح سے خصوصی گوشہ ہے۔ڈاکٹر انور سدید پرچے کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔اس لیے بہت نمایاں ہیں۔صبا اکبر آبادی،استاد کا درجہ رکھتے ہیں انکی حمدیں شریک اشاعت ہیں۔غزلوں میں صبا اکبر آبادی،انور سدید،تاجدار عادل، برادرم احمد صغیر صدیقی،قاضی

اعجاز محور کے ہمراہ ایک طویل مخزنِ لطف وعنایت ہے۔امین خیال کے ماہیوں پر ڈاکٹر گوہر مسعود کا مقالہ ہے۔

ماہیا کو حیدر قریشی نے جس بلندی پر پہنچایا تھا اب وہ چل نکلا ہے حتیٰ کہ جدید ادب کے ٹائٹل پر بھی نظر آتا ہے افسانے میں سلیم آغا قزلباس، سلطان جمیل نسیم، محمد حامد سراج، جان عالم کے علاوہ اور بھی دوست نظر آرہے ہیں خصوصی طور پر گذشتہ شمارے پر زبردست ردِعمل ہے گذشتہ شمارے میں میرے لیے ایک مبسوط گوشہ شائع ہوا تھا جس پر شاندار ردِعمل ہے۔مَیں اپنے ان تمام محسنوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرا گوشہ توجہ سے پڑھا اور اس پر اپنی قیمتی آرا سے میری عزت افزائی فرمائی۔

حیدر قریشی کی غزل مَیں ڈھونڈ رہا ہوں اور نہیں مل رہی۔اتنے بھر پور اور خوبصورت تخلیقات کے پرچے پر حیدر قریشی تمہارے لیے دلی دعائیں اور پیار۔

؎تم سلامت رہو ہزار برس　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مجھے یقین ہے تمہارا نام اور کام اتنے عرصے کے لیے ضرور زندہ رہے گا۔

اکبر حمیدی۔اسلام آباد

صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے شمارہ ۱۱ سابقہ شماروں پر سبقت لے گیا ہے۔امریکہ اور یورپ سے اجراء ہونے والے جرائد میں ابھی تک میں نے ایک بھی ایسا جریدہ نہیں دیکھا جو اس کی ہمسری کر سکے۔اس عرصے میں اس کی بہت سی تخلیقات کا بار بار مطالعہ کیا ہے اور ہر باران میں بسی جمالیاتی کائنات کے خوشگوار اور سحر انگیز مناظر سے دل و دماغ کو فرحت و تازگی کا احساس ہوا ہے اور سیراب وشاداب ہو گیا ہوں حسن عباس رضا منفرد اور معتبر شاعر ہیں۔بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اس باران پر بڑا وقیع اور خوبصورت گوشہ شائع فرمایا ہے۔دیگر مختلف النوع مضامین کے حصہ میں ڈاکٹر قمر رئیس، عبدالرب استاد، مبشر احمد میر، شبانہ یوسف اور عمران شاہد بھنڈر نے اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔افسانوں کے گوشے میں آٹھ افسانے ہیں اور ایک بھی فارمولہ کہانی نہیں ہے۔یہ آٹھوں کہانیاں پڑھ کر شدت سے احساس ہوتا ہے کہ افسانے ہوں تو ایسے۔سلطان جمیل نسیم، سلیم آغا قزلباش، شفیق انجم، اقبال حسن آزاد، محمد حامد سراج، ڈاکٹر بلند اقبال، جان عالم، اور سید علی محسن میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا بڑا مشکل کام ہے۔

تفصیلی مطالعے کے تحت حیدر قریشی نے (ہرمن ہیسے کے ناول) ''سدھارتھ'' پر اچھے اور کمال کے تاثرات پیش کیے ہیں۔یونس خاں نے (مریم رڈلے کی) ''طالبان کی قید میں'' کی تحیر خیز اور لرزہ انگیز روداد بیان کر دی ہے۔نصرت ظہیر، پروین شیر اور نیر جہاں کی نظمیں دل کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں۔ماہیوں کے باب میں رفیق شاہین کی ماہیا نظم، اور سعید شباب، امین خیال، ریحانہ احمد، ڈاکٹر گوہر مسعود اور مبشر سعید کے ہمہ جہت و ہمہ گیر ماہیے اپنے بطون میں آفریدہ و نا آفریدہ جہانوں کے نظر افروز اور روح پرور منظر اپنی بہار خوب دکھا رہے ہیں۔

رفیق شاہین۔علی گڑھ

شمارہ نمبر ۱۱ کے مشمولات توقع سے بڑھ کر ہیں۔ٹائٹل پر آپ کا ماہیا لوک تہذیب کے اس ورثے کی یاد دلاتا ہے جس میں پہلی سطر صرف قافیہ پیمائی کے لیے ہی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ اس کا براہ راست تعلق آخری دو سطروں کے تصویری مفہوم سے جُڑا ہوا ہوتا ہے۔

بچپن میں ہم سب پنجابی میں فی البدیہ ماہیے ''بنایا'' کرتے تھے، لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ مصرع اولیٰ صرف قافیہ ملانے کے لیے ہی نہیں ہوتا۔حمد و نعت میں صبا اکبر آبادی کی دونوں حمدیہ نظمیں انہی کے مخصوص انداز میں ہیں۔سلطان جمیل نسیم میں سب پدرانہ خوبیاں موجود ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ صبا صاحب کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ہر رسالے میں اپنی تخلیق بعد میں اور ان کی پہلے بھیجتے ہیں۔اپنے والد ماجد کا قرض ان سے بہتر کوئی کیا ادا کرے گا؟ ان کی فرمائش پر میں نے صبا صاحب کے ''خونناب'' میں مشمولہ مراثی پر ایک سیر حاصل مضمون (چوبیس صفحات) لکھا تھا، جو ابھی شائع نہیں ہوا۔رشید امجد صاحب کے پاس ہے، وہ نہ معلوم کب ''دریافت'' یا اپنی یونیورسٹی کے دوسرے جریدے میں شائع کریں۔میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مرثیہ نگاری میں انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد بہت سے معتبر نام ہیں لیکن ان میں سرفہرست نام صبا اکبر آبادی کا ہے۔گستاخی معاف، مضامین میں کوئی بھی اس سطح تک نہیں پہنچ پایا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔'عبدالرحیم نشتر کی غزل میں شام کا استعارہ'، ''کرناٹک میں اردو غزل'' اور ''یوسفیات، ایک مطالعہ'' تینوں limited subjects ہیں جو سب قارئین کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے۔''سارتر کا فلسفۂ وجودیت'' ہماری یونیورسٹیوں میں جونیر لیول کے طلبہ کی سطح کا ہے۔صرف بھنڈر صاحب کا آپ کے نام مکتوب ہے، جسے With reference to the previous context پڑھنا بہت ضروری ہے۔بھنڈر صاحب جو کام کر رہے ہیں اس کی بنا پر وہ ادبی شرلک ہومز کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

گوشۂ حسن رضاؔ اپنے آپ میں مکمل ہے۔میں رضا صاحب سے کئی بار ملا ہوں اور ان کے کلام سے محظوظ ہوا ہوں۔ڈاکٹر اعجاز راہی (مرحوم) ہم دونوں کے دوست تھے اور اپنے مضمون میں انہوں نے رضا صاحب کو باریکی سے جانچا ہے، چہ آنکہ راہیؔ صاحب کا میدان اختصاص افسانہ نویسی کی تنقید تھا۔کچھ برس پہلے انہوں نے میرے پرانے افسانوں کی چار کتابوں پر بھی ایک مضمون لکھا تھا، انہیں یہ قلق ضرور تھا کہ میں نے اپنی تخلیقی قوت کی کارکردگی کا دھارا مکمل طور پر شاعری کی طرف ہی کیوں موڑ دیا ہے، جبکہ میں نے اپنے وقتوں میں ساٹھ سے کچھ اوپر افسانے لکھے تھے۔انکا خود نوشت ''من آنم کہ من دانم'' بہت سی ذاتی اور وارداتی باتوں سے پردہ اٹھاتا ہے، جس کے بارے میں کم از کم مجھے علم نہیں تھا۔ رضا صاحب مجھ سے اکیس برس چھوٹے ہیں اور میں خود نظم اور صرف نظم کا شاعر ہوں، بلکہ بقول ایک دوست کے 'کسی کو خاطر میں نہیں لاتا'، لیکن ان کی دو نظمیں ''اپنے لیے ایک نظم'' اور ''نئے نینوا کا المیہ'' پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

غزلوں میں انور سدید صاحب کی دونوں غزلیں (باوجود دوسری غزل کی طویل ردیف ہونے کے)،

نصرت ظہیر کی غزل، احمد صغیر صدیقی کی دونوں غزلیں، فیصل عظیم کی دونوں غزلیں اور مظفر حنفی صاحب کی غزلیں اچھی لگیں۔عبداللہ جاوید صاحب نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ان کے کچھ شعروں نے دل موہ لیا۔

؎ زندگی میں ابتری پہلے سے تھی   گھر کے اندر بے گھری پہلے سے تھی

یا یہ شعر ؎ یہاں تو سلسلے ہی سلسلے ہیں   کوئی بھی واقعہ تنہا نہیں ہے

سلطان جمیل نسیم کا افسانہ''موسم کی پہلی بارش'' سونے سے تولے جانے کے قابل ہے۔ پچاس برسوں سے کچھ زیادہ عرصے کی ادبی کمائی یونہی ضائع نہیں جاتی۔ایک دن یاد فرما رہے تھے کہ پچاس کی دہائی میں ان کے اور راقم الحروف کے افسانے اختر انصاری اکبر آبادی کے رسالے''نئی قدریں'' حیدر آباد (سندھ) میں ساتھ ساتھ چھپتے تھے۔کاش وہ دن لوٹ آئیں اور میں افسانوں کی طرف ایک بار پھر اپنا تخلیقی رُخ موڑ سکوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار احمد ندیم قاسمی صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہوئے (میرے ساتھ''ادب لطیف'' کی مدیرہ صدیقہ بیگم اور افسانہ نگار نیلم احمد بشیر بھی تھیں جو مجھے وہاں تک اپنی گاڑی میں لے گئی تھیں، جب میں نے یہ بات کہی تھی، تو بابا مرحوم نے فرمایا تھا۔''آپ نے تو کہانی کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا، لیکن کہانی نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دیکھ لیجیے، آپ کی لگ بھگ سب نظموں میں کہانی چپکے سے در آتی ہے!''۔سلیم آغا قزلباش کا''کھارے پانی کا کنواں''، شفیق انجم کا''میں اور میں'' اور دیگر سبھی افسانے اچھے ہیں۔ نام نہیں گنوا رہا، معافی چاہتا ہوں، لیکن اس بار افسانوں کا حصہ باقی سب حصوں پر بھاری رہا۔۔۔اب رہی نظموں کی بات۔ کچھ نہیں لکھوں گا۔ کیوں؟ یہ بات آپ مجھ سے نہ پوچھیے، میں جواب نہیں دے سکوں گا۔ **ستیہ پال آنند** (امریکہ)

اب تک جدید ادب کے چار شماروں کا مطالعہ کیا ہے۔ان میں شامل مضامین، تفصیلی مطالعہ، خصوصی مطالعہ، افسانے نظمیں، غزلیں، ماہیے وغیرہ سب ہی لائق تحسین ہوتے ہیں۔بعض مضامین تو نئے نئے انکشافات منظر عام پر لاتے ہیں۔ جدید ادب کے مطالعہ سے مجھے اپنی علمی و ادبی تربیت کا احساس ہوا ہے۔اس کا ماہیوں کا حصہ میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتا ہے، میں اس سے بہت استفادہ کرتی ہوں۔اس کی وجہ سے مجھے نئے نئے ماہیا نگاروں اور انکے کلام کے انتخاب کی سہولت میسر ہو جاتی ہے جو میرے مقالے کی تکمیل کے لئے معاون و مدد گار ہیں۔ میں''اردو میں ماہیا نگاری'' پر ڈاکٹر ارشد جمال صاحب کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ تیار کرنے کا ادبی فریضہ انجام دے رہی ہوں۔ **صبیحہ خورشید**۔کامٹی ضلع ناگپور

شمارہ ۱۱ پیشِ نظر ہے۔خوبصورت گیٹ اپ میں ایک بھرپور ادبی جریدہ۔مبارکباد پیش کرتی ہوں۔'گفتگو' کے تحت آپ نے جو مسائل چھیڑے ہیں وہ خاصے گھمبیر معلوم ہوتے ہیں۔میرے خیال میں تخلیقی ادب ماورائیت سے یکسر مبرّا نہیں ہو سکتا لیکن آپ کا یہ اشارہ بھی صحیح ہے کہ خالی خولی ماورائیت ادب کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔افسانوں کا شعبہ ہی پڑھ سکی ہوں۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ذاتی پسند پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ

سلطان جمیل نسیم، محمد حامد سراج، ڈاکٹر بلند اقبال اور جان عالم صاحبان کے افسانے اچھے لگے۔اتنے اونچے معیار کے شمارے پر ایک مرتبہ پھر مبارکباد۔ **شہناز خانم عابدی**۔کینیڈا

بہت پہلے سے آپ کی نثری اور شعری تخلیقات پڑھتا رہا ہوں۔ چند افسانے تو بے حد اہم ہیں۔آپ کے افسانوں کی بُنت اور اُس کو برتنے کا انداز بہت خوب ہے۔ ماہیا کو ایک تحریک بنانے کے لیے آپ نے محنت کی ہے وہ نا قابلِ فراموش ہے۔آپ کے مضامین کی حق گوئی و بیباکی نے ہمیشہ چونکایا ہے۔

آپ کا مثالی جریدہ جدید ادب عبدالرب استاد کے توسط سے مجھے ملا تو میں حیران رہ گیا بہترین طباعت، عمدہ کاغذ، خوبصورت سرورق، غزلیں، نظمیں، ماہیا، مضامین، افسانے، خصوصی گوشے، تبصرے، خطوط۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پڑھوں اور کیا چھوڑوں؟ مثالی معیار اور مواد، آزادیٔ اظہار کی اہمیت اور اسکی قدر افزائی کے نمونے، نئے حقائق کے انکشافات کی اسقدر ہمت، حوصلہ اور جراءت یہ عام آدمی کا کام نہیں ہے۔ جدید ادب شمارہ نو (۹) شمارہ دس (۱۰) اور شمارہ گیارہ (۱۱) میں جناب گوپی چند نارنگ پر جناب عمران شاہد بھنڈر کے مضامین کا ہنگامہ۔ آپ کے ادارتی نوٹ اور جوئیہ صاحب کا ردعمل، یہ سب خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس سلسلہ میں محترمہ شبانہ یوسف نے ان تمام کتب تک رسائی حاصل کی جنکا حوالہ بھنڈر صاحب نے اپنے مضمون میں دیا۔محترمہ کا تفصیلی خط (شمارہ نمبر گیارہ) بے حد اہم گواہی پیش کرتا ہے۔

۔۔۔۔۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا.......... جناب کاوش عباسی صاحب کے خط پر آپ کا ادارتی نوٹ بھی معنی خیز ہے۔

''جدید ادب'' پر جناب انور سدید صاحب کا تبصرہ شائع کرتے ہوئے آپ نے جو ادارتی نوٹ دیا ہے۔''میں بہت سارے پردہ نشینوں کے نام ظاہر کر چکا ہوں۔انھیں دہرانے اور مزید نام ظاہر کرنے کیلئے بھی تیار ہوں۔لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان اور انڈیا سے ایک ایک اور ادبی رسالہ میرا ساتھ دے اور میرے وہ مضامین بیک وقت پاکستان، انڈیا، اور جرمنی سے شائع ہو سکیں۔آپ پاکستان سے کسی ایک حق گو رسالے کے مدیر کو اس کیلئے راضی کر لیں میں اسی وقت اسی لمحہ سے اس نیک کام کا آغاز کرنے تیار ہوں''۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ع کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پر آٹھ صفحات کے تفصیلی جائزے میں آپ نے اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کا سکہ جما دیا ہے۔ پرچہ کی ترتیب، تخلیقات کا انتخاب، ادارتی نوٹس اور بیباکی، یہ سب دیکھتے ہوئے مجھے''سوغات'' اور محمود ایاز کی یاد آتی ہے۔ مبارکباد۔راولپنڈی سے گلزار جاوید کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہ نامہ''چہار سُو'' کا زرسالانہ (دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ) لکھا ہوا ہے۔مگر''جدید ادب میں'' کہیں بھی موجودہ شمارے کی قیمت کا اندراج ہے نہ زرسالانہ کا ذکر......؟؟ اسے قربانی کہتے ہیں یا خدمت...... مجھے اور کوئی لفظ نہیں مل سکا!

’’عمرلا حاصل کا حاصل‘‘ گیارہ کتابیں۔یا صرف جریدہ ’’جدید ادب‘‘، ان دو پلڑوں میں کونسا پلڑا بھاری ہے؟ یا دونوں برابر ہیں؟ فیصلہ نہیں کر پایا!!! آپ کے جذبے کی تھوڑی سی دھول خدا مجھے بھی عطا کرے......آمین

تنہا تما پوری (تما پور۔کرناٹک)

تاخیر سے ملنے والا ایک خط: (بحوالہ شمارہ نمبر ۸)

جدید ادب کا آٹھواں شمارہ ’’جنت نگاہ‘‘ بنا ہوا ہے۔یہ شمارہ متنوع نگارشات (جن میں شاعری بھی شامل ہے) کے ساتھ ساتھ غیر معمولی تہذیب وترتیب کا مظہر ہے۔گوشۂ رشید امجد محنت اور محبت سے مرتب کیا گیا ہے۔آپ کا یہ قدم مستحسن ہے آپ سرکردہ قلم کاروں کا اُن کے جیتے جی اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مُردہ پرستی کو ترک کر کے مایۂ ناز فنکاروں کو Tribute پیش کریں۔

آپ نے زمینی حقائق کے پیشِ نظر اردو زبان وادب کے حال اور مستقبل کے بارے میں اپنے تردد کا اظہار کیا ہے۔آپ کا اداریہ بلاشبہ اردو کے شائقین کے لیے ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ضمن میں آپ کی پیش کردہ تجویز توجہ انگیز ہے۔اردو کے پرستاروں کی ایک عالمی کانفرنس ضرور ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس میں ہر ملک اور ہر خطے کے اُن لوگوں کو شریک نہ کیا جائے جو ہر وقت کمر باندھے اور ’’بستر باندھے ہوئے‘‘ چلنے کو تیار ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ کانفرنسیں اور سیمینار وغیرہ، مشاعروں کی مانند ’’نشستند وگفتند وبرخواستند‘‘ ہو کر رہ جاتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ چیدہ چیدہ صاحب الرائے اور عاشقانِ اردو کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کیا جائے اور باہمی مشاورت سے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کیا جائے جو مختلف ملکوں کے اربابِ اختیار اور پالیسی ساز اراکین کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ توجہ ہو۔پھر اتفاق رائے سے چند برگزیدہ اور معتبر اشخاص کا ایک وفد سربراہانِ ممالک سے مل کر اُن کے خدشات اور Reservations کو رفع کریں۔اس سلسلہ میں الیکٹرانک میڈیا کا تعاون ناگزیر ہوگا۔ہندو پاک دونوں ممالک باہمی امن، محبت اور یک جہتی سے کام کرنے کے خواہشمند ہیں۔اس ضمن میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان دونوں ممالک کے درمیان ایک موثر اور مربوط رابطے کا کام کرے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر حامدی کاشمیری (سری نگر)

ضروری نوٹ: آخری مرحلہ میں خطوط کے صفحات میں سے محترمہ حمیدہ معین رضوی صاحبہ کا خط اشاعت سے روکنا پڑا۔دیگر خطوط میں بھی بہت سے حصے حذف کرنا پڑے۔وجہ۔۔۔ابھی ناگفتنی ہے۔قارئین کرام دعا کریں کہ اب رسالہ جرمنی سے ہی شائع کرنے کے قابل ہو جاؤں۔۔۔پھر آزادیٔ اظہار کا کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوگا۔انشاءاللہ!۔۔۔آخری مرحلہ کی سنسر شپ کے باعث اس شمارہ کا ایک صفحہ خالی بچ گیا تو اس پر اپنی دو تازہ غزلیں شامل کر رہا ہوں۔

حیدر قریشی

اشاعت کے آخری مرحلہ میں

دو تازہ غزلیں: حیدر قریشی

جیسی بھی ہے اس دنیا سے کٹ کر نہیں رہنا
جب پیار بڑھانا ہے تو ڈٹ کر نہیں رہنا

دُوری بھی مٹانی ہے محبت کے سفر میں
اک حد کو بھی رکھنا ہے، لپٹ کر نہیں رہنا

اپنوں کو تو کچھ اور بھی نزدیک کریں گے
سوچا ہے کہ غیروں سے بھی ہٹ کر نہیں رہنا

لازم ہے سنا جائے کھلے ذہن سے سب کو
اپنے ہی خیالات میں اَٹ کر نہیں رہنا

جتنا ہوں حقیقت میں، وہی دِکھنا ہے مجھ کو
اوروں کے لیے بڑھ کے یا گھٹ کر نہیں رہنا

کچھ اپنے دل وذہن کو نزدیک کیا ہے
اندر بھی زیادہ ہمیں بٹ کر نہیں رہنا

رہنا ہے بہرحال یہیں پر ہمیں حیدرؔ
دنیا سے مگر اتنا چمٹ کر نہیں رہنا

بخشی تھی ہجر نے جو تب وتاب لے گیا
اس جسم کو تو وصل کا سیلاب لے گیا

خوابوں سے بڑھ کے پیار کی تعبیریں بخش کے
جاتے ہوئے وہ میرے سبھی خواب لے گیا

دامن کو میرے بھر گیا چین وقرار سے
بدلے میں وہ مِرا دلِ بے تاب لے گیا

کردی ہیں ماند رونقیں دریائے جان کی
رقصاں تھے اس میں جتنے بھی گرداب لے گیا

تاکہ کسی سفر پہ نکل ہی نہ پاؤں اب
ہمراہ اپنے وہ مِرا اسباب لے گیا

پہلے تو اس نے کی تھیں عنایات بے شمار
پھر جو بھی میرے پاس تھا نایاب، لے گیا

سیراب کر کے، پیاس کی لذّت کو چھین کر
صحرا کے ضابطے، ادب آداب لے گیا

جگنو، ستارے، اشک، محبت کے ہم سفر
میرے تمام ہجر کے احباب لے گیا

اک روشنی سے بھر گیا حیدرؔ مِرا وجود
بے شک وہ میرے سورج ومہتاب لے گیا